https://ataunnabi.blogspot.com/
بزرگ خواتین
مصنف
عنایت عارف
ترتیب وتدوین
نجابت علی تارڑ
زاویہ
زاویہ پبلشرز
دربار مارکیٹ ، لاہور
Click For More Books
https://archive.org/details/@zohaibhasanattari

مصنّف

عنایت عارف

ترتیب و تدوین

نجابت علی تارڑ

(C-8 محی الدین بلڈنگ) داتا دربار مارکیٹ، لاہور
فون: 042-7248657
موبائل: 0300-9467047 - 0300-4505466
Email:zaviapublishers@yahoo.com

2012ء

باراول........................1000

ہدیہ..............................480

زیرِ اہتمام..............نجابت علی تارڑ

﴿لیگل ایڈوائزرز﴾

محمد کامران حسن بھٹہ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ (لاہور) 0300-8800339

رائے صلاح الدین کھرل ایڈووکیٹ ہائی کورٹ (لاہور) 0300-7842176

﴿ملنے کے پتے﴾

اسلامک بک کارپوریشن کمیٹی چوک راولپنڈی 051-5536111

احمد بک کارپوریشن کمیٹی چوک راولپنڈی 051-5558320

مکتبہ بابا فرید چوک چٹی قبر پاکپتن شریف 0301-7241723

مکتبہ قادریہ پرانی سبزی منڈی کراچی 0213-4944672

مکتبہ برکات المدینہ بھادر آباد کراچی 0213-4219324

مکتبہ غوثیہ ہول سیل کراچی 0213-4926110

مکتبہ رضویہ آرام باغ کراچی 0213-2216464

مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد 041-2631204

مکتبہ العطاریہ لنک روڈ صادق آباد 0333-7413467

مکتبہ سخی سلطان حیدر آباد 0321-3025510

مکتبہ قادریہ سرکلر روڈ گوجرانوالہ 055-4237699

مکتبہ المجاھد بھیرہ شریف 048-6691763

رائل بک کمپنی کمیٹی چوک اقبال روڈ راولپنڈی 051-5541452

مکتبہ فیضان سنت بوھڑ گیٹ ملتان 0306-7305026

مکتبہ غوثیہ عطاریہ اوکاڑہ 0321-7083119

فہرست

حضرت حواء علیہا السلام

حضرت حوا علیہا السلام کو دنیا بھر کے تمام انسانوں کی ماں ہونے کا شرف حاصل ہے قرآن مجید کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام سے نسل انسانی کی ابتداء ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کے بعد جنت میں میں رہنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی منع کر دیا کہ وہ ایک خاص درخت کے قریب تک نہ جائیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ یہ گندم کا درخت (یا پودا) تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام ایک عرصہ تک جنت کے سدا بہار نظاروں میں تنہا زندگی بسر کرتے رہے۔ وہاں انہیں خدا کی ہر نعمت میسر تھی۔ محنت و مشقت اور غم و فکر سے بالکل آزاد ،تنہائی آرام و آرائش اور لطف و مسرت سے بھرپور زندگی گزر رہی تھی لیکن جنت ایسی جگہ میں رہ کر بھی جو ایک مومن کی سب سے بڑی تمنا ہو سکتی ہے حضرت آدم علیہ السلام کچھ وحشت اور خلا محسوس کرتے۔ وہ فردوس کی بہاروں میں رہتے ہوئے بھی تنہائی کی وجہ سے اکھوئے کھوئے رہتے۔ کیونکہ ان کی فطرت کسی مونس و ہمدم کی متلاشی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی افسردگی اور اداسی کو دیکھتے ہوئے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا کیا۔ حضرت حوا علیہا السلام کی پیدائش سے متعلق قرآن کریم میں صرف اتنا ذکر ہے۔

”وخلق منها زوجها۔“

”اور اس نفس سے اس جوڑے کو پیدا کیا۔“

لیکن بائبل اور بعض دوسری روایات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ حضرت آدم کی تنہائی کا دور ختم ہوا اور وہ حضرت حوا علیہا السلام کو پا کر بے حد مسرور و شادماں ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت کے مطابق تسکین قلب اور اطمینان کا سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ گویا حضرت حوا علیہا السلام حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی میں بہار بن کر آئیں اور انہیں اس سکون و اطمینان سے ہمکنار کیا جو تنہا رہتے ہوئے فردوس بریں میں بھی حاصل نہ ہو سکا تھا۔ اور حضرت آدم علیہ السلام وہاں وحشت سی محسوس کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو جنت میں رہنے کی اجازت عطا کر دی مگر ساتھ ہی فرمایا:

"اے آدم! دیکھ لے یہ ابلیس تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں جنت سے نکلوا کر رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لیے اب ایسی زندگی ہے کہ نہ تو اس میں بھوکے رہتے ہو، نہ برہنہ، نہ تمہیں پیاس ستاتی ہے۔ اور نہ سورج کی گرمی تمہیں تکلیف پہنچاتی ہے۔"

حضرت آدم اور حوا علیہما السلام دونوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ ایک درخت کے پاس نہ جائیں جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد ابلیس نے دھوکے اور فریب کا جال بچھانا شروع کر دیا اور مختلف طریقوں سے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ شجرِ ممنوعہ درحقیقت جنت کا وہ درخت ہے جس کا پھل کھانے کے بعد آدم و حوا ہمیشہ کے لیے جنت ہی میں مقیم رہیں گے۔ بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ شیطان نے سب سے پہلے حضرت حوا علیہا السلام کو بہکایا اور انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کیا لیکن قرآن سے یہ بات ثابت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ روایات بھی صداقت پر مبنی ہوں کیونکہ قرآن مجید نے اس کی تفصیل بیان نہیں کی۔ چونکہ عورت کا ارادہ کمزور ہوتا ہے۔ اس لیے شیطان نے اسی کمزوری کا

فائدہ اٹھایا ہو لیکن عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام کی تخلیق کے بعد جنت کی بیش بہا نعمتوں، اللہ کے انعامات اور وہاں کی سراپا اطمینان زندگی کا صحیح طور پر احساس ہوا۔ تنہائی کا کرب دور ہونے کے بعد انہوں نے اپنی مونس و دمساز بیوی کے ساتھ جنت کی زندگی کا پورا لطف اٹھایا تو ان میں فطری طور پر یہ خواہش بیدار ہوئی کہ وہ دائمی طور پر۔ جنت میں ہی رہیں۔ شیطان نے ان کے دل میں یہی وسوسہ ڈالا کہ اگر وہ شجر ممنوعہ کا پھل کھالیں تو ہمیشہ ہمشہ جنت میں رہ سکتے ہیں کیونکہ یہ شجر خلد ہے اور اس کا پھل کھانے سے سرمدی آرام اور قرب الٰہی نصیب ہو سکتا ہے۔ شیطان نے انہیں یقین دلانے کے لیے قسمیں اٹھائیں اور انہیں ہر ممکن طریقے سے یہ باور کرایا کہ وہ ان دونوں کا دوست اور خیر خواہ ہے، دشمن ہرگز نہیں ہے اس لیے آدم و حوا کو اس کی رائے پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ دونوں میاں بیوی کچھ بہک گئے۔ اور سب سے پہلے انسانی خواص میں سے جو چیز ظاہر ہوئی وہ بھول تھی۔ آخر انسان تھے دونوں بھول گئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں تاکید کے ساتھ اس درخت کے قریب تک پھٹکنے سے منع کیا تھا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حکم ربانی کو ٹھکرا کر دانستہ یہ حرکت کی ہو کیونکہ خود خداوند تعالیٰ نے ان کا سینہ علم کے نور سے منور فرمایا تھا۔ انہیں قرب الٰہی حاصل تھا اور ان کا دل تجلیات الٰہی کا مرکز تھا اس لیے یہ بات تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ حضرت آدم علیہ السلام سے گناہ سرزد ہوا یا انہوں نے جان بوجھ کر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ حقیقت یہی ہے کہ وہ بھول گئے اور انہوں نے اس ممنوعہ درخت کا پھل چکھ لیا۔ اس کے چکھتے ہی انہیں اپنی تمام انسانی کمزوریوں کا احساس ہو گیا اور اپنے تمام بشری لوازم انہیں معلوم ہو گئے۔ دیکھا تو دونوں نے خود کو بالکل برہنہ محسوس کیا۔ فوراً پریشانی کے عالم میں اپنے ستر پتوں سے ڈھانپنے لگے۔ اسی حالت میں ان دونوں پر عتاب الٰہی نازل ہوا اور بارگاہ الٰہی سے حکم ہوا۔

"تم دونوں اکٹھے یہاں سے نکل جاؤ، تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوا۔ پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی پیغام آیا تو جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ دکھ میں پڑے گا۔"

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام نے انتہائی ندامت اور شرمساری سے اپنی بھول کا اقرار کیا اور بے حد خشوع وخضوع کے ساتھ توبہ واستغفار کرتے رہے۔ گریہ وزاری کے ساتھ دعا کرتے رہے۔ کہ الٰہی! میں نے جان بوجھ کر تیرے حکم کی خلاف ورزی نہیں کہ بلکہ مجھ سے بھول ہوگئی ہے۔ آخر دریائے رحمت جوش میں آیا اور اللہ نے انہیں معاف فرمادیا۔ ان دونوں سے یہ کہہ دیا گیا کہ تمہیں دنیا میں جا کر اللہ کے نائب کی حیثیت سے رہنا ہوگا۔ تمہیں اور تمہاری اولاد کو ایک مقررہ مدت تک دنیا میں قیام کرنا ہوگا اور تمہارا دشمن ابلیس بھی تمہارے ساتھ ہوگا اگر تم دنیا میں ہمارے صحیح معنوں میں نائب اور نیک بندے ثابت ہوئے تو تمہارا اصلی وطن جنت تمہارے لیے مخصوص رہے گا۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو زمین پر بھیج دیا گیا۔ جہاں رہنے سہنے کے ڈھنگ اللہ تعالیٰ نے انہیں سکھا دیئے۔ ہم سب ان ہی کی اولاد ہیں اگر اپنے پروردگار کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے رہیں تو وہ وعدہ کے مطابق ہمارے لیے اصلی وطن جنت الفردوس کے دروازے یقیناً کھول دے گا۔

حضرت آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کی اولاد سے متعلق زیادہ معتبر روایات موجود نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان کے بیٹوں اور بیٹیوں کی صحیح تعداد معلوم ہے۔ ان کے دو بیٹے قابیل اور ہابیل زیادہ مشہور ہیں۔ قرآن نے خصوصیت سے ان کے ناموں کا ذکر نہیں کیا لیکن تورات میں ان کے نام یہی لکھے گئے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کا دستور یہ تھا کہ وہ جوڑیا پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے جوڑیا لڑکے اور لڑکی سے کردیتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے

کہ حضرت حوا علیہا السلام کے ہاں قدرت الٰہی سے ہمیشہ جڑواں بچے پیدا ہوتے تھے جن میں ایک لڑکا ہوتا اور دوسری لڑکی۔ اس دستور کی رو سے حوا علیہا السلام کے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ پیش آیا۔ قابیل عمر کے لحاظ سے بڑا تھا اور اس کی بہن ہابیل کی بہن سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس لیے قابیل کو یہ پسند نہ تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی بہن سے اس کی شادی کی جائے۔ اسی جھگڑے کی وجہ سے قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔ یہ دنیا کا پہلا قتل تھا جو ایک عورت کی وجہ سے ہوا۔ دمشق کے شمال میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتل ہابیل علیہ السلام کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت حوا علیہا السلام کی عمر اور وفات سے متعلق کوئی قابل یقین روایت موجود نہیں بعض لوگوں نے جدہ میں کسی جگہ ان کی قبر بھی مشہور کر رکھی ہے کہا جاتا ہے کہ عرب میں جدہ کی بندرگاہ حضرت حوا علیہا السلام کے نام سے مشہور ہے کیونکہ عربی میں جدہ دادی کو کہتے ہیں۔

حضرت حوا علیہا السلام چونکہ ہر زندہ انسان کی ماں ہیں اور انسانِ حی'' سے ان کا تعلق موجود ہے اسی لیے ان کا نام حوا مشہور ہے۔ ان کا وجود اس حقیقت کا شاہد ہے کہ عورت مرد کے لیے اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام اور احسان ہے۔ اگر عورت کا وجود نہ ہوتو انسان اس دنیا کا ذکر ہی کیا جنت الفردوس میں بھی مسرور و شادماں نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ عورت کے بغیر انسانی زندگی کسی صورت مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ حضرت آدم علیہ السلام ایسا عالی رتبہ اور مقدس انسان جنت میں تنہائی گوارہ نہ کر سکا۔ اگر یہ دنیا عورت کے وجود سے خالی ہوتی تو ہمیشہ ویران اور برباد ہی رہتی۔ حضرت حوا علیہا السلام کی زندگی ہر عورت کو یہ درس دیتی ہے کہ عورت انسان کے لیے سراپا رحمت، شفقت اور محبت بن کر آئی ہے۔ یہی اوصاف اسے مکمل عورت کا درجہ بخش سکتے ہیں۔ اگر عورت ان اوصاف سے محروم ہو تو وہ عورت نہیں بلکہ اس کے بھیس میں کچھ اور ہے۔ عورت

ایثار و وفا کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ وہ جنت کی روح پرور بہاروں میں ساتھ رہتی ہے تو بے آباد اور سنسان دنیا کی پر مشقت اور تکلیف وہ زندگی میں ہم سفر رہتی ہے۔ جنت سے نکلنے کے بصیرت افروز واقعہ میں ایک یہ سبق بھی ہے کہ ایک وفا شعار اور محبت و صداقت کی شیدائی عورت کو ہمیشہ بدی اور گناہ کی طاقتوں سے ہر حالت میں خبردار رہنا چاہیے۔ اور اپنے خاوند کو ہر ممکن طریقے سے اللہ کے بتائے ہوئے سلامتی کے راستے پر چلانے کے لیے صحیح مشورہ دینا چاہیے۔

حضرت سارہ رضی اللہ عنہا

حضرت سارہ رضی اللہ عنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ تھیں۔ اور آپ خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ تورات کی بعض روایات کے مطابق عراق کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے اور اہل فدان میں سے تھے۔ قوم بتوں کی پوجا کرتی تھی۔ اور ستارہ پرست تھی۔ آپ علیہ السلام کے والد چونکہ بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے اور آپ علیہ السلام اپنے چچا کی پرورش میں آ گئے۔ اور اپنے چچا کو باپ ہی کہتے تھے۔ آپ کے چچا مختلف قبائل کے لیے لکڑی کے بت بنا کر بیچا کرتے تھے۔ چونکہ شروع ہی سے اللہ نے رشد و ہدایت کی روشنی سے قلب و ذہن کو منور کر رکھا تھا۔ اس لیے اپنے چچا کو دن رات بت تراشی کرتے دیکھتے تو اکثر سوچتے کہ یہ کیسے معبود ہیں جنہیں میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بنا کر فروخت کر دیتا ہے۔ اور لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ آخر پیغمبر مبعوث ہونے کے بعد ایک روز اپنے باپ سے انہوں نے پوچھا:

اے میرے چچا! آپ کیوں ایک ایسی چیز کو پوجا کرتے ہیں جو نہ سنتی ہے اور نہ آپ کے کسی کام آ سکتی ہے؟ اے میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں کہ اللہ نے میرا دل علم کے نور سے منور کیا ہے اور یہ ایسی روشنی ہے جو آپ کو نہیں ملی۔ پس میرے نقشِ قدم پر چلیں۔ میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ اے میرے باپ! شیطان کی بندگی نہ کریں، شیطان تو خدائے تعالیٰ کا نافرمان ہو چکا ہے۔ میرے باپ! میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ خدائے ذوالجلال کا کوئی عذاب آپ کو بھی گھیر لے اور آپ بھی

شیطان کے ساتھی ہو جائیں۔" چچا نے انتہائی غصے سے جواب دیا "ابراہیم! کیا تو میرے معبود سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگ سار کر کے چھوڑوں گا۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو تیری سلامتی اسی میں ہے کہ مجھ سے الگ ہو جا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اچھا میرا اسلام قبول ہو۔ میں آپ کی بخشش کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا۔ اس کے بعد پوری قوم کو مخاطب فرمایا اور بت پرستی چھوڑ کر اللہ کی بتائی ہوئی راہ ہدایت پر چلنے کی تلقین کرتے رہے۔ دعوت حق سنتے ہی پوری قوم ان کی جان کی دشمن ہو گئی۔ آخر آپ علیہ السلام سب سے بڑے مندر کے بتوں کو توڑنے پھوڑنے اور معبودوں کی توہین کے الزام میں پکڑ کر بادشاہ وقت نمرود کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی آگ میں ڈال کر زندہ جلا دیا جائے۔ چنانچہ آپ کے لیے ایک بہت بڑی چتا بنائی گئی۔ اور جب آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس میں ڈال دیا گیا مگر اللہ کی حکمتِ کاملہ سے آگ خود بخود سرد ہو گئی۔ اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہجرت کر گئے۔ اور مختلف ممالک میں تبلیغ کرتے ہوئے فلسطین چلے گئے کچھ عرصہ بعد شکیم (نابلس) سے ہوتے ہوئے مصر کی حدود میں داخل ہوئے۔ آپ کی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا حسن و جمال کا پیکر تھیں۔ اس وقت مصر میں فرعون کی حکومت تھی۔ اس کے امیروں اور درباریوں نے جب ایک اجنبی عورت کے بے مثل حسن و جمال کو دیکھا تو دنگ رہ گئے حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی بدنیتی کو فوراً بھانپ گئے۔ اور آپ نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ یہاں بادشاہ بے حد جابر اور ظالم ہے اگر کسی خوبصورت عورت کو دیکھتا ہے تو زبردستی اسے پکڑ کر اپنے محل کی زینت بنا لیتا ہے۔ اگر ایسی عورت کے ساتھ اس کا شوہر ہو تو فوراً قتل کرا دیتا ہے اور اگر کوئی اور عزیز ہو تو اسے کچھ نہیں کہتا۔ تم چونکہ میری دینی بہن بھی ہو اور یہاں

میرے تمہارے سوا کوئی دوسرا مسلمان نہیں اس لیے تم فرعون سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خدشہ سچ ثابت ہوا۔ فرعون کے امیروں نے اس کے پاس جا کر حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے حسن کی بے حد تعریف و توصیف کی تو بادشاہ نے اسے پیش کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ فرعون کے سپاہی حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو پکڑ کر فرعون کے محل میں لے گئے۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر کے حکم کی تعمیل کر کے فرعون کی مطمئن کر دیا۔ رات کو جب فرعون نے شراب کے نشے میں بدمست ہو کر حضرت سارہ رضی اللہ عنہا پر حملہ کرنا چاہا تو اس کے ہاتھ شل ہو کر رہ گئے اور وہ انہیں چھو تک نہ سکا۔ فرعون یہ دیکھ کر بہت گھبرایا۔ اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی وہ اس کا ہاتھ ٹھیک کرنے بعد اپنے خدا سے دعا کریں۔ فرعون نے وعدہ کیا کہ اگر اس کا ہاتھ درست ہو گیا تو وہ انہیں رہا کر دے گا۔ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو وہ تندرست ہو گیا۔ مگر اس نے وعدہ خلافی کی۔ دوبارہ بدی کے ارادے سے ان کے پاس آیا تو پھر ہاتھ شل ہو گیا۔ تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے پریشان ہو کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت نہیں کوئی جن بھوت ہے۔ اسے فوراً یہاں سے لے جاؤ۔ فرعون نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو رخصت کرتے وقت اپنی بیٹی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو بھی ساتھ کر دیا اور کہا کہ اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ تا کہ مصر کی یہ شہزادی عمر بھر تمہاری خدمت کرتی رہے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے واپس آ کر اپنے شوہر نامدار حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تمام حالات سے آگاہ کیا اور مبارکباد دی کہ اللہ نے ان کی عفت و عصمت کی حفاظت کی اور مصر کی شاہزادی ہاجر کو خادمہ بنا کر بھیجا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اسی وقت سجدہ شکر بجا لائے کئی ایک روایت میں ہے کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا حضرت ابراہیم کے حقیقی چچا ہارون کی بیٹی تھیں۔ اور اس نسبت سے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چچا زاد بہن ہوتی تھیں۔

تورات میں لکھا ہے کہ فرعونِ مصر نے حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کو کرامت سے تعبیر کیا۔ اور اس بات پر ناراض ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے کیوں نہ بتادیا کہ سارہ رضی اللہ عنہا ان کی بہن نہیں بیوی بھی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد بڑے انعام واکرام اور عزت کے ساتھ انہیں مصر سے رخصت کیا۔ پھر اپنے خاندانی رشتے کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے اپنی بیٹی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو ان کی زوجیت میں دے دیا۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اس وقت کے رواج کے مطابق حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ قرار پائیں۔ کہا جاتا ہے کہ فرعون نے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا رشتہ دیتے وقت کہا تھا۔ میری بیٹی کا ان کے گھر میں لونڈی ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ بن کر رہنے سے بدرجہا بہتر ہے۔

حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی پوری زندگی پاکدامنی، شوہر کی رضاجوئی اور ایثار قربانی کی سچی تصویر ہے۔ ہجرت کے بعد انہوں نے اپنے جلیل القدر خاوند کے ساتھ جگہ جگہ کا سفر کیا۔ اپنے وطن کو چھوڑا اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے آرام وسکون کو قربان کر دیا۔ انہوں نے اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ حق پر لبیک کہا، جب پوری قوم، خاندان کے سب لوگ اور دوست اور رشتہ دار سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ ان کی پاکیزہ زندگی میں مسلمان عورتوں کے لیے بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے کہ کس طرح ان کی عفت وعصمت کی حفاظت کے اسباب خود اللہ نے فراہم کر دیئے۔ کیونکہ انہوں نے محض رضائے الٰہی کے لیے اپنے شوہر کے ساتھ بے پناہ مصائب برداشت کئے تھے۔

حضرتِ ہاجرہ رضی اللہ عنہا

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا فرعون مصر کی بیٹی تھیں اور عبرانی زبان میں لفظ ''ہاغاز'' کے معنی اجنبی اور بیگانہ کے ہیں اس لیے ہاجر کہلائیں، بعض مورخین کا خیال ہے کہ عربی میں ''ہاجر'' کے معنی جدا ہونے والے کے ہیں۔ اور ایک لحاظ سے ''ہاغاز'' کے ہم معنی ہے۔ چونکہ حضرت ہاجرا اپنے باپ فرعون اور وطن مصر سے جدا ہو کر اور ہجرت کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشریف لائیں۔ اس رعایت سے ہاجر کہلائیں۔ واللہ اعلم

حضرت ابراہیم علیہ السلام اولاد سے محروم تھے اور اس وقت تک دونوں بیویوں سے کوئی بچہ نہیں پیدا ہوا تھا اس لیے حضرت ابراہیم نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں اولاد کے لیے دعا فرمائی جو شرفِ قبولیت سے ہم کنار ہوئی چنانچہ اللہ کی حکمت سے چھوٹی بیوی ہاجرہ رضی اللہ عنہا امید سے ہوئیں تو حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کو رشک ہوا۔ جب حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو بتقاضائے بشری حضرت سارا رضی اللہ عنہا کو بہت شاق گزرا۔ اور انہوں نے اصرار کیا کہ ان ماں بیٹے کی رہائش وقیام کے لیے علیحدہ انتظام کیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا تو اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوئی کہ آپ کے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور اسماعیل کے لیے بہتری اسی میں ہے کہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کی صلاح پر عمل کیا

جائے۔اب حضرت ابراہیم علیہ السلام حکم ربانی سے مجبور ہو گئے اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور ان کے ننھے منے بچے کو ساتھ لے کر اس جگہ پہنچے جہاں آج کل کعبۃ اللہ ہے۔اللہ عالیٰ کے حکم کے مطابق زمزم کے موجودہ مقام کے بالائی حصے پر انہیں چھوڑ کر ایک پانی کا مشکیزہ اور کھجوروں کی تھیلی دی اور خود واپس چلے گئے اس وقت یہ جگہ بالکل اجاڑ، سنسان اور ویران تھی۔اور میلوں تک کسی انسان کا نام ونشان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔مگر خالقِ کائنات کی مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بلند مرتبے کا پیغمبر اللہ کے حکم سے سرمو بھی تجاوز کر سکتا تھا؟ یہ ان کی قوت ایمانی اور توکل تھا کہ انہوں نے اپنے اکلوتے نورِ نظر اور بیوی کو ویران و بے آباد جگہ پر چھوڑ کر خاموشی سے وطن کی راہ لی۔جب حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس روانہ ہوئے تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا ان کے پیچھے پیچھے آئیں اور کہنے لگیں۔

''اے ابراہیم! آپ ہمیں کیوں ایسی جگہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔جہاں چاروں طرف ویرانی اور ہیبت ناک خاموشی مسلط ہے۔جہاں کسی آدم زاد کا نشان تک نہیں آتا یہاں ہمارا کون مونس وغمخوار ہوگا۔کون ہماری خبر گیری کرے گا'' مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام خاموش سر جھکائے اپنی راہ چلتے رہے۔آخر ان کی خاموشی سے تنگ آ کر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ خدا نے آپ کو ایسا کرنے حکم دیا ہے؟ اس وقت آپ نے فرمایا: ''ہاں یہ خدا کے حکم سے ہے۔'' یہ سن کر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا دل مطمئن ہو گیا اور یہ کہہ کر واپس آگئیں۔''اگر یہ خدا کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہم کو ضائع برباد نہیں کرے گا'' حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ایک ٹیلہ پر ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے وہ اپنے بیوی بچے کو نہیں دیکھ سکتے تھے تو انہوں نے کعبہ کی جانب رخ کر کے بڑے پر اثر انداز میں اللہ سے دعا مانگی۔

''اے ہم سب کے پروردگار! ایک ایسے بے آب وگیاہ میدان میں جہاں کھیتی

اور آب ودانہ کا نام ونشان تک نہیں۔ میں نے اپنی اولاد تیرے لائق احترام گھر کے قریب لاکر بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں۔ پس تو اپنے فضل وکرم سے ایسا کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو جائیں۔ اور ان کے لیے زمین کی پیداوار سے سامان رزق مہیا کردے تا کہ تیرے شکر گزار رہیں۔''

حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا چند روز تک اس مشکیزے سے پانی پی کر کھجوروں پر گزر کرتی رہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلاتی رہیں۔ لیکن جب یہ دونوں چیزیں ختم ہو گئی تو سخت پریشان ہوئی۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال ہونے لگیں۔ اور ایسی حالت میں معصوم بچہ بھوک اور پیاس سے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ آخر ماں تھیں۔ شفقت مادری اور ماں کا تقدس کبھی یہ حالت برداشت نہیں کر سکا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے گو گھبرا کر ایک طرف ہو بیٹھیں تا کہ بچے کی دردناک تکلیف اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکیں۔ مگر کب تک غافل رہ سکتی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ کر اٹھیں قریب ہی ایک پہاڑی تھی جو آج صفا کے نام سے مشہور ہے اس پر جا چڑھیں کہ شاید کوئی شخص نظر آجائے جس سے مدد کے لیے درخواست کریں یا کہیں پانی کا نشان مل جائے مگر وہاں کچھ بھی نہ ملا۔ چاروں طرف لق ودق صحراء اور ناچتے ہوئے بگولے نظر آتے تھے مایوس ہو کر واپس آگئیں۔ مامتا نے جوش مارا تو وادی کی طرف جا نکلیں اور پھر دوڑ کر مروہ نامی پہاڑی پر جا چڑھیں۔ پھر سات مرتبہ ایسا کیا۔ یہی وہ ''سعی بین الصفا والمروہ'' ہے۔ جسے آج تک زائرینِ بیت اللہ شریف فرض کے طور پر ہر سال ادا کرتے ہیں اور اسے حج کا ایک اہم رکن تسلیم کی گیا ہے۔ آخری مرتبہ جب وہ مروہ پہاڑی پر پہنچیں تو انہیں ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ جسے سن کر چونک اٹھیں اور دل میں سوچا کہ کوئی پکار رہا ہے چنانچہ کان لگایا تو پھر وہی آواز سنائی دی۔ آخر فرمایا کہ اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ۔ میں نے تمہاری آواز سن لی ہے دیکھا تو خدا کا مقرب فرشتہ سامنے ہے۔ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کو دیکھا تو پہلے ڈریں لیکن جب انہیں نے

زمین پر اپنا پَر مارا یا بعض روایات کے مطابق ایڑی ماری تو زمزم کے مقام پر میٹھے پانی کا چشمہ ابلنے لگا۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے یہ منظر دیکھا تو جلدی سے پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے میں مصروف ہو گئیں۔ مگر چشمہ اسی طرح ابلتا رہا۔ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اللہ اسماعیل کی ماں پر رحم کرے اگر وہ زمزم کو باڑ بنا کر نہ روکتیں اور اس کے چاروں طرف باڑ نہ بناتیں تو آج یہ زبردست چشمہ ہوتا۔

اس کے بعد حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے سیر ہو کر پانی پیا اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو دودھ پلایا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

"خوف اور غم نہ کر۔ اللہ تجھے اور تیرے بچے کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ یہ مقام جہاں تم دونوں مقیم ہو۔ بیت اللہ ہے جس کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے لڑکے کی قسمت مقدر ہو چکی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا۔"

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آ کر قیام پذیر ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ قریب ہی ایک جگہ سے پرندے اڑ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ یہ پانی کی علامت ہے۔ یقیناً یہاں قریب ہی کسی جگہ پانی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی تلاش میں اس طرف آ نکلے اور میٹھے پانی کا چشمہ ابلتا دیکھا کر بہت مسرور ہوئے۔ انہوں نے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا سے وہاں قیام کرنے کی اجازت طلب کی۔ تو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: تم سب قیام کر سکتے ہو مگر پانی کی ملکیت میں حصہ دار نہیں بن سکتے۔ بنی جرہم نے یہ شرط قبول کر لی۔ اور مستقل طور پر اسی جگہ آباد ہو گئے۔ انہوں نے اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کو بھی بلوا لیا۔ چاروں طرف مکانات تعمیر ہونے، بازار بننے اور لین دین سے زندگی کی ہماہمی، چہل پہل اور رونق شروع ہو گئی۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے بنی جرہم کے بچوں میں کھیل کود کر پرورش پائی۔ تو بنی جرہم کی ہی زبان بولنے لگے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام

جوان ہوئے تو بنی جرہم کو ان کی نیک عادات، سادگی، خدا پرستی اور بلند کرداری کے علاوہ مردانہ وجاہت اور خوبصورتی اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی شادی کر دی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معمول تھا کہ وہ ہر سال اپنی بیوی اور بچے کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ تشریف لائے، ابھی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر چھوٹی تھی۔ تو خواب میں اللہ نے انہیں حکم دیا کہ اپنے اکلوتے نور نظر کی قربانی دیں۔ ایک ایسے باپ کے لیے جسے بڑی دعاؤں اور تمناؤں کے بعد لڑکے کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی تو میلوں کی مسافت درمیان میں حائل کر دی گئی۔ پھر اتنی مصیبتیں سہنے کے بعد جب اس نے ذرا ہوش سنبھالا تو اسے قربان کرنے کا حکم ملتا ہے۔ یہ کتنا بڑا امتحان تھا جس کے تصور سے ماں باپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کوئی عام انسان نہ تھے بلکہ بہت بڑے پیغبر تھے۔ اور ان کی پوری زندگی رضائے الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں گزری تھی۔ اس لیے کسی طور ممکن نہ تھا کہ ان کی محبت پدری اللہ کے حکم پر غالب آ جاتی۔ صبح اٹھ کر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو اس حکم سے آگاہ کیا تو اس پیکر تسلیم و رضا نے ایک لمحہ کے لیے یہ نہیں سوچا کہ جس بیٹے کی خاطر انہوں نے شدید تکالیف اٹھائیں اور مصائب برداشت کیے جس کی پرورش کے لیے بے آب و گیاہ اور ویران و سنسان مقام پر تنہائی کی صعوبتیں برداشت کیں۔ انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے کیوں ذبح ہونے دیں۔ مگر اس سچی مومنہ نے فرمایا جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی رضا وہی میری رضا۔ اپنے ہاتھوں اکلوتے لخت جگر کو نہلایا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور بنا سنوار کر حکم ربی کی تعمیل کے لیے باپ کے ساتھ کر دیا۔ سعادت مند بیٹے نے جب یہ سنا کہ اسے اللہ کی راہ میں ذبح کیا جا رہا ہے تو انتہائی ادب کے ساتھ باپ کو مشورہ دیا کہ ابا جان! بہتر یہ ہے کہ میری گردن پر چھری چلانے سے قبل میرے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں تا کہ میرے خون کی چھینٹیں

آپ پر نہ پڑیں۔ اور آپ مجھے تڑپتا دیکھ کر اپنے ارادے میں کمزوری محسوس نہ کریں۔ اللہ اکبر یہ تھے وہ لوگ جو خدا پرست کہلاتے تھے۔ اور جنہوں نے دنیا میں نیکی اور ایثار کی بنیاد قائم کی۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور اللہ اکبر کہہ کر اسماعیل کے حلقوم پر چھری چلادی۔ مگر جب فارغ ہوئے تو دیکھا حضرت اسماعیل علیہ السلام ایک طرف کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اور سامنے ایک مینڈھا ذبح کیا ہوا پڑا ہے۔ اسی عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لیے دنیا بھر کے مسلمان عید الاضحی مناتے ہیں اور قربانی کرتے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اللہ کے احکام پر ہر عزیز سے عزیز شے تک قربان کرنے کی تربیت دی جائے اور وہ تسلیم و رضا کا سبق سیکھیں مگر افسوس کہ آج کل تو یہ ایک رسم بن کر رہ گئی ہے اس کی روح غائب ہو چکی ہے۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جب حضرت ابراہیم دوبارہ فلسطین سے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اور اسماعیل علیہ السلام کو ملنے آئے تو کعبۃ اللہ کی تعمیر کا حکم ملا چنانچہ دونوں نے مل کر اللہ کے گھر کو دوبارہ تعمیر کیا۔ جو آج تک مسلمانانِ عالم کی سجدہ گاہ ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی پہلی شادی کے کچھ عرصہ بعد حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا انتقال فرما گئیں اور تاریخ طبری کی روایت کے مطابق بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر دفن ہوئیں حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے نور نظر سے ملنے آتے رہے ایک مرتبہ آئے تو بیٹے کو گھر میں موجود نہ پایا۔ ان کی بیوی سے پوچھا تو جواب ملا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیسے گزر ہو رہی ہے۔ بہو نے جواب دیا کہ سخت مصیبت اور پریشانی میں ہیں اور بہت دکھ اٹھا رہے ہیں۔ آپ نے رخصت ہوتے ہوئے فرمایا کہ وہ جب آئیں تو انہیں میرا اسلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ دروازے کی چوکھٹ تبدیل کر دیں۔ اسماعیل علیہ السلام جب واپس آئے تو گھر میں نبوت کے نور کی جھلک نظر آئی۔ بیوی سے پوچھا کوئی آیا تھا۔ انہوں نے تمام قصہ سنا دیا۔ فرمایا کہ وہ میرے باپ تھے اور ان کا مشورہ ہے کہ تمہیں طلاق دے دوں

چنانچہ میں تمہیں جدا کرتا ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی کر لی اور جب حضرت ابراہیم دوبارہ تشریف لائے تو اتفاق سے اس دن بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ ملے۔ حسب معمول نئی بہو سے وہی سوال کیا تو اس نے جواب دیا۔ خدا کا شکر اور احسان ہے بہت اچھی گزر رہی ہے۔ پوچھا کھانے کو کیا ملتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کھانے کو گوشت اور پینے کو پانی۔ پھر آپ نے دعا مانگی۔

اللہ تعالیٰ ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔ اور چلتے ہوئے پیغام دے گئے کہ اسماعیل علیہ السلام کو کہنا اپنی چوکھٹ کی حفاظت کریں۔

یہ ایک جلیل المرتبت پیغمبر کی رفاقت کا اثر تھا کہ فرعون ایسے صاحب جاہ و جلال کی بیٹی جس نے عیش و عشرت کے گہواروں میں پرورش پائی اور اطلس و کمخواب بچھے ہوئے راستوں پر چلتی رہی جو دکھ اور تکلیف کے نام تک سے آشنا نہ تھی اور جسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ تلوے میں چبھنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ جس کا بچپن زر و جواہر میں کھیلتے گزرا تھا اور جس کے سامنے ہر وقت دنیا جہان کی نعمتوں کا ڈھیر رہتا تھا۔ اتنی صابر و شاکر اور اولوالعزم بیوی اور اتنی ثابت قدم اور خدا پرست ماں ثابت ہوئی کہ آج پورے عالم انسان کی بیویاں اور مائیں ان پر فخر کر سکتی ہیں۔ ویسے تو تاریخ عالم شہزادیوں اور حکمران عورتوں کے گوناگون کارناموں سے بھری پڑی ہے مگر طلوعِ اسلام سے قبل اور خلافت راشدہ کے بعد کی عورتوں میں کوئی بھی عورت تسلیم و رضائے الٰہی، تربیت اولاد اور صبر و استقامت میں ان سے نہیں بڑھ سکی۔ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے درویش صفت پیغمبر کہ زوجیت میں آتے ہی اپنی پرانی زندگی کو ایک بھولا بسرا خواب سمجھ کر فراموش کر دیا اور دوبارہ کبھی اس عظمت زندگی کی تمنا تک نہ کی بلکہ ہر قدم پر اللہ کی رضا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ جب خاوند سے علیحدہ ہو کر ایک ویران و سنسان سرزمین پر رہنے کا حکم ملا تو سنتے ہی کہ اللہ کا یہی حکم ہے فوراً اپنا سر جھکا دیا۔ اپنے اللہ پر توکل کر کے اس بے آب و گیاہ ویرانے میں ننھے بیٹے سمیت تنہا مقیم

ہو گئیں۔اور بڑے صبر واستقامت سے اس کی پرورش میں مصروف رہیں۔ جب محنت کا شجر ثمر آور ہونے لگا تو بیٹا کھیل کود کر آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون بخشنے کے قابل ہوا تو حکم ملا کہ اسے اللہ کی راہ میں ذبح کر دو۔ کیا دنیا کی کوئی بھی ماں اس کڑے اور کٹھن امتحان میں پورا اتر سکتی ہے؟ مصیبت زدہ ماں نے اف تک نہ کیا اور صابر و شاکر پائیں گے۔ یہ اس ماں کی تربیت تھی جس نے بے پناہ تکالیف برداشت کیں۔ آج دنیا کا بڑے سے بڑا مکتب اور اچھے سے اچھا نظامِ تعلیم بھی اس کی ادنیٰ سی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مسلمان خواتین کو حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی زندگی سے سبق سیکھنا چاہیے بالخصوص عورتوں کے لیے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا روشنی کا ایک مینار ہیں جو اپنی خاندانی امارت اور وجاہت کو دوسروں کے لیے عذابِ جان بنا دیتی ہیں۔

ملکہ سبا حضرت بلقیس رحمۃ اللہ علیہا

حضرت سلیمان علیہ السلام کا دربار عظمت وشوکت اور فقید المثال جاہ وحشمت کے لحاظ سے مذاہب عالم کی تاریخ میں بہت بلند مقام رکھتا ہے۔ ان کے بعد یہ عظمت کسی بھی دوسرے فرمانروا کو نصیب نہیں ہوسکی کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ وہاں جن اور حیوانات بھی حاضر ہوں۔ آجکل مادی تہذیب کے دور میں جب کہ ہر چیز کا جائزہ عقل کی آنکھوں سے لیا جاتا ہے۔ ایسی ہیبت اور قوت کو ایک افسانے سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی لیکن سب جانتے ہیں کہ ہمارے دور میں بھی ایسے ایسے محیر العقول واقعات کبھی کبھار رونما ہوجاتے ہیں کہ فلسفے، سائنس اور عقل وخرد کی دنیا ان کا احاطہ کرنے میں عاجز ثابت ہوتی ہے اور آخر انہیں بادلِ نخواستہ تمام طاقتوں سے بالاتر ہستی اور روحانی قوت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ بہرحال حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کے ان عجائبات اور ان کی مافوق البشری طاقت کو تمام الہامی مذاہب کی کتب مقدسہ میں تسلیم کیا گیا ہے اور قدرے اختلاف اور شرح واختصار کے ساتھ ان کا ذکر موجود ہے۔ خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قدرے تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے۔

ایک روز حسب معمول حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے دربار میں تشریف فرما تھے۔ تمام جنات، حیوانات اور چرند پرند بھی فوج درفوج موجود تھے۔ آپ نے جب اپنے دربار کا جائزہ لیا تو ہدہد کو غیر حاضر پایا چنانچہ فرمایا کہ آج ہدہد اپنی جگہ پر موجود نہیں

حالانکہ اسے علم ہے بلاوجہ غیر حاضری کی سزا بہت سخت ہے۔ اگر ہدہد نے اس کے لیے کوئی معقول عذر پیش نہ کیا تو ہم سخت عذاب دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد ہدہد بھی آن حاضر ہوا۔ آتے ہی سخت باز پرس ہوئی تو انتہائی لجاجت اور انکسار سے عرض کیا۔ اے جن وانس کے بادشاہ! ایک نہایت ہی حیرت انگیز خبر لایا ہوں اور اسی وجہ سے مجھے دیر ہوئی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پوچھنے پر ہدہد نے بتایا کہ یمن کے علاقہ سبا میں ایک ملکہ رہتی ہے۔ اللہ نے اسے دولت وعظمت، شان وشوکت، فوج وسپاہ اور تخت و تاج سے نواز رکھا ہے۔ اور وہ بڑے رعب ودبدبے سے حکومت کرتی ہے مگر وہ خود اور اس کی قوم سورج کی پوجا کرتی ہے شیطان نے ان سب کو گمراہ کر رکھا ہے اور وہ خدائے واحد کی پرستش نہیں کرتے اور نہیں سمجھتے کہ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، سمندر، دریا اور زمین وآسمان کی ہر شے کا خالق صرف اللہ ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا کہ تیرے سچ اور جھوٹ کا ابھی امتحان ہو جائے گا اگر تیرا بیان سچائی پر مبنی ہے تو ہمارا یہ خط لے جا ملکہ تک پہنچا دے اور پھر وہاں اس خط سے متعلق ان جو بات چیت ہوتی ہے اس سن کر ہمیں اطلاع دے چنانچہ ہدہد حکم کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط لے کر تیز رفتاری سے اڑتا ہوا ملک سبا میں پہنچا۔ اس وقت ملکہ بلقیس، اپنا دربار سجائے بیٹھی تھیں کہ ہدہد نے خط ان کی گود میں ڈال دیا۔ ملکہ بلقیس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا تو اسے ایک پرندے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ سخت حیران ہوئی خط کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا: یہ خط سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہے اور اللہ کے نام سے شروع ہوتا ہے جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ تمہیں ہمارے سامنے سرکشی اور سربلندی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے اور تم خدا کی فرمانبردار بن کر میرے پاس پہنچو۔ ملکہ بلقیس نے خط پڑھ کر اپنے درباریوں سے کہا کہ اے ارکانِ سلطنت! تم جانتے ہو کہ میں اہم اور ضروری معاملات میں تمہارے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں

اٹھاتی اس لیے اب مجھے اچھی طرح سوچ سمجھ کر مشورہ دو کہ کیا کرنا چاہیے۔انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں کسی سے ڈرنے اور مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہم زبردست جنگی طاقت کے مالک ہیں۔باقی فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ہم تعمیلِ ارشاد کے لیے حاضر ہیں۔ملکہ بلقیس نے کہا بلاشبہ ہم بہت زیادہ طاقتور اور زبردست جنگی طاقت کے مالک ہیں مگر میری رائے میں ہمیں حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے معاملے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ان کی طاقت کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ ان کا یہ پیغام ہم تک عجیب اور پراسرار طریقے سے پہنچا ہے۔میرا خیال ہے کہ ہم بیش بہا تحائف کے ساتھ چند قاصد روانہ کریں تا کہ ان کی طاقت اور عظمت کا پورا اندازہ ہو جائے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ وہ کیا چاہتے ہیں اگر واقعی وہ زبردست طاقت اور شوکت کے مالک ہیں تو ان سے لڑنا بے وقوفی ہے۔ہمیں بلاوجہ بربادی مول نہیں لینی چاہیے چنانچہ ملکہ بلقیس کے قاصد قیمتی تحائف و نوادرات کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئے تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہاری ملکہ نے ہمیں بالکل غلط سمجھا ہے۔تم ہمیں ورغلانے آئے ہو۔ملکہ سے کہو کہ ہمارے حکم کی حرف بحرف تعمیل کرے۔ورنہ مجھے اپنے عظیم الشان لشکر کے ساتھ سبا آنا پڑے گا تم ہرگز مقابلہ نہ کر سکو گے۔ذلیل و خوار ہو کر شہر بدر کیے جاؤ گے۔حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظمت و ہیبت ان پر طاری تھی۔وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ عجیب قسم کے شہنشاہ کا دربار ہے جہاں انسانوں کا ذکر ہی کیا جنات اور حیوانات بھی مسخر ہو کر ادب سے کھڑے ہیں۔جب قاصدوں نے واپس جا کر ملکہ بلقیس کو صورت حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے اظہار اطاعت و وفاداری کے لیے فوراً سفر شروع کر دیا۔ادھر حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آگاہ کر دیا کہ ملکہ سبا اطاعت کے لیے آرہی ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ ملکہ کے

یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا شاندار تخت اٹھا کر یہاں لایا جائے۔ ایک کوہ پیکر جن نے ذمہ لیا کہ وہ دربار برخواست ہونے تک تخت شاہی لے آئے گا۔ وزیر آصف بن برخیا نے کہا میں آنکھ جھپکتے ہی تخت پیش کردوں گا۔ آپ نے رخ پھیر کر دیکھا تو تخت موجود پایا۔ آپ نے اطمینان کے لے تخت میں قدرے تبدیلی کا حکم دیا جس کی فوراً تعمیل ہوئی۔ کچھ عرصے بعد ملکہ بلقیس پہنچ گئیں تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے دریافت کیا ''تیرا تخت ایسا ہی ہے۔'' عقل مند ملکہ نے فوراً جواب دیا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ میرا ہی تخت ہے۔ مجھے آپ کی بے نظیر طاقت کا علم ہو چکا ہے۔ مطیع اور فرماں بردار بن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئی ہوں۔ اب تخت کے اس معجزہ نے مجھے پوری طرح قائل کر دیا ہے اور میں ایک بار پھر اطاعت کا اظہار کرتی ہوں۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے دیکھا کہ ملکہ بلقیس ان کی منشاء نہیں سمجھ سکی اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اسے ایک ماتحت اور باجگزار حکمران عورت کی حیثیت سے طلب کیا گیا ہے حالانکہ آپ کا مقصد ملکہ کو خدائے واحد کا پرستار بنانا تھا چنانچہ آپ نے اسے سمجھانے کے لیے ایک نہایت ہی لطیف اور عجیب طریقہ اختیار کیا۔ آپ نے جنات کو حکم دے کر فوری طور پر آبگینے کا ایک محل بنوایا۔ اس میں داخل ہوتے ہیں سامنے ایک وسیع صحن تھا جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک حوض کھدوا کر پانی سے بھر دیا۔ پر کشش اور صاف وشفاف آبگینوں اور بلور کے ٹکڑوں سے اس کے اردگرد ایسا فرش بنا دیا کہ دور سے دیکھنے والے کو دھوکا ہوتا شاید پورے صحن میں پانی بہہ رہا ہے۔ اس کے بعد ملکہ کو قیام کے لیے اس محل میں لے جایا گیا تو وہ آبگینوں کی چمک دمک اور محل کی رفعت وخوبصورتی دیکھ کر مبہوت ہوگئی۔ جب صحن کے قریب گئی تو اس نے سمجھا کہ صحن میں پانی بہہ رہا ہے۔ اس نے پانی میں اترنے کے لیے اپنے لباس کو پنڈلیوں تک اوپر چڑھا لیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں یہ پانی نہیں بلکہ پورا محل چمکتے

ہوئے صاف آبگینوں سے بنایا گیا ہے۔اور سورج کی روشنی کی وجہ سے ملکہ کو یہ دھوکا ہوا ہے۔عقل مند ملکہ نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ اس کی ذہانت اور عقل مندی پر چوٹ کی گئی ہے حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی نہیں بلکہ خدا کی فرمانبرداری چاہتے ہیں۔چنانچہ انہوں نے فوراً حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے اقرار کیا کہ آج تک میں نے غیر اللہ کی پرستش کر کے اپنے اوپر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔مگر اب میں آپ کے ساتھ ایک خدا پر ایمان لاتی ہوں۔جو پوری کائناتِ عالم کا خالق ہے۔

جہاں تک سبا کا تعلق ہے مورخین کا خیال ہے کہ قحطانی نسل کی ایک مشہور شاخ کا نام سبا تھا۔اس قبیلے کے بانی کا نام عمر یا عبدالشمس تھا اور سبا اس کا لقب تھا۔سبا کی حکومت کا مرکز یمن کے مشرقی علاقے میں تھا۔دارالخلافے کا نام ادب تھا اور اسے لوگ بانی قبیلہ کے نام کی رعایت سے شہر سبا بھی کہتے تھے۔آہستہ آہستہ اس کا دائرہ ایک طرف حضر موت اور دوسری طرف افریقہ تک جا پہنچا تھا۔اس کے بعد سبا کی مختلف شاخیں ہو گئیں تو ان میں سے کئی ایک نے یمن کو دارالسلطنت قرار دے کر ایک رفیع الشان تمدن اور بہت بڑی حکومت کی بنیاد رکھی۔ان میں سے حمیر اور تبابعہ مشہور حکمران شاخیں ہوئی ہیں۔ان سے قبل کے حکمران ملوکِ سبا کے نام سے مشہور ہیں۔ اکثر اسرائیلی کتب میں ملکہ کا نام بلقیس لکھا ہے حبشہ کے لوگ دعوے کرتے ہیں کہ وہ ملکہ سبا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ان کی زبان میں ملکہ کا نام ماکدہ بیان کیا جاتا ہے۔بعض روایات کے مطابق ملکہ بلقیس ۹۵۰ قبل مسیح حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوئیں۔اس وقت حضرت سلیمان کا دارالسلطنت یروشلم بیان کیا جاتا ہے۔اگرچہ قرآن مجید اس سلسلے میں خاموش ہے لیکن بعض کتبِ تفاسیر میں لکھا ہے کہ قبولِ اسلام کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ بلقیس سے نکاح کر لیا اور انہیں اپنے ملک میں واپس جانے کی اجازت دے دی اور گاہے گاہے ملاقات کے

لیے جاتے رہے۔

ملکہ سبا کے حالات واقعات کچھ بھی ہوں لیکن جہاں تک قرآن مجید ہماری راہنمائی کرتا ہے یہ بات ثابت ہے کہ وہ بہت زیرک، معاملہ فہم اور سلیم الطبع خاتون تھیں۔ اور اللہ نے انہیں قبول حق کا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ جب انہیں انتہائی لطیف پیرائے میں حق وصداقت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے فوراً اسے قبول کرلیا۔ اور کسی قسم کے بے جا ضد، خودنمائی اور اصرار جو عام عورتوں کا شیوہ ہوتا ہے ان کے قریب بھی نہیں پھٹکی۔ اس کی اسی خصوصیت نے انہیں حیاتِ جاوید عطا کی ہے۔

زوجہ حضرت ایوب علیہ السلام

حضرت ایوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پوتی ان کے نکاح میں تھیں۔ کتب تواریخ و تفاسیر میں ان کا نام درج نہیں۔ قرآن کریم میں ایسی کوئی تفصیل موجود نہیں تاہم اکثر روایات میں ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام ایک کامل اور صادق شخص تھے جو ہمیشہ اللہ سے ڈرتے اور بدی سے دور رہتے۔ اللہ نے خوش حالی اور اولاد و مسرت فراخدلی سے بخشی تھی۔ اچانک وہ ایک سخت امتحان میں ڈال دیئے گئے۔ مال و دولت برباد ہوئی۔ اہل و عیال پر مصیبت نازل ہوگئی۔ جسم و جان کو طرح طرح کی بیماریوں نے گھیر لیا۔ اس کے باوجود وہ اللہ کی رضا پر شاکر و صابر تھے اور کبھی شکایت کا ایک لفظ منہ سے نہ نکلا۔ بعض اسرائیلی روایات کے مطابق وہ بہت بری امراض کا شکار تھے۔ یعنی جذام اور پھوڑے پھنسیوں کا اس حد تک بڑھ جاتا کہ بدن گل سڑ جاتا اور سخت بدبو پیدا ہو جاتی مگر قرآن کریم میں اس قسم کی کو تفصیل مذکور نہیں۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس بربادی اور خستہ حالی کے بعد تمام رشتہ دار، دوست اور اعزاء سب ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اور دنیا میں اللہ کی ذات اور وفادار بیوی کے سوا کوئی ان کا ساتھی اور غمگسار نہ رہا۔ ان کی زوجہ محترمہ ہر وقت اپنے پاکباز شوہر کی خدمت، دلجوئی اور تیمارداری میں مصروف رہتیں اور دنیا بھر کے انسانوں میں وہی ایک ہستی تھی جو شروع سے آخر تک ان کے

دکھ درد میں شریک رہتی۔ وہ بستی سے باہر ایک جھونپڑے میں مقیم ہو گئے تھے۔ ان کی زوجہ روزانہ ان کے زخم دھوتی۔ کیڑے نکالتی اور رات دن ان کی تیمارداری کرتی۔ یہ سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہا۔

ایک مرتبہ ان کی زوجہ محترمہ نے اپنے محبوب کی انتہائی تکلیف اور دکھوں سے بے چین ہو کر کچھ ایسی بات کہہ دی جس سے صبر ایوب کو ٹھیس پہنچی۔ اگرچہ انہوں نے اپنے خاوند سے متعلق کہا تھا مگر وہ بات اللہ پر توکل کے اصول کے خلاف تھی۔ اور اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ انہیں خدا کی رحمت کی امید باقی نہیں رہی۔ حضرت ایوب علیہ السلام جن کا صبر اور توکل ایک مثال بن چکا ہے اس انتہائی خراب حالت میں بھی کب ایسے کلمات برداشت کر سکتے تھے۔ سخت ناراض ہوئے اور قسم کھا کر فرمایا کہ میں تجھے سو کوڑے لگاؤں گا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے تیرہ برس کا طویل عرصہ اسی اندوہناک مصیبت اور کرب میں بسر کیا اور ان کی صابرہ بیوی اس جوش وانہماک اور خلوص ومحبت سے ان کی خدمت کرتی رہی۔ کئی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ وہ محنت و مشقت بھی کرتی تھیں تاکہ گزر اوقات ہو سکے پھر گھر کا کام کاج بھی انجام دیتی تھیں اور اس کے ساتھ اپنے شوہر کی دیکھ بھال اور تیمارداری بھی کیا کرتی تھیں۔ ایک ایسا شخص جو نہ چل پھر سکے نہ خود کھا پی سکے بلکہ حوائج ضروری کو ادا کرنے سے بھی قاصر ہو پھر جذام کی وجہ سے سخت بدبو بھی آتی ہو کون ایسی وفادار بیوی ہو گی جو پورے تیرہ سال تک سارا بار اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھنے کی ہمت کر سکتی ہے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کیساتھ درحقیقت یہ ان کی آزمائش بھی تھی تاکہ دنیا میں ثابت ہو جائے کہ خدا پرست اور عصمت مآب بیویاں عام عورتوں سے اس قدر بلند ہوتی ہیں کہ انہیں بے وفائی اور خودغرضی کی ہوا تک نہیں لگی ہوتی۔ وہ سراپا ایثار وقربانی اور مجسم شفقت ورحمت ہوتی ہیں۔ خدا پرست خاتون اپنے فرض کو انجام دینے اور نیکی کرنے میں ہمیشہ سب

سے ممتاز ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں وہ پوری دنیا کی دولت، سکھ، چین اور آرام و راحت کو ٹھکرا کر تکالیف و مصائب کو ترجیح دیتی ہیں کیونکہ ان کے سامنے صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا مقصد رہتا ہے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے رشتہ داران کی رسمی عیادت کے لیے آئے تو ان میں سے ایک نے واپس جا کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں انہیں یہ سزا مل رہی ہے۔ سننے والے نے یہ بات حضرت ایوب علیہ السلام تک بھی پہنچا دی تو وہ سخت آزردہ خاطر بے چین ہوئے۔ فوراً سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے تو جس حال میں رکھے میں راضی ہوں مگر اب تیرے بندے ایسی بات کہنے لگے ہیں جس سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے اس کے بعد رفع حاجت کے لیے اٹھے۔ بیوی نے کپڑے سے پردہ کر دیا۔ جب فارغ ہوئے تو وحی نازل ہوئی کہ زمین پر پاؤں سے ٹھوکر ماریں چنانچہ آپ نے حکم الٰہی کی تعمیل کی تو وہاں سے چشمہ ابل پڑا۔ فوراً وہیں غسل صحت کیا تو پہلے سے بھی زیادہ تندرست اور توانا نظر آنے لگے۔ باہر بیوی منتظر تھیں۔ جب باہر آئے تو وہ انہیں شگفتہ، صحت مند اور تروتازہ دیکھ کر پہچان نہ سکیں۔ تب آپ نے انہیں بتایا کہ میں ایوب ہی ہوں۔ اب قسم پوری کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ ایک طرف ایسی نیک اور پاکباز بیوی تھیں جن کی وفاداری غمگساری پر استقلال خدمت کی مثال نہیں ملتی۔ دوسری طرف قسم پوری کرنے کا سوال تھا۔ شش و پنج میں مبتلا ہو گئے کہ کیا فیصلہ کریں آخر وحی نازل ہوئی کہ وہ تنکوں کا ایک لٹھا بنائیں اور ان سے مار کر قسم پوری کر لیں۔

زوجہ حضرت ایوب کا حسنِ وفا، خدمت و اطاعت، ہمدردی و غمگساری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ نے قسم پوری کرنے کے لیے علیہ ۔۔۔

صادر فرمایا۔

ایک طرف وہ ناشکر گزار اور احسان فراموش عورتیں ہیں جن کے سر پر ہمیشہ اپنی ضروریات اور آرام و آسائش کا بھوت سوار رہتا ہے۔ ایک طرف یہ اسلام کی مایہ ناز خاتون ہیں۔ فرق واضح ہے کہ ہماری عزیز بہنیں خود فیصلہ کر لیں۔

حضرتِ آسیہ بنت مزاحم رضی اللہ عنہا

اور اللہ مثال دیتا ہے ایمان والوں کے لیے فرعون کی بیوی جب کہ اس نے دعا کی کہ اے میرے پرودگار! میرے لیے تو اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کی بداعمالیوں سے نجات دے اور مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے۔ (تحریم:۱۱)

کمل من الرجال کثیرو لم یکن من النساء الا مریم بنت عمران وآسیة بنت مزاحم امرأة فرعون۔ (طبرانی-حدیثِ رسول)

"مردوں میں سے تو بہت سے کامل آدمی ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف دو کامل ہوئیں۔ مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم رضی اللہ عنہا زوجہ فرعون۔"

حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کے والد کا نام مزاحم تھا۔ جو قوم بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے تھے۔ فرعون نے آپ کی صفاتِ حسنہ اور حسن وخوبی سے متاثر ہو کر شادی کر لی یہ معزز خاتون تھیں جن کی تعریف خود اللہ نے قرآن کریم میں فرمائی ہے اور ان سے متعلق

رسول اللہ ﷺ کی کئی ایک احادیث زبان زدِ عام ہیں ترمذی شریف میں ہے کہ تم تقلید کے لیے چار عورتیں تمام دنیا کی عورتوں میں کافی ہیں۔ مریم رضی اللہ عنہا، خدیجہ رضی اللہ عنہا، فاطمہ بنت محمد ﷺ اور آسیہ رضی اللہ عنہا زوجہ فرعون۔ طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ تمام دنیا کی عورتوں میں صرف دو کامل ہوئی ہیں۔ ایک مریم بنت عمران اور دوسری آسیہ بنت مزاحم۔ اس سے حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کے بلند مرتبے اور عظمت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک روز آپ کے شوہر فرعون نے بھیانک سا خواب دیکھا۔ فوراً نجومیوں کو طلب کیا گیا۔ تو انہوں نے زائچے تیار کرنے کے بعد بتایا کہ اس کی حکومت کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھوں ہوگا چنانچہ فرعون نے اپنی سلطنت میں یہ حکم جاری کر دیا کہ جس اسرائیلی کے گھر لڑکا پیدا ہوا سے فوراً قتل کر دیا جائے۔ عمران کا گھر بنو اسرائیل میں ایک ممتاز اور مہمان نواز گھرانا تھا۔ عمران کا سلسلہ نسب حضرت یعقوب علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ ان کے بڑے لڑکے حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ عمران کی بیوی یوکابد کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو فرعون کے سپاہی بنو اسرائیل میں پیدا ہونے والے لڑکوں کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ اگرچہ یوکابد نے تین ماہ تک بچے کی پیدائش کو صیغہ راز میں رکھا۔ مگر جاسوسوں کی کڑی نگرانی کی وجہ سے ممکن نہ تھا کہ یہ راز زیادہ دیر تک چھپا رہے اس لیے والدہ سخت پریشان تھیں۔ اللہ نے ان کے دل میں القاء کیا کہ لکڑی کا ایک صندوق بنا کر اس پر رال اور روغن کی مالش کر دو تا کہ پانی اندر داخل نہ ہو سکے۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس میں ڈال کر دریائے نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بڑی ہمشیرہ مریم کو بھیج دیا کہ وہ دریا کے کنارے کنارے چلتی رہیں اور صندوق کو نگاہ میں رکھیں چونکہ حضرت موسیٰ کی والدہ کو اللہ کی طرف سے یہ بشارت مل چکی تھی ہم اس بچے کو تیری جانب واپس کر دینگے اور یہ ہمارا پیغمبر اور رسول ہوگا اس لیے ماں کے دل کو قدرے اطمینان تھا کہ

اللہ ضرور ان کے معصوم بچے کی حفاظت کرے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ تیرتا ہوا صندوق فرعون کے محل کے ساتھ جا لگا۔ اس وقت حضرت آسیہ فرعون کے ساتھ تخت پر بیٹھی سیر دیکھ رہی تھیں۔ جوں ہی ان کی نگاہ صندوق پر پڑی سخت حیران ہوئی اور خادمات کو صندوق باہر نکالنے کا حکم دیا۔ سب نے صندوق کھولنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیاب نہ ہو سکا۔ تب حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا نے دل میں اللہ کا نام لے کر خود کھولا تو اس کا ڈھکنا فوراً کھل گیا۔ دیکھا کہ اس میں ایک شیر خوار بچہ بڑے اطمینان وسکون سے لیٹا انگوٹھا چوس رہا ہے۔ وہ بچے کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئیں۔ ایک روایت کے مطابق آسیہ رضی اللہ عنہا چونکہ حضرت موسیٰ کی چچا کی بیٹی تھیں اس لیے قرائن سے سمجھ گئیں کہ یہ لڑکا ان کے اپنے گھرانے کا ہے۔ محل کے لوگوں میں سے کسی نے غور سے دیکھنے کے بعد کہا کہ یہ ہمارے دشمنوں بنو اسرائیل کا لڑکا ہے اس لیے اسے فوراً قتل کر دینا چاہیے۔ خود فرعون نے بھی محسوس کیا کہ اسے قتل کر دینا ہی مناسب ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی لڑکا اس کی حکومت کو برباد کرنے کا باعث بن جائے اس وقت قرآن حکیم کے الفاظ میں حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا نے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا کہ یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ اس کو قتل نہ کرو ممکن ہے یہ بڑا ہو کر ہمیں نفع دے یا ہم اس کو اپنا لڑکا بنائیں۔

حضرت موسیٰ کی ہمشیرہ نے فوراً واپس جا کر خوشی خوشی والدہ کو آگاہ کیا کہ حضرت موسیٰ فرعون کے محل میں پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ والدہ کے اشارے پر فوراً محل کی خادمات میں شامل ہو گئیں۔ جب حضرت آسیہ نے فرعون کو ارادہ قتل سے باز رہنے کا مشورہ دیا تو فرعون بھی کچھ سوچ کر خاموش ہو رہا اور حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کو بچے کی پرورش کا انتظام کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے کسی مناسب دایہ کی تلاش شروع ہوئی۔ کئی عورتیں اس کام کے لیے پیش ہوئیں مگر

حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی عورت سے دودھ نہیں پیتے تھے۔ ان کی ہمشیرہ مریم محل میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے فوراً یہ تجویز پیش کی کہ اگر اجازت دی جائے تو وہ بہت اچھی دایہ پیش کر سکتی ہیں۔ سخت مجبوری تھی۔ شاہی دایہ اور دوسری عورتیں تھک ہار کر بیٹھ چکی تھیں۔ اس لیے مریم کو دایہ لانے کا حکم دیا گیا۔ وہ فوراً باہر آئیں اور گھر سے اپنی والدہ کو ساتھ لے گئیں۔ ادھر اللہ کی طرف سے ملنے والی بشارت پر والدہ نے بچے کو دریا میں ڈال تو دیا تھا مگر غم اور اضطراب سے ان کا برا حال تھا۔ مامتا نے سخت مجبور کر رکھا تھا۔ اس لیے ایک مرتبہ انہوں یہ ارادہ کیا کہ اس راز کو محل میں جا کر فشا کر دیں مگر اللہ نے ان کے دل کو سکون بخش دیا۔ خاندانی و ضعداری کو نظر انداز کرتے ہوئے فوراً بیٹی کے ساتھ روانہ ہو گئیں۔ انتہائی پیار اور محبت سے اپنے بچھڑے ہوئے بچے کو گود میں لے لیا اور دودھ پلانے لگیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے لیٹ لپٹ کر دودھ پینا شروع کر دیا۔ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گئیں اور ان کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ مگر بچے کی حفاظت کی وجہ سے خاموش رہیں۔ اس کے بعد ان کی والدہ کا یہ معمول ہو گیا کہ روزانہ دن میں دو مرتبہ بچے کو دودھ پلانے محل جاتیں اور باقی وقت حضرت موسیٰ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کے پاس کھیلتے رہتے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ حضرت موسیٰ فرعون کی آغوش میں بیٹھے کھیل رہے تھے۔ فرعون کی داڑھی ہیروں اور جواہرات سے مرصع تھی حضرت موسیٰ نے کھیلتے ہوئے فرعون کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچ لی۔ جس سے موتیوں کے ساتھ چند بال بھی اکھڑ گئے۔ فرعون سخت طیش میں آیا اسی وقت انہیں قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا نے شوہر کے تیور دیکھے تو بڑی لجاجت سے کہا اسے معاف کر دیجئے، آخر معصوم بچہ ہے اسے کیا معلوم کہ کھجور اور چنگاری میں کیا فرق ہے۔ یہ بادشاہ کے مرتبے اور احترام سے واقف نہیں اسے قتل نہ

لیجیے مگر فرعون بھی ایک ضدی بادشاہ تھا۔ پھر وہ پہلے ہی حضرت موسیٰ کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ بیوی کی درخواست سن کر فوراً کہا میں ابھی اس کا امتحان کرتا ہوں اگر اس نے انگارے کو دیکھ کر ہاتھ کھینچ لیا تو ضرور قتل کردوں گا چنانچہ فرعون نے اسی وقت کھجور کے چند دانے اور دہکتی آگ کے چند انگارے منگوا کر حضرت موسیٰ کے سامنے رکھ دیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام موت اور زندگی کے دوراہے پر کھڑے تھے اور چند سیکنڈ میں فیصلہ ہوا چاہتا تھا۔ مگر اللہ کو حضرت موسیٰ سے ایک بہت بڑا کام لینا مقصود تھا۔ پھر خود ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کا دل مارے خوف سے دھڑک رہا تھا اور دل ہی دل میں بچے کی سلامتی کے لیے اللہ سے دعا کر رہی تھیں۔ جب دونوں چیزیں حضرت موسیٰ کے سامنے آئیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلدی سے انگارا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ خادمات نے اسی وقت ان سے انگار چھین لیا مگر اس وقت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان پر داغ پڑ گیا اور زبان موٹی ہو گئی جس سے قدرے لکنت ہونے لگی۔

غرضیکہ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا نے دو مرتبہ ان کی جان بچائی اور ہر مرتبہ اللہ کا فضل و کرم ان کے شریکِ حال رہا اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا ہی کے پاس پرورش پائی اور ان کی خصوصی تربیت میں رہے جوان ہوئے تو نہایت تنومند، خوب صورت اور بہادر تھے۔ گفتار و کردار سے ایک خاص قسم کا وقار نمایاں ہوتا اور ان کی ہر بات میں عظمت کی جھلک دکھائی دیتی۔ جب آپ علیہ السلام نے نبوت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان کی صداقت اور خدا کی وحدانیت پر حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا ایمان لائیں حالانکہ ان کا شوہر خود خدائی کا دعوے دار تھا۔ جب فرعون کو اطلاع ملی سب سے پہلے اس کی بیوی حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا ایمان لائی ہیں تو طیش و غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کو گرفتار کر لیا گیا اور انہیں جیل میں اس قدر تکالیف دی گئیں کہ ان کے بیان سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ نے فرعون کے شدید

اصرار کے باوجود راہِ حق سے سرِمو انحراف گوارا نہ کیا بلکہ تمام دکھوں اور مصائب کو بڑی خندہ پیشانی اور ہمت و استقلال سے برداشت کیا۔ آخر جب فرعون کے تمام حربے ناکام ہو گئے اور اسے یقین ہو گیا کہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔ اور اب آسیہ رضی اللہ عنہا کو دنیا کی کوئی طاقت اس کے دین سے منحرف نہیں کر سکتی۔ تو اس نے عبرتناک سزا دینے کا فیصلہ کر لیا تا کہ دوسرا کوئی شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین پر لبیک کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ بھلا خود اپنی پرستش کروانے والا شخص یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ اس کی اپنی محبوب بیوی کلی طور پر اس کی عظمت و جلالت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور اس کے سب سے بڑے دشمن کا دین اختیار کرے چنانچہ حکم دیا کہ حضرت آسیہ کو کھولتے ہوئے تیل کے کڑاہے میں زندہ ڈال کر تل دیا جائے۔ مگر وہاں تو شرابِ حق رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ اور زندگی کی محبت کہاں باقی رہی تھی۔ ہنسی خوشی اللہ کی راہ میں جان دے کر حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا نے دنیا بھر کی عورتوں کو سر بلند کر دیا۔ اللہ اللہ! کہاں ایک عظیم الشان اور پر حشمت سلطنت کی ملکہ اور کہاں یہ سزا۔ آج یہ عالم ہے ہم حقیر سی دنیاوی غرض کے لیے ضمیر و ایمان تک رسوا کر دیتے ہیں۔ اور اللہ اور اس کے رسول کے واضح احکام کو جان بوجھ کر پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ مذاہب کی تاریخ میں عموماً یہ شرف عورتوں کو حاصل رہا ہے کہ انہوں نے نہ صرف سب سے پہلے دعوت حق و صداقت کو ایسے حالات میں قبول کیا جب کہ پوری دنیا اس کا انکار کرتی تھی بلکہ اس مقدس جرم کی پاداش میں ناقابلِ بیان سختیاں اور زہرہ گداز تکالیف برداشت کیں۔ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ عورتیں تائیدِ حق اور عزم و استقلال کی حیرت انگیز طاقت سے محروم ہوتی ہیں جو کوئی ایسا خیال کرتا ہے وہ نہ صرف تاریخ کو جھٹلاتا ہے بلکہ ان عالی مقام خواتین کی توہین کا مرتکب ہوتا ہے۔

حضرتِ صفورہ رضی اللہ عنہا

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جوان ہوئے تو وہ فطرتاً مقہور و مغضوب بنی اسرائیل کی ہر ممکن امداد کیا کرتے تھے ایک مرتبہ انہوں نے دیکھا کہ ایک مصری بنو اسرائیل کے ایک شخص پر ظلم کر رہا ہے مظلوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دہائی دی اور آپ نے اس مصری کو ظلم سے باز رکھنے کے لیے ایک مکہ رسید کیا مگر اتفاق سے وہ مر گیا۔ بعد میں اسی اسرائیلی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کا مجرم ٹھہرایا تو آپ فرعون کے خوف سے نیم برہنہ اور پاپیادہ مدین کی طرف نکل گئے۔ راستے میں سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو درختوں کے پتے کھا کر گزارہ کرتے مسلسل پیدل چلنے کی وجہ سے پاؤں زخمی ہو گئے۔ اسی آشفتہ حالی اور پریشانی میں جب مدین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک کنویں کے سامنے پانی لینے والوں کی بھیڑ لگ رہی ہے۔ ہر شخص قوت اور طاقت کے بل پر اپنی باری پہلے ٹھیرا کر پانی لے جا رہا ہے اور بڑے اطمینان سے اپنے جانوروں کو بھی پانی پلا رہا ہے مگر تھوڑے سے فاصلے پر دو لڑکیاں علیحدہ کھڑی ہیں جو اپنے جانوروں کو پانی کی طرف جانے سے روک رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ یہاں بھی ظلم ہو رہا ہے۔ وہ اپنی پراگندہ حالی، تھکاوٹ اور غریب الوطنی کے باوجود یہ ظلم برداشت نہ کر سکے۔ اسی وقت ان لڑکیوں کے پاس جا کر پوچھا کہ تم کیوں اس طرح الگ تھلگ کھڑی ہو تو انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے والد بہت

بوڑھے ہیں۔ اور ان طاقت ور لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اپنے جانور لے کر آگے بڑھتی ہیں تو یہ ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔ اس لیے ہم مجبور ہیں کہ جب یہ فارغ ہو کر چلے جائیں تو ہم اپنے مویشیوں کو پانی پلائیں۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سخت طیش آیا۔ فوراً آگے بڑھے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے کنوئیں کی منڈیر جا پہنچے۔ وہاں سے سب سے بڑا ڈول اٹھایا اور تنہا کھینچ کر ان لڑکیوں کے جانوروں کو پانی پلا دیا حالانکہ وہ ڈول کوئی بھی طاقت ور آدمی تنہا نہیں کھینچ سکتا تھا۔ لوگوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا مگر ان کی پر جلال صورت اور طاقت دیکھ کر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لڑکیاں اپنے گلے کو پانی پلا کر واپس لوٹ گئیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ستانے کے لیے ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ مسلسل سفر کرنے کی وجہ سے بے حد تھکے ہوئے تھے اور بھوک برداشت سے باہر ہو رہی تھی چنانچہ دل میں اللہ سے دعا فرمائی کہ اے میرے پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان اپنی قدرت سے تو عنایت فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔ ادھر دونوں لڑکیاں جب گھر گئیں تو بوڑھے والد نے خلافِ معمول جلدی واپس آنے کی وجہ دریافت کی۔ لڑکیوں نے بتایا کہ ایک مصری مسافر نے ان کی مدد کی اور وہ سب پر غالب آ گیا۔ باپ نے بڑی لڑکی سے کہا کہ تم جلدی جا کر اسے میرے پاس لے آؤ۔ لڑکی تیزی سے وہاں پہنچی اور شرم و حیا سے آنکھیں جھکا کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ ان کے والد نے بلایا ہے۔ وہ آپ کے احسان کا بدلہ دینا چاہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس دعوت کو رد کرنا مروت کے خلاف سمجھا اور لڑکی کو ہدایت کی کہ وہ راہنمائی کے لیے آگے نہ چلے بلکہ پیچھے پیچھے آئے اور پتھر کے ٹکڑوں یا اشارے سے گھر کی طرف راہنمائی کرتی جائے جب وہ لڑکی کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شیخ مدائن ہیں۔ بعض لوگوں نے ان کا نام حضرت شعیب بتایا ہے۔ شیخ مدائن نے بڑی شفقت اور محبت سے ان کا

خیر مقدم کیا۔ کھانا وغیرہ کھلایا اور اطمینان سے ان کے حالات سن کر کہا کہ اب تم ظالموں کے پنجے سے آزاد ہو اور یہاں تمہیں کوئی خوف نہیں کرنا چاہیے۔ اس دوران بڑی لڑکی نے باپ کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ اے باپ! آپ اس اجنبی مہمان کو مویشی چرانے اور پانی پلانے کے لیے ملازم کیوں نہیں رکھ لیتے۔ کیونکہ ملازم وہی اچھا ہوتا ہے جو دیانت دار بھی ہو اور طاقت ور بھی۔ باپ کو بیٹی کی بات سن کر قدرے حیرت ہوئی۔ پوچھا کہ تم کو اس مہمان کی دیانت داری اور طاقت کا کیسے اندازہ ہوا۔ کہنے لگی کہ طاقت کا اندازہ تو اس سے ہوا کہ انہوں نے اتنا بڑا ڈول تنہا کنوئیں سے نکالا اور ایمان داری کی اس سے اچھی آزمائش اور کیا ہو سکتی ہے کہ جب میں انہیں بلانے گئی تو انہوں نے مجھے دیکھتے ہی نظریں جھکا لیں۔ دورانِ گفتگو ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ جب ہمارے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو مجھے پیچھے چلنے کی ہدایت کی اور خود آگے چلتے رہے۔ میں اشاروں سے ان کی راہنمائی کرتی رہی۔ شیخ مدائن سن کر بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اگر آپ آٹھ سال تک ان کے پاس رہیں اور ان کی بکریاں چرائیں تو وہ اپنی بڑی لڑکی صفورہ ان کے نکاح میں دے دیں گے۔ اگر آپ یہ مدت دس برس کر لیں تو یہی لڑکی کا مہر ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ شرط منظور کر لی۔ اور حضرت صفورہ سے ان کا عقد ہو گیا۔ اسی بیوی سے ان کے ہاں ایک لڑکا جیر مون بھی پیدا ہوا۔ ایک روز وہ حسب معمول بکریاں چراتے ہوئے مدائن سے بہت دور نکل گئے۔ بیوی بھی ساتھ تھی۔ راستہ بھول جانے کی وجہ سے وہیں قیام کرنا پڑا۔ رات سخت سرد تھی۔ بیوی کے کہنے پر آگ کی جستجو شروع کی۔ سامنے کوہ سینا کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ چقماق سے آگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر سردی کے باعث کامیاب نہ ہو سکے۔ سامنے وادی ایمن میں نگاہ دوڑائی تو ایک شعلہ سا آسمان کی طرف بلند ہوتا دکھائی دیا۔ حضرت صفورہ سے کہا کہ تم

یہاں ٹھیرو میں آگ لاتا ہوں۔ جب اس جگہ پہنچے تو دیکھ کر حیران ہو گئے کہ آگ ایک درخت سے نکل رہی ہے مگر درخت نہیں جلتا۔ جتنا آگے بڑھتے تھے آگ اتنی ہی دور ہوتی جاتی تھی۔ آخر خوف زدہ ہو کر واپس آنے لگے تو اللہ کی آواز نے انہیں پکارا اور انہیں نبوت عطا ہوئی۔ تب انہیں معلوم ہوا کہ وہ آگ نہ تھی بلکہ تجلی تھی۔ نبوت عطا ہونے کے بعد انہیں مصر واپس جانے کا حکم ملا۔ سیدھے مصر پہنچے اور رات کو مہمان کی حیثیت سے گھر میں وارد ہوئے مہمان نوازی اس گھر کا امتیاز تھا اس لیے خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کو پہلے ہی وحی کے ذریعے اطلاع مل چکی تھی۔ آتے ہی بھائی سے لپٹ گئے اور اپنی والدہ کو بتایا۔ ماں اپنے نورِ نظر اور بہو کو دیکھ کر سجدہ شکر بجالائیں۔

حضرت صفورہ کی زندگی جس پاکیزگی اور روشن ضمیری کی مظہر ہے اس میں نیک و بد کا امتیاز کرنے کا کتنا اچھا سبق پوشیدہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اچھے اور برے کو پرکھنے کا کتنا اچھا معیار تھا۔ اور انہوں نے اپنے انتخاب میں اسی بنیادی اصول کو پیش نظر رکھا جو ایک مسلمان خاتون کا جوہرِ حیات ہوتا ہے۔

حضرتِ مریم بنتِ عمران علیہا السلام

اور اللہ تعالیٰ مثال دیتا ہے مریم بنت عمران کی جس نے اپنے اندیشے کی جگہوں کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح ڈالی اور اس نے اپنے رب کی باتوں اور اس کی کتابوں کو مانا اور وہ اپنے رب کے فرماں برداروں میں تھی۔ (قرآن کریم۔سورہ تحریم)

"خَيْرُ نِسَاءِهَا مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَخَيْرُ نِسَاءِهَا خَدِيْجَةُ بِنْتِ خُوَيْلَد۔"

"سب عورتوں میں بہتر مریم بنت عمران اور خدیجہ بنت خویلد ہیں۔" (صحیح بخاری و مسلم)

قرآن کریم وارشادات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق حضرت مریم علیہا السلام کو بہت ہی بلند اور قابلِ رشک درجہ حاصل ہے۔ قرآن کریم میں جا بجا حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ طبرانی کی ایک روایت کے مطابق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران پورے عالمِ انسانیت میں صرف دو عورتیں کامل ہوئی ہیں۔ ترمذی کی ایک حدیث میں حضرت آسیہ، حضرت مریم، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور

حضرت فاطمۃ الزاہراء رضی اللہ عنہا کو تمام دنیا کی عورتوں کی قیادت اور تقلید کے لیے کافی قرار دیا گیا ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام عمران بن لاسان کی نورِ نظر تھیں جن کا شجرۂ نسب حضرت سلیمان علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ عمران بنو اسرائیل کے ایک انتہائی عبادت گزار اور زاہد شخص تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حنّہ بھی زہد و تقویٰ میں اپنی مثال آپ تھیں۔ اگرچہ عمران اپنی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے قوم میں بیحد مقبول و محبوب تھے مگر اولاد سے محروم تھے۔ ان کی بیوی حنّہ کی بہت بڑی تمنا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک بیٹا عطا کر دے تاکہ ان کے خاندان کا چراغ روشن رہے اس لیے وہ ہر وقت اللہ کے حضور دست بدعا رہتی تھیں۔ کہتے ہیں ایک دن حنّہ اپنے مکان کے صحن میں ٹہل رہی تھیں انہوں نے دیکھا کہ ایک پرندہ اپنے بچے سے پیار کر رہا ہے۔ اور اسے دانہ کھلا رہا ہے یہ منظر دیکھ کر ان کے دل کو سخت چوٹ لگی۔ اور اولاد کی تمنا ایک بار پھر بڑی شدت سے ابھری۔ اضطراب کی حالت میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھے اور اللہ کے حضور گڑگڑا کر دعا کی کہ اے پروردگار! اس طرح مجھے بھی اولاد عطا کر تاکہ ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو۔ دعا قبول ہوئی۔ آثار پیدا ہوتے ہی خوشی میں منت مان لی کہ جو بھی بچہ پیدا ہوگا اسے مسجد اقصیٰ کی جو ان دنوں بہت بڑا ہیکل کہلاتی تھی، خدمت کے لیے وقف کر دوں گی۔ ابھی اولاد کی تمنا پوری نہیں ہوئی تھی کہ حنّہ کے شوہر عمران انتقال کر گئے۔ بعد میں ان کے ہاں حضرت مریم علیہا السلام پیدا ہوئیں تو انہیں افسوس ہوا کہ نذر پوری نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ لڑکی کس طرح ہیکل کی خدمت کر سکے گی۔ وہ اس افسوس میں تھیں کہ انہیں غیب سے یہ آواز سنائی دی۔ ہم نے اسے اچھی طرح قبول کر لیا اور اللہ اس کو اچھی طرح پرورش کرے گا۔ حنّہ کو یہ خوش خبری بھی دی گئی کہ اس لڑکی کی وجہ سے تمہارا خاندان مبارک اور معزز ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے مطمئن ہو کر بچی کا نام مریم رکھا۔ سریانی میں

اس کے معنی خادمہ کے ہیں۔ جب وہ سات برس کی ہوئی تو والدہ انہیں بیت المقدس (ہیکل) کے متولی حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس لائیں مگر وہاں کے سب مذہبی پیشواؤں نے حضرت مریم علیہا السلام کی خصوصیات اور باطنی حسن کو دیکھتے ہوئے یہ سعادت حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی حالانکہ ان سب میں اس کارِ سعید کے اہل حضرت مریم علیہا السلام کے خالو حضرت زکریا علیہ السلام ہی تھے۔ کیونکہ وہ نہ صرف ان کی خالہ ایشاع کے شوہر تھے بلکہ بیت المقدس کے معزز ترین فرد اور نبی تھے۔ مگر جب بہت سے لوگ اس کے خواہشمند ہوئے تو باہم فیصلہ یہ ہوا کہ قرعہ اندازی سے کام لیا جائے۔ قرآن کے مطابق قرعہ اندازی کے لیے یہ طریقہ طے ہوا کہ ہر امیدوار اپنی تورات لکھنے والا قلم پانی سے بھرے ہوئے بڑے برتن میں ڈالے جس کا قلم اوپر آجائے وہ اس نعمت کا امین مقرر ہو۔ اسرائیل روایات کے مطابق تین دفعہ قرعہ اندازی ہوئی مگر ہر مرتبہ حضرت ذکریا علیہ السلام کا نام نکلا۔ باقی لوگوں نے ان کی اس کامیابی کو تائید غیبی خیال کرتے ہوئے حضرت مریم علیہا السلام کو ان کے سپرد کر دیا۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے بیت المقدس کے قریب عبادت کے لیے ایک کمرہ مخصوص کر دیا۔ تاکہ دن کو وہاں عبادت کریں اور رات کو اپنی خالہ ایشاع کے پاس چلی جایا کریں۔ حضرت مریم علیہا السلام ہر وقت زہد و عبادت میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ ان کی ریاضت اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ لوگ حضرت مریم کی مثال دیا کرتے تھے۔ اکثر حضرت ذکر علیہ السلام خیریت دریافت کرنے اور نگہداشت کے لیے ان کے کمرے میں جاتے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے کہ ان کے سامنے سامانِ رزق رکھا ہوتا جس میں بے موسم کے تازہ پھل اور میوے بھی ہوتے۔ وہ ان سے پوچھتے کہ یہ سب کچھ تیرے پاس کہاں سے آیا حضرت مریم علیہا السلام جواب دیتی کہ یہ سب کچھ میرے پرودگار کی طرف سے ہے۔ اس کے بعد وہ اسی قدسی شان و عظمت کے ساتھ زہد و عبادت میں مصروف رہیں حتیٰ کہ سن بلوغت کے قریب پہنچ

گئیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام ان سے بے حد متاثر تھے اس لیے بڑی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے۔ عوام میں بلا امتیاز حضرت مریم علیہا السلام کو بے پناہ محبوبیت حاصل تھی۔ ایک روز اچانک حضرت مریم کو اللہ کی طرف سے یہ بشارت ملی کہ اے مریم! تحقیق اللہ نے تجھ کو چن لیا ہے اور پاک کیا ہے اور تجھے ساری دنیا کی عورتوں پر فضیلت بخشی ہے۔ اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز ہو اور نماز ادا کرنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر۔ قرآن کریم نے انہیں ''صدیقہ'' کے بلند لقب سے یاد کیا ہے۔ اور ارشادات نبوی کے مطابق انہیں اپنے دور کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہوئی اور درجہ کمال عطا ہوا۔

عفت آب حضرت مریم علیہا السلام اپنے خلوت کدے میں ہمہ وقت مصروف عبادت رہا کرتی تھیں۔ اور ضروری حاجت کے علاوہ بہت کم باہر قدم رکھتی تھیں۔ ایک روز مسجد کے مشرق کی جانب لوگوں کی نظر سے دور تنہا تشریف فرما تھیں کہ اچانک حضرت جبرائیل امین علیہ السلام تشریف لائے جو ایک انسان کی صورت میں تھے۔ آپ نے ایک اجنبی مرد کو یوں بے تکلفی سے اپنے قریب دیکھا تو گھبرا گئیں۔ اور فرمایا کہ اگر تجھ کو اللہ کا کچھ خوف ہے تو میں اسی کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں۔ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام نے فرمایا کہ میں انسان نہیں ہوں بلکہ تیرے (بیٹے) پیغمبر کا ایلچی ہوں۔ اور تجھے ایک پاک اور عقلمند بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں۔ آپ نے تعجب اور حیرت سے پوچھا کہ میرے ہاں کیسے بچہ ہو سکتا ہے جب کہ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی اور نہ ہی کسی برے کام کے قریب تک پھٹکی ہوں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں تو اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا قاصد ہوں مجھے یہی بتانے کا حکم ملا ہے کہ اللہ تجھے اور تیرے بچے کو اللہ کی قدرت کا نشان بنائے گا۔ اللہ نے تجھے ایسے بیٹے کی بشارت دی ہے جو رحمت ہوگا اور اس کا حکم ہوگا۔ اس لقب مسیح اور نام عیسیٰ (یسوع)

ہوگا۔ یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے۔ یہ شیر خوار ہونے کے باوجود لوگوں سے باتیں کرے گا۔
جب حضرت مریم علیہا السلام نے پوچھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام
نے ان کے بدن پر پھونک دیا اور کہا کہ اس طرح ہوگا۔ اس کے چند دن ہی بعد
حضرت مریم علیہا السلام نے ولادتِ مسیح کے آثار محسوس کرنا شروع کردیئے۔ قوم میں
رسوائی، بہتان تراشی اور ملامت کے خوف سے ہر وقت پریشان و مضطرب رہنے
لگیں۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا ان کی غمگینی اور افسردگی میں بھی اضافہ ہورہا تھا
اکثر روتی رہتی تھیں۔ آخر میعاد پوری ہونے کے بعد انہیں الہام کے ذریعے اللہ نے
ہدایت کی کہ بیت المقدس سے باہر میدان میں کھجور کے درخت کے نیچے تشریف لے
جائیں۔ آپ وہاں درد و کرب کی حالت میں بیٹھیں تھی کہ ان کے خالہ زاد بھائی
یوسف کا ادھر سے گزر ہوا انہوں نے خیریت دریافت کی حضرت مریم علیہا السلام نے تمام
ماجرا کہہ سنایا۔ وہ انہیں یروشلم سے تقریباً نو میل دور کوہِ ساعیر کے ایک ٹیلے پر لے گئے
جو اب تک "بیت اللحم" کے نام سے مشہور ہے۔ آپ وہاں بے قراری کے عالم میں
کھجور کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گئیں۔ تو حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ اس وقت انتہائی
کرب اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں کہ کاش! میں اس سے پہلے ہی مرچکی ہوتی
اور لوگ مجھے بالکل بھول چکے ہوتے۔ اس وقت اللہ کے فرشتے نے کہا کہ اے مریم!
غمگین نہ ہو۔ تیرے پروردگار نے تیرے نیچے نہر جاری کردی ہے اور کھجور کا تنہ
پکڑ اپنی طرف ہلا تا کہ کھجور کے تازہ خوشے تیری جھولی میں گرنے لگیں۔ پس تو کھا پی
اور اپنے بچے کو دیکھ کر کلیجے کو ٹھنڈا کر اور رنج و غم کو بھول جا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا
ہوتے ہی اپنی پاکباز ماں کو بشارت دی کہ مجھ پر سلامتی ہو جب کہ میں پیدا ہوا اور
جب میں اٹھایا جاؤں اور جب زندہ ہو کر دوبارہ بھیجا جاؤں۔ وہ اپنے بچے کے منہ
سے یہ الفاظ سن کر بے حد مسرور ہوئیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد پھر انہیں خیال ستانے لگا کہ

وہ لوگوں کے سامنے کس منہ سے بچے کو لے کر جائیں گی۔ اور انہیں کس طرح مطمئن کریں گی۔ وہ کس طرح یہ تسلیم کرلیں گے کہ بغیر باپ بھی بچہ پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے پاس اللہ کا پیغام پہنچا کہ جب تجھ سے سوالات کئے جائیں تو خود کوئی جواب نہ دینا بلکہ اشارے سے بتانا کہ میں نے اللہ کا روزہ خاموشی رکھا ہوا ہے۔ میں آج کسی سے کلام نہ کرونگی۔ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو اس بچے سے پوچھو۔ اس کے بعد انہیں اپنی قوم یروشلم واپس جانے کا حکم ہوا۔ وہ بچے کو گود میں لیے جب شہر کے اندر پہنچیں تو لوگوں نے حیرت و استعجاب کے عالم میں انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ طرح طرح کے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ کوئی کہتا مریم! یہ کیا؟ تو نے بہت ہی عجیب کام کر دکھایا اور بھاری تہمت کا سامان فراہم کرلیا۔ کوئی کہتا۔ اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ برا آدمی تھا نہ تیری ماں ہی برے چال چلن کی عورت تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی۔ حضرت مریم علیہا السلام نے وحی الٰہی کے مطابق خاموشی سے بچے کی طرف اشارہ کردیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہم ایک شیر خوار بچے سے کیسے پوچھ سکتے ہیں جو ابھی ماں کی گود میں آیا ہے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام معجزانہ انداز میں بول اٹھے۔ میں اللہ کا بندہ ہوں اللہ نے مجھے کتاب انجیل دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ اس نے مجھے مبارک بنایا ہے۔ خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ ہوں اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا طریقہ ہوگا اس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا اور خود سر و نافرمان نہیں بنایا۔ اس کی طرف سے مجھے سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مروں گا۔ اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا اور معجزہ کو دیکھ کر قوم حیران و ششدر رہ گئی۔ اور اکثر لوگوں نے حضرت مریم علیہا السلام کی پاک دامنی کو تسلیم کرلیا اور یروشلم کے ہر گھر میں اس واقعے کا چرچا ہوگیا۔ اسی شب فارس کے بادشاہ نے نیا ستارہ روشن ہوتے دیکھا۔ نجومیوں نے بتایا کہ کسی عظیم الشان ہستی

کی ولادت ہوئی ہے۔ جو ملک شام میں پیدا ہوئی ہے۔ اسی دن بادشاہ نے خوشبوؤں کے تحفے دے کر ایک وفد بیت المقدس بھیجا۔ جب بادشاہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت کا واقعہ سنا تو سخت گھبرایا اور مزید معلومات کے لیے دوبارہ وفد بھیجا۔ ارکان وفد نے حضرت مریم علیہا السلام کی بے حد تعظیم کی۔ خوشبوئیں نثار کیں اور ان کی صداقت پر ایمان لائے۔ چند دن کے قیام میں بعض لوگوں نے خواب دیکھا کہ بادشاہ بچے کا دشمن ثابت ہوگا اس لیے صبح انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو مشورہ دیا کہ وہ بچے کو لے کر کہیں دور چلی جائیں۔ چنانچہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لے کر اپنے عزیزوں کے پاس مصر تشریف لے گئیں جہاں سے کچھ عرصہ بعد ناصرہ چلی گئیں۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تیرہ برس کی ہوئی تو دوبارہ یروشلم آ ئیں۔ حضرت مریم علیہا السلام کی رحلت سے متعلق کوئی قابلِ اعتماد روایت موجود نہیں اور نہ ہی ان کے مدفن کا کچھ علم ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے یروشلم ہی میں وفات پائی بیت المقدس میں کسی جگہ دفن ہوئیں مگر اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔

حضرت مریم علیہا السلام کی پوری زندگی بندگی، توکل، تسلیم و رضا، پاکیزگی اور زہد و تقویٰ کی ایک شاندار مثال ہے۔ اکثر مفسرین نے انہیں وہ پہلی خاتون قرار دیا ہے جو وحی الٰہی کے شرف سے سرفراز ہوئیں اور اگرچہ انہیں باقاعدہ نبوت عطا نہیں ہوئی مگر وہ صاحب الہام ضرور ہوئیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت بھی اللہ کے تقرب سے فیضیاب ہو کر بلند ترین درجات حاصل کر سکتی ہے۔

علمائے کرام کے اختلاف سے قطع نظر یہ بات سچ ہے کہ زہد و تقویٰ، ریاضت و عبادت اور اللہ کی بے پناہ اطاعت عورت کو بھی انسانی تخیل و تصور سے بلند تر درجہ دے سکتی ہے اور دنیا جہان کی عورتوں کے لیے یہ شرف کیا کم ہے کہ ایک عفت مآب اور پاکباز خاتون کو پہلی مرتبہ ایسا درجہ نصیب ہوا کہ ملائک بھی اس پر رشک کریں۔ اس

کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا میں ماں کا مقام کتنا بلند ہے اور اسے پیدائش کے سلسلے میں کن کٹھن اور کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شیر خوارگی کے عالم میں لوگوں کو بتاتے ہیں کہ مجھے عظیم ماں کا خدمت گزار بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے جس ماں کا خادم حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسا بلند مرتبت پیغمبر ہو اس کی رفعتوں کو کون چھو سکتا ہے۔ حیف ہے ان لوگوں پر جو ایسی تہذیب کے خالق ہوں جس میں ماں کی عظمت فنا ہو کر رہ گئی ہے۔

اُمہات المؤمنین حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

"خیر نسائها مریم بنت عمران و خیر نسائها خدیجة بنت خویلد۔"

"دنیا میں افضل ترین عورتیں مریم بنت عمران اور خدیجہ رضی اللہ عنہا بنت خویلد ہیں۔"

"میں دوشنبہ کے دن مبعوث ہوا اور خدیجہ نے اس دن کے آخری حصے میں نماز پڑھی اور علی رضی اللہ عنہ نے دوسرے دن منگل کو نماز پڑھی۔ اس کے بعد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما اور ابوبکر رضی اللہ عنہ شریک نماز ہوئے۔" (تاریخ ابن خمسین)

تمام امہات المومنین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اس شرف کے لحاظ سے بہت ممتاز ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی اور محبوب ترین زوجہ مطہرہ تھیں دنیا بھر کی خواتین میں سب سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا کئی کتب سیر میں تو لکھا ہے کہ دعوتِ توحید پر سب سے پہلے لبیک کہنے والی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تھیں۔ خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی والدہ ماجدہ تھیں۔

آپ کا نام خدیجہ، کنیت ام ہند اور طاہرہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ آپ کے

والد کا نام خویلد بن اسد تھا۔ جن کا سلسلہ نسب رسول اللہ ﷺ سے جا ملتا ہے۔ والدہ فاطمہ بنت زائدہ تھیں۔ حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا قریش کے ایک نہایت باعزت اور مقتدر گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں اور آپ کے والد ماجد کو مکہ میں بڑی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جب جوان ہوئیں تو اپنی نیک عادات، پاکیزہ اخلاق اور صفاتِ حسنہ کی وجہ سے طاہرہ کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ والد نے آپ کی ان خوبیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے بھائی کے بیٹے ورقہ بن نوفل کو شادی کے لیے منتخب کیا کیونکہ ورقہ بن نوفل عقائد کے لحاظ سے عیسائی تھے اور تورات اور انجیل کے بہت بڑے عالم تھے۔ لیکن کسی وجہ سے یہ شادی نہ ہو سکی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ابو ہالہ بن بناش تمیمی سے آپ کا نکاح ہوگا جن سے دو لڑکے ہالہ اور ہند پیدا ہوئے اسی نسبت سے آپ کی کنیت ام ہند مشہور ہے۔ آپ کے پہلے شوہر جلدی ہی انتقال کر گئے تو دوسرا نکاح عتیق بن عابد مخزومی سے ہوا۔ اسی دوران آپ کے والد اور خاوند حرب الفجار میں شریک ہوئے اور دونوں جنگ میں کام آگئے۔ باپ اور شوہر کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو سخت دشواری پیش آئی کیونکہ خاندان کا ذریعہ معاش تجارت تھا اور کام کو جاری رکھنا ابتداء میں ان کے لیے سخت مشکل تھا۔ تاہم انہوں نے خداداد ذہانت اور قابلیت سے کام لے کر یہ سلسلہ بدستور جاری رکھا اور دوسرے لوگوں کو منافع میں حصہ دے کر مالِ تجارت باہر بھیجتی رہیں۔ اس زمانے میں ہی حضرت محمد ﷺ کی دیانت، شرافت اور صداقت شعاری کا بہت چرچا تھا اور مکہ میں آپ امین کے لقب سے مشہور تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نیکی اور صداقت میں روحانی طور پر بہت کم فاصلہ ہوتا ہے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ طاہرہ امین کے اوصاف جمیلہ سے بے خبر رہتیں۔ چنانچہ ایک روز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ وہ ان کا مالِ تجارت لے کر شام جائیں اور وہ دوسروں کی نسبت آپ کو زیادہ حصہ دیں

گی۔ نبی اکرم ﷺ نے یہ پیشکش قبول فرمالی۔ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ایک غلام میسرہ کے ہمراہ مال لے کر بصریٰ تشریف لے گئے۔ اس سال خدا نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے کاروبار میں بہت برکت دی۔ اور پہلے سے دگنا منافع ہوا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کی دیانت اور صیانت اور راست بازی سے بے حد متاثر ہوئیں۔ اس وقت تک انہیں عرب کے بڑے بڑے رؤساء اور سرداروں کی طرف سے نکاح کے پیغام مل چکے تھے۔ مگر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کسی جگہ رضامندی کا اظہار نہ کیا کیونکہ اللہ نے ان کے لیے لافانی عظمت اور بلندی مقدر کردی تھی۔ جب حضرت محمد ﷺ سفر شام سے واپس آئے اور آپ ﷺ کے حسنِ کردار نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو ان کا گرویدہ بنادیا تھا فوراً نفیسہ بنت مینہ کی وساطت سے حضور کی خدمت میں خود نکاح کا پیغام بھیجا جسے حضور ﷺ نے بخوشی منظور فرمالیا۔ چنانچہ بعثت نبوی سے پندرہ سال قبل حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت محمد ﷺ سے ہوگیا۔ اس مقدس تقریب میں حضرت ابوطالب، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور دیگر رؤسائے قریش شریک ہوئے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا عمرو بن اسد کے مشورہ سے ۵۰۰ طلائی درہم پر ابو طالب رضی اللہ عنہ نے نکاح پڑھا اس وقت آنحضرت ﷺ کی عمر پچیس برس تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا چالیس سال کی تھیں۔

اس کے بعد جس وفاداری، خلوص ومحبت اور والہانہ شیفتگی کے ساتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت فرمائی اور ان کے ہر حکم پر لبیک کہا اس کی مثال نہیں ملتی۔ حضور ﷺ تو شہنشاہِ اغنیاء تھے اور انہیں مال ودولت سے ذرا محبت نہ تھی۔ اس لیے ان کے دروازے ہروقت ہر حاجت مند اور غریب کے لیے کھلے رہتے۔ حضور ﷺ کا اشارہ پاتے ہی حضرت خدیجہ الکبریٰ نے اپنی تمام دولت اللہ کے نام پر لٹادی اور اپنے لیے صرف سرورِ کائنات حضرت احمد مجتبیٰ ﷺ کی معیت کو کافی

خیال کیا۔ بعثت سے کچھ عرصہ پہلے آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ تھوڑے سے ستو اور پانی لے کر غارِ حرا میں خلوت گزیں ہو جاتے اور تنہائی میں اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے۔ اس زمانے میں بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی بے پناہ خدمت کی اور ہمیشہ آپ کے آرام اور آسائش کو پیشِ نظر رکھا۔

چنانچہ شادی کے پندرہ برس بعد آپ کو نبوت عطا ہوئی تو سب سے پہلے حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں کیونکہ ان سے بہتر شہنشاہ کونین حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کے صدق و دیانت اور سچائی کو کوئی نہیں جانتا تھا حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے قیامت تک کے لیے دنیا بھر کی مسلمان عورتوں کا دامن فخر و مباہات کی دولت سے بھر دیا۔

اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے پانچ نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں اس لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے ساتھ نوافل پڑھا کرتی تھیں۔ اور ایک عرصہ تک دونوں خفیہ طور پر نماز ادا کرتے رہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہی ایمان لائے تھے اور ابھی بہت کمسن تھے ان کے ساتھ نماز میں شریک ہوا کرتے تھے۔

جب آنحضرت ﷺ نے احکام الٰہی کی تعمیل میں کفارہ مکہ کو اسلام کی دعوت دی اور لوگوں نے آپ کو طرح طرح کی تکالیف پہنچانا شروع کیں اور آپ کو ستانے کے لیے ظلم و ستم پر اتر آئے تو اس وقت بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے پوری طرح آپ کا ساتھ دیا۔ آپ کو کفار کی تکذیب اور اذیتوں سے جو صدمہ ہوتا حضرت خدیجہ کے پاس آکر سب دور ہو جاتا کیونکہ وہ آپ کی باتوں کی تصدیق کرتی تھیں۔ اور مشرکین کے معاملے کو بہت غیر وقیع اور معمولی بنا کر آپ کے سامنے پیش کرتی تھیں۔

جب آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ صبر و استقلال نے مشرکین کے تمام حربوں کو

ناکام بنادیا اور دعوت و تبلیغ کا سلسلہ بدستور جاری رہا تو اہل مکہ نے آنحضور ﷺ اور ان کے مددگار افراد خاندان کا بالکل مقاطعہ کردیا۔ نہ کوئی ان سے ملتا تھا اور نہ گفتگو کرتا تھا بلکہ لوگوں نے انہیں ضروریاتِ زندگی تک فراہم کرنے سے انکار کردیا اور سب لوگ ان سے بالکل علیحدہ ہو گئے۔ چنانچہ حضرت ابوطالب خاندانِ بنو ہاشم سمیت مکہ سے قریب ایک گھاٹی شعبِ ابوطالب میں آ کر مقیم ہو گئے۔ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ بنو ہاشم کے لیے یہ سخت مصیبت اور تکلیف کا زمانہ تھا۔ پھر یہ ناقابلِ برداشت مصیبت چند ایام یا مہینوں تک کے لیے نہیں تھی بلکہ مکمل تین سال تک پورے خانوادۂ نبوی ﷺ نے درختوں کے پتے کھا کھا کر بسر اوقات کی تاہم کبھی کبھار حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اثر و رسوخ سے کھانے پینے کی کچھ اشیاء پہنچ جاتی تھیں۔ ایک روز حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم بن حزام نے تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ذریعے بھیجے۔ وہ بھی دشمنِ اسلام ابوجہل نے چھیننے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

کم و بیش پچیس برس تک پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی رفاقت میں رہنے کے بعد ہجرت سے تین سال پہلے ۱۱ رمضان ۱۰ نبوی کو انتقال فرمایا۔ اس وقت حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی عمر ساڑھے چونسٹھ برس کے قریب تھی۔ آپ کو حجون میں دفن کیا گیا۔ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ خود ان کی لحد میں اترے اور اپنی ہمدرد و مونس اور محبوب و غمگسار زوجہ مطہرہ کو اللہ کے سپرد کیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی مفارقت کو آنحضور ﷺ نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور ان کی رحلت سے آپ کو دلی طور پر اتنا صدمہ ہوا کہ مسلمانوں میں یہ سال عام الحزن کے نام سے مشہور ہو گیا۔

مستند روایات کے مطابق آنحضرت ﷺ سے ان کے ہاں دو لڑکے جو بچپن میں انتقال کر گئے اور چار صاحبزادیاں ہوئیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سب سے بڑی

بیٹی تھیں۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا ان سے چھوٹی تھیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اس قدر محبت تھی کہ ان کی زندگی میں کوئی دوسری شادی نہیں کی حالانکہ ان کی عمر نکاح کے وقت چالیس برس تھی۔ وہ بھی عمر بھر آنحضرت کی شیدائی، غمگسار اور سچی مشیر کار بن کر زندہ رہیں۔ اتنی متمول اور دولت مند ہونے کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتی تھیں اور انہوں نے بعثت سے پہلے ہی بت پرستی ترک کر دی تھی بلکہ زندگی کے عام معاملات میں بھی وہ آپ کے نقشِ قدم پر چلنے میں مسرت محسوس کرتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا درجہ کتنا بلند تھا اس کا اندازہ صحیح بخاری کی اس روایت سے ہو سکتا ہے۔ ایک دفعہ حضرت جبرائیل امین نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ خدیجہ رضی اللہ عنہا برتن میں کچھ لا رہی ہیں آپ ان کو اللہ کی طرف سے اور میرا اسلام پہنچا دیجئے۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت جبرائیل امین علیہ السلام خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر تھے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں تو انہوں نے کہا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جنت میں ایک ایسا گھر ملنے کی خوشخبری سنا دیجئے جو موتی کا ہو گا اور جس میں شور و غوغا اور محنت و مشقت نہ ہو گی۔

آپ کی وفات کے بعد بھی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض نبوی کی تعمیل کے لیے متعدد شادیاں کر لی تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے اپنی جان نثار اور بلند مرتبہ بیوی کو فراموش نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے اور اکثر ان کا ذکر سنتے ہی آبدیدہ ہو جاتے۔ گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپ خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے حصے بھجواتے۔ جنگ بدر میں جب کفار مکہ نے جنگی قیدیوں کی رہائی کے لیے دربارِ رسالت میں فدیہ بھیجا تو آپ کی صاحب زادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے خاوند ابوالعاص کی رہائی کے لیے اپنا وہی ہار بھیج دیا جسے

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پہنا کرتی تھیں اور شادی کے وقت وہی ہار جہیز میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مل گیا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہار کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔ اور وہ ہار واپس کر دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ رشک ہمیشہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا پر ہوتا تھا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ان کا ذکر فرماتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی ہمشیر ہالہ ملاقات کے لیے حاضر ہوئیں اور انہوں نے باہر سے اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز سنتے ہی فرمایا کہ ہالہ ہوں گی۔ ہالہ کی آواز نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی یاد تازہ کر دی تھی۔ وہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں۔ انہیں بہت رشک ہوا تو کہا آپ کیا ہر وقت ایک بوڑھیا کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ جو فوت ہو چکی ہیں اور اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے اچھی بیویاں دی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات ناگوار سی گزری اور فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ جب لوگوں نے میری تکذیب کی تو انہوں نے میری تصدیق کی۔ جب لوگ کافر تھے وہ اسلام لائیں۔ جب دنیا میں کوئی میرا ساتھ نہ تھا، انہوں نے میری مدد کی اور میری اولاد ان سے ہوئی۔

یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی بدولت حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کو دنیا کی تمام عورتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو تمام مسلمان عورتوں کے لیے مکمل نمونہ قرار دیا ہے۔ یعنی فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جس مسلمان عورت کی زندگی ان کے اوصاف حمیدہ اور حسنِ سیرت سے جتنی قریب ہوگی وہ اسی نسبت سے اتنی ہی بلند، لائق احترام اور امتِ مسلمہ کے لیے باعثِ فخر ہوگی۔ یہ وہ درخشندہ راستہ ہے جس کے ذاتِ خاک ستاروں کے لیے باعثِ رشک ہیں اور اس پر اسی تقویٰ وطہارت کے سائے میں چل کر ہر مسلمان عورت ماہِ کامل بن سکتی ہے اور انعامات اخروی کے علاوہ حیاتِ ابدی

کے خزانوں کو اپنے پاک آنچل سے سمیٹ سکتی ہے۔ ذرا سوچئے! ایک ایسی عالی نسب۔ بلند مرتبت اور ذی شان خاتون، دولت جس کے گھر کی کنیز ہو، جسے سکون و مسرت کے تمام اسباب میسر ہوں جو وسیع کاروبار کی مختار مطلق ہو۔ اور جس کی رفاقت کا ہر بڑے سے بڑا شخص دل سے متمنی ہو وہ فقر و استغناء کی اس حد تک پہنچ جائے کہ اس کے قلب و ذہن میں اپنے رفیع الدرجات شوہر کی محبت و اطاعت کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ اس کی زندگی درویشانہ سادگی اور تقویٰ و طہارت کی ایک ایسی تصویر ہو جس میں خود خالقِ کائنات نے اپنے دستِ قدرت سے رنگ بھرا ہو۔ وہ اللہ کی محبت میں سب کچھ لٹا دے اور حق و صداقت کی تائید میں ایسے مقام پر کھڑی ہو کہ کسی کا پرتوِ تصور بھی اس تک نہ پہنچ سکے ایسے دور میں جب بھری دنیا میں اللہ کی ذات کے سوا کوئی اس کے شوہر کا ساتھی نہ ہو۔ بلکہ دنیا خون کی پیاسی ہو رہی ہو اور چاروں طرف سے دشمنی، عداوت، تحقیر اور تکذیب کے علاوہ تکالیف و مصائب کے طوفانوں نے گھیر رکھا ہو۔

وہ اپنی قدسی صفت مسکراہٹوں کی چاندنی اس طرح بکھیر دے کہ غم و آلام کی تاریکی چشم زدن میں غائب ہو جائے۔ وہ تین برس تک اپنے اعزۂ اقارب اور رشتہ داروں کو چھوڑ کر، دنیا کی آسائشوں اور راحتوں سے منہ موڑ کر درختوں کے پتے کھانے پر اکتفا کرے اور پھر بھی ثابت قدم رہے بلکہ دوسروں کے عزم استقلال کو سہارا دے۔ ایسی مقدس، عالی مرتبہ اور عظمتوں کو تخلیق کرنے والی عظیم الشان خاتون سوائے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے اور کون ہو سکتی ہے۔ ان کی ذات اقدس اسلام کی بنیادی پتھر ہے۔ اور ان کے احسانات کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

حضرتِ سودہ رضی اللہ عنہا

آپ کا نام سودہ تھا اور کنیت الاسود مشہور تھی۔ قریش کے ایک نامور قبیلے عامر بن لوئی سے تھیں۔ آپ کے والد زمعہ بن قیس عرب کے ایک نامور سردار تھے آپ کی والدہ شموس خاندان بنونجار سے تھیں۔ آپ کا سلسلہ نسب نویں پشت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملتا ہے۔ آپ بچپن ہی سے اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ جمیلہ کا ایک ایسا روح پرور مرقع تھیں۔ کہ ان کی نکہت و بو سے پورا خاندان مہک رہا تھا۔ بزرگوں کی اطاعت، بچوں سے محبت اور سب کی ہر ممکن خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا طبیعت نہایت سنجیدہ تھی اور غور وفکر کی عادت بہت پختہ ہو چکی تھی۔ اگر چہ پورے ماحول پر کفر و ضلالت اور بت پرستی چھائی ہوئی تھی مگر حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی صداقت جو اور حقیقت کی پیاسی فطرت نے کبھی ان باتوں کو پسند نہ کیا۔ سنِ بلوغت کو پہنچتے ہی سکران بن عمر رضی اللہ عنہ سے آپ کی شادی ہوگئی۔ سکران رضی اللہ عنہ بھی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی طرح بے حد سلیم الطبع، خلیق اور نیک شخص تھے۔ ابتدائے نبوت میں یہ دونوں میاں بیوی دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے اور صدق دل سے ایمان لائے۔ اسلام لانے کے بعد آپ کے قبیلے اور رشتہ داروں نے دونوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔ خصوصاً حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اتنی بے رحمی کا برتاؤ کیا کہ آج بھی اس کی تفصیل سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ نے بڑی ثابت قدمی اور استقلال

کے ساتھ ہر قسم کے جور ستم کو برداشت کیا۔ مگر صراطِ مستقیم کو نہ چھوڑا۔ چونکہ آپ نے شروع ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اس لیے انہیں قدیم الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جب مشرکین کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو آپ رضی اللہ عنہا نے مہاجرین کی دوسری جماعت کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ حبشہ میں کئی برس تک رہنے کے بعد آپ رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت سکران رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ واپس آئیں تو کچھ عرصہ بعد حضرت سکران کا انتقال ہو گیا۔

ایسے نیک دل، حق پرست اور حلیم و خلیق شوہر کی وفات کے بعد آپ اکثر مغموم اور افسردہ رہا کرتی تھیں۔ ہجرت کے بعد آپ مکہ تشریف لائیں تو بہت سے قریبی رشتہ دار اور اعزہ یا تو فوت ہو چکے تھے یا حالات نے انہیں ادھر ادھر منتشر کر دیا تھا۔ باقی اہل قبیلہ ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ اس لیے اس بے بسی اور کسمپرسی کے عالم میں وہ پہلے سے بھی زیادہ مصائب کا شکار ہو رہی تھیں۔ مگر آپ صبر و توکل کا مجسمہ بنی بڑی خندہ پیشانی سے حالات کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ کو بہت افسوس ہوا حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد آپ نے بعوض چار سو درہم انہیں اپنے نکاح میں لے لیا۔ تمام ازدواج مطہرات میں یہ فضیلت صرف آپ کو حاصل ہے کہ حضرت خدیجہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد سب سے پہلے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں اگرچہ مورخین میں اختلاف رائے ہے بعض کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلے آپ کے عقد میں آئیں لیکن یہاں اس بحث کو چھیڑنا مناسب نہیں آپکے ہاں پہلے خاوند سے ایک لڑکا ہوا جس کا نام عبدالرحمان تھا۔ آپ کی حیاتِ طیبہ میں دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری آپ کا ایمان تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع کا خطبہ دیتے ہوئے ازدواج مطہرات سے فرمایا کہ میرے بعد گھر میں بیٹھنا تو

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اس حکم کی اس حد تک تعمیل کی کہ پھر کبھی حج کے لیے بھی تشریف نہ لے گئیں۔ ان کا دوسرا وصف سخاوت اور فیاضی تھا۔ آپ بہت زیادہ سخی، نرم دل اور فیاض تھیں۔ جو کچھ آپ کو ملتا سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا کرتی تھیں۔ آپ کو چمڑے کی دباغت میں کمال حاصل تھا چنانچہ طائف کی کھالیں بنایا کرتی تھیں اور اس سے جتنی بھی آمدنی ہوتی وہ سب غریبوں اور حاجت مندوں کے کام آتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کے متعلق فرماتی ہیں کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کسی عورت کو دیکھ کر مجھے یہ خیال نہیں ہوا کہ اس کے قالب میں میری روح ہوتی۔

ایک دفعہ ازواجِ مطہرات خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر تھیں۔ کسی نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سب سے پہلے کون فوت ہوگا تو آپ نے فرمایا کہ جس کا ہاتھ سب سے بڑا ہے۔ ازواجِ مطہرات نے اس وقت اس بات کا اصل مفہوم نہ سمجھا اور ایک دوسرے کے ہاتھ ناپنا شروع کر دیئے تو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ سب سے بڑا پایا۔ مگر جب سب سے پہلے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو معلوم ہوا کہ ہاتھ بڑا ہونے سے آپ کی مراد سخاوت تھی۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت غالباً ۲۲ھ میں وفات پائی۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی پاک زندگی شرم و عفت، صبر و استقامت، سخاوت اور عشقِ نبی کا ایک بہت بڑا سبق ہے۔ انہوں نے ابتدائے نبوت ہی میں جب کہ اپنے پرائے سب اسلام کو ملیامیٹ کر دینے پر کمربستہ تھے کسی قسم کے خوف و ہراس کو دل میں جگہ دیئے بغیر توحید کی دعوت کو قبول کیا اور اس کی پاداش میں بے پناہ مظالم برداشت کیے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا، ان کی سختیاں برداشت کیں، گھربار اور وطن تک چھوڑ دیا مگر ہدایت کے راستے سے سرِ مو انحراف گوارا نہ کیا۔ یہ استقلال، خدا پر بھروسا، ایمان کی محبت اور قربانی و ایثار کا جذبہ ایک سچی مسلمان خاتون کو وہ شرف

عطا کرتا ہے کہ ملائک بھی اس پر رشک کریں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کی یہی خصوصیات تھیں جنہوں نے ایک مجبور و بے بس بیوہ عورت کو شہنشاہِ کونین سرورِ عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور زوجیت کے قابل بنایا اور آج صدیاں بیت جانے کے بعد بھی ان کا اسمِ گرامی سنتے ہی ہر مسلمان کا سر ادب و احترام سے جھک جاتا ہے۔ اور کروڑوں مسلمان ان کی پاک سیرت کو اپنے لیے متاعِ بے بہا خیال کرتے ہیں۔

حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

"فَضْلُ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الطَّعَامِ عَلَى الثَّرِيْدِ۔" (حدیث نبوی۔طبرانی)

"عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت تمام عورتوں پر ایسی ہے جیسی ثرید کھانے کی تمام کھانوں پر ہے۔"

آپ کا نام عائشہ تھا اور حمیراء اور صدیقہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ آپ کی کنیت ام عبداللہ تھی۔ والد ماجد کا نام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور والدہ زینب رضی اللہ عنہا تھیں۔ آپ بعثتِ نبوی کے چار سال بعد شوال میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے عالی مرتبہ والد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بھائی اور جانثار دوست تھے۔ گھر میں عرفان و ہدایت کا دریا بہہ رہا تھا۔ آپ اس لحاظ سے بے حد خوش قسمت اور مبارک تھیں کہ کبھی کانوں میں کفر و شرک کی آواز نہیں پڑی چنانچہ فرماتی ہیں کہ میں نے جب سے اپنے والدین کو پہچانا ان کو مسلمان پایا۔ ابتدا میں وہ جبیر بن مطعم کے صاحب زادے سے منسوب تھیں لیکن انہوں نے اس بنا پر شادی کرنے سے انکار کر دیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذات گرامی ان کے گھر میں اسلام پھیلانے کا موجب بن جائے گی۔ چنانچہ ۱۰ نبوی میں پانچ سو درہم پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا نکاح

آنحضرت ﷺ سے ہوگیا اور آپ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ صرف آپ ہی پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی کنواری زوجہ مطہرہ تھیں۔ شادی کے وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نو برس تھی۔ کیونکہ عرب ایک گرم ملک ہے اس لیے وہاں لڑکیاں بہت جلد بالغ ہو جاتی ہیں۔ اس شادی سے قبل عرب میں منہ بولے بھائی کی بیٹی سے شادی نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح شوال کے مہینے میں شادی کرنا نحوست سمجھتے تھے۔ مگر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شادی نے ان فضول خیالات کو مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ شادی کا پیغام ملتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حیرت سے پوچھا کہ آنحضرت تو میرے منہ بولے بھائی ہیں تو آپ نے جواب دیا کہ تم میرے صرف دینی بھائی ہو یعنی حقیقی بھائی نہیں ہو کہ شادی نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی شادی اور رخصتی دونوں ماہ شوال میں ہوئیں۔ لوگ ماہ شوال کو صرف اس لیے منحوس خیال کرتے تھے کہ اس مہینے میں طاعون پھیلا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شادی سے یہ بدعت بھی ختم ہوگئی۔

آپ نے جس ذوق وشوق، خلوص ومحبت اور عقیدت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت کی اور خداداد ذہانت وفراست سے احکامِ قرآنی کو سمجھا اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تمام ازواجِ مطہرات میں آنحضرت ﷺ کو بہت زیادہ عزیز تھیں اگرچہ حقوق کے اعتبار سے حضور ﷺ نے کبھی کسی زوجہ مطہرہ کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کیا تاہم بعض خصوصیات اور اوصاف کی وجہ سے آپ ﷺ کے قلب مبارک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہت زیادہ عزت اور محبت تھی۔

آپ رضی اللہ عنہا نے شوال ۳ھ میں جنگِ احد میں حصہ لیا۔ وہ ام سلیم رضی اللہ عنہا کے ساتھ مشک میں پانی بھر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پلاتی تھیں ۵ھ میں غزوہ بنی مصطلق میں بھی حضور کے ساتھ تھیں۔ یہ شرف صرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے کہ جب

محبوبِ خدا حضرت محمد ﷺ نے وصال فرمایا تو آنحضرت ﷺ کا سر اقدس حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی گود میں تھا اسکے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ ہی آخری آرام گاہ بنا جو آج تک گنبد خضراء کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ ازواج مطہرات کے لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری شادی ممنوع قرار دی تھی اس لیے آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد آپ نے ۴۸ سال بیوگی کے عالم میں بسر کیے۔ اور اپنی زندگی کا ہر ایک لمحہ اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۳ھ میں آپ کے والد ماجد حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ بھی وفات پا گئے۔ اور آپ شفقت پدری سے بھی محروم ہو گئیں۔ ۵۸ھ میں سرسٹھ برس کی عمر کی تھی کہ اللہ کا پیغام آپہنچا۔ چنانچہ اسی سال امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں وفات پائی اور وصیت کے مطابق جنت البقیع میں رات کے وقت دفن ہوئیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ انہوں نے مستند روایات کے مطابق اپنے بھانجے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو متبنّٰی بنالیا تھا۔ ان ہی کے نام پر انہوں نے ام عبداللہ کنیت رکھی تھی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو کتب احادیث و تواریخ میں جو قابل رشک مقام حاصل ہے وہ چند لوگوں کو چھوڑ کر کسی بڑے سے بڑے صحابی کو بھی نصیب نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ تھی کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا آستانہ مبارک علماء فقہائے عصر، خلفائے وقت اور مجتہدین عالم اسلام کے لیے ایک مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ جہاں تک ان کے مرتبے اور فضائل کا تعلق ہے اس کا اندازہ آنحضرت ﷺ کی محبت اور لگاؤ سے ہو سکتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ واقعہ تخییر مسلمان خواتین کے لیے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نبی کریم ﷺ خود فقر و استغنا کا منبع اور سرچشمہ تھے اور انتہائی سادگی کی زندگی بسر فرماتے تھے۔ مہینوں گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ اکثر فاقے ہوتے رہتے تھے۔ اور خانہ رسالت میں دنیاوی آرام اور فراغت کا نام و نشان تک دکھائی نہ

دیتا تھا۔ اگرچہ آنحضور ﷺ کی صحبت نے ازواج مطہرات کی زندگیوں میں انقلاب برپا کردیا تھا تاہم بشری تقاضے اپنی جگہ پر موجود تھے وہ جب دیکھتی تھیں کہ پورا عرب مسلمانوں کے زیرِ نگیں آچکا ہے اور بے شمار دولت دربارِ رسالت میں پہنچ رہی ہے جس کا معمولی سا حصہ بھی ان کے آرام وراحت کے لیے کافی ہوسکتا ہے مگر سید الانبیاء ﷺ کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے بلکہ سب کچھ تقسیم فرمادیتے ہیں تو ازواج مطہرات نے متعدد بار نفقہ بڑھانے کا مطالبہ کیا۔ ایک مرتبہ تو یہ بات حضور ﷺ کو اتنی ناگوار گزری کہ آپ نے ایک ماہ تک گوشہ نشینی اختیار کیے رکھی حتیٰ کہ لوگوں کو خدشہ ہوا کہ شاید آنحضرت ﷺ نے ازواج مطہرات کو طلاق دینے کا ارادہ فرمالیا ہے یہ واقعہ ایلاء کے نام سے مشہور ہے۔ ایک ماہ بعد اللہ کی طرف سے آیت تخییر نازل ہوئی جس میں حضور ﷺ کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی ازواج مطہرات کو مطلع فرمادیں کہ دوراستے تمہارے سامنے ہیں۔ دنیا اور آخرت۔ اگر دنیا چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں رخصتی جوڑے دے کر اچھی طرح رخصت کردوں اور اگر تم خدا اور رسول کی خوشنودی چاہتی ہو تو خدا کے نیکو کاروں کے لیے بڑا اجر رکھا ہے۔ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم ربانی سے مطلع کیا انہوں نے جواب دیا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول ﷺ کو لیتی ہوں۔ اس کے بعد دوسری تمام ازواجِ مطہرات نے بھی ان کی تقلید کی۔ یہ وہ دوراستے ہیں جو ہر عہد، ہر دور اور ہر زمانے میں صرف حق وصداقت کے لیے جینے اور مرنے والوں کے سامنے آتے ہیں اور قرآن مجید میں یہ آیت آج بھی ایک بہت بڑی حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے کہ ایک مومن اور مسلمان عورت کی عظمت، سربلندی اور حیاتِ جاوید کے علاوہ ابدی راحتوں کا خزانہ کس راستے پر بچھا ہوا ہے، چند روزہ دنیاوی زندگی کے معمولی آرام و آسائش، نمود ونمائش اور راحتوں پر مٹنے والی ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو یہ فیصلہ خود کرنا چاہیے کہ قرآن کریم کا بتایا ہوا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سیرت سے جگمگاتا ہوا راستہ

انہیں منزلِ مقصود تک لے جا سکتا ہے یا اس دنیا کی جھوٹی نمائش اور راحت کی محبت ان کے لیے نجاتِ اخروی کا باعث بن سکتی ہے۔

آپ کے علم و فضل کا اعتراف بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم کو کبھی کوئی ایسی مشکل بات پیش نہیں آئی جس کو ہم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ معلومات نہ ملی ہوں۔ امام زہری جیسے بلند پایہ عالم فرماتے ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالمہ تھیں۔ بڑے بڑے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے پوچھا کرتے تھے۔ ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں کہ اگر تمام مردوں کا اور امہات المومنین کا علم ایک جگہ جمع کی جائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم وسیع تر ہوگا۔ عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن، فرائض، حلال و حرام، فقہ، شاعری، طب، عرب کی تاریخ اور نسب کا عالم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔

دین کے اہم اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا اور آج بھی بڑے بڑے مجتہدین کے زمرے میں ان کا نام لیا جاتا ہے۔ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتویٰ دیا کرتی تھیں۔ اکثر معتبر کتب میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں کہ انہوں نے بڑے بڑے اکابر صحابہ کے فیصلوں پر اعتراضات کیے ہیں اور دلائل کے ساتھ اپنے موقف کو ثابت کیا ہے علمِ حدیث میں ان کے درجے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ۲۲۱۰ احادیث مروی ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شرعی احکام میں ایک چوتھائی ان سے منقول ہے اس کے علاوہ انہوں نے علم کلام کے کئی مشکل مسائل سلجھائے ہیں۔ ان میں سے رویت باری تعالیٰ، علم غیب، عصمتِ انبیاء معراج اور ترتیبِ خلافت کے مسائل بہت مشہور ہیں۔ وہ رموزِ دین اور احکام ربانی کی روح کو

خوب سمجھتی تھیں چنانچہ قرآن حکیم کی ترتیب، مدینہ میں اسلام کی اشاعت کے اسباب، غسلِ جمعہ، نمازِ قصر کی علت، صوم عاشورہ کا سبب، حج کی حقیقت اور ہجرت کے معنی سے متعلق انہوں نے جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں وہ آج بھی علم دین سیکھنے والوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ تاریخ عرب پر انہیں اتنا عبور حاصل تھا کہ کوئی دوسرا ان کا ہم پلہ دکھائی نہیں دیتا۔ ایامِ جاہلیت میں عربوں کی حالت، رسم و رواج، اور طرز معاشرت کے علاوہ اسلامی تاریخ کے بے شمار واقعات ان کے ذریعے دنیا کو پہنچے ہیں۔ اس سے جو روایات منسوب ہیں ان میں جنگِ بدر، احد، خندق، قریظہ کے واقعات۔ فتح مکہ میں عورتوں کی بیعت، حجۃ الوداع کی ضروری باتیں۔ سرورِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی عادات اور اخلاق کے بارے میں قیمتی معلومات موجود ہیں۔ یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ پر وحی کیسے شروع ہوتی اور نزولِ وحی کے وقت ان پر کیا کیفیت طاری ہوتی تھی۔ ہجرت کیسے ہوئی اور کن لوگوں نے کی۔ قرآن کیسے نازل ہوا اس کی ترتیب کس طرح قائم ہوئی۔ نمازوں کی تفصیلات اور آنحضور ﷺ کے مرض الموت کے حالات اکثر و بیشتر ان سے مذکور ہیں جو تاریخ اسلامی کا بہت اہم حصہ خیال کیے جاتے ہیں۔

اکثر مورخین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فصاحت و بلاغت اور حسنِ بیان کا ایک بحرِ بے کراں تھیں چنانچہ موسیٰ ابن طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کسی کو فصیح اللسان نہیں دیکھا۔ جن روایات و احادیث میں ان کے اصل الفاظ محفوظ رہ گئے ہیں انہیں پڑھنے والا آج بھی حیران ہو جاتا ہے مثلاً آغازِ وحی سے متعلق ایک حدیث میں فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ جو خواب میں دیکھتے تھے سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہو جاتا تھا اسی طرح وحی کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی پیشانی پر موتی ڈھلکتے تھے کئی مورخین تسلیم کرتے ہیں

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد اگر خطابت میں کسی کا درجہ بلند تھا تو وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ انہوں نے جنگِ جمل کے موقع پر فوج کے سامنے جو تقریریں کی ہیں وہ فنِ خطابت کے شہ پارے ہیں اور تاریخ کے صفحات ان سے جگمگا رہے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اعلیٰ درجہ کی سخن شناس اور شعر و ادب کی قدر دان تھیں۔ عرب کے بلند پایہ اور مشہور شاعر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اکثر ان کی خدمت میں اشعار سنانے کے لیے آیا کرتے تھے۔ انہیں کعب بن مالک کے چالیس اشعار پر مشتمل پورا قصیدہ یاد تھا اس کے علاوہ دورِ جاہلیت اور اسلامی عہد کے کئی شعراء کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ علم و فضل میں آپ کے امتیاز اور انفرادیت کا اندازہ کیجئے کہ کم و بیش دو سو نامور اشخاص نے ان سے فیض حاصل کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی قناعت، سادگی، دلیری، شجاعت، سخاوت، فیاضی اور زہد و عبادت کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ ایک مرتبہ ان کے متبنیٰ بیٹے نے انہیں کثرتِ خیرات سے روکنا چاہا تو ان سے گفتگو نہ کرنے کی قسم کھا لی۔ ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کیا کرتی تھیں۔ اکثر روزے رکھتی تھیں۔ اور ہر سال پابندی کے ساتھ حج کرتی تھیں۔ انہیں غلام آزاد کرنے کا بھی شوق تھا چنانچہ بعض کتابوں میں ان کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ۶۷ کے قریب لکھی ہے۔

حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب مسلمانوں میں نفاق کی آگ بھڑک اٹھی اور بڑے بڑے جید صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں تو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ جا کر انہیں حالات سے آگاہ کیا۔ آپ خلوصِ نیت سے اس فتنے کو روکنے کی خاطر بصرہ تشریف لے گئیں مگر طرفین کی غلط فہمیوں، اغیار کی ریشہ دوانیوں اور خارجی فرقے کی سازشوں نے وہ افسوسناک صورتِ حال پیدا کر دی جسے تاریخ میں جنگِ جمل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس

جنگ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مقابل حضرت علی کرم اللہ وجہہ تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر بیٹھ کر فوجوں کی کمان کر رہی تھیں۔ اسی وجہ سے اس لڑائی کو جنگ جمل کہتے ہیں کیونکہ عربی میں جملِ اونٹ کو کہتے ہیں۔ بعد کے واقعہ نگاروں نے اس حادثے کو اتنی مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے خلوصِ نیت اور صدق دلی تک کو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ لڑائی قطعی طور پر اتفاقی تھی اور محض غلط فہمیوں کا نتیجہ تھی۔ تاہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آخر دم تک اس کا بے حد افسوس رہا ہے اور اس کے بعد آپ نے اٹھارہ برس کا طویل عرصہ عزلت نشینی میں بسر کیا۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق آپ نے وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ انہیں روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں آنحضرت کے ساتھ دفن نہ کیا جائے بلکہ دوسری ازواج مطہرات کے ساتھ جنت البقیع میں دفن کیا جائے۔ وہ جب قرآن کی یہ آیت پڑھتی تھیں کہ پیغمبر کی بیویو! اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ بیٹھو تو اس قدر روتی تھیں کہ آنچل تر ہو جاتا تھا۔

آپ کی حیاتِ طیبہ میں مسلمانوں عورتوں کے لیے بیش بہا اسباق پوشیدہ ہیں۔ جنہیں زیورِ حیات بنا کر آج بھی ہماری خواتین تاریخ کے اوراق کو اپنے کارناموں سے مزین کر سکتی ہیں۔ اور وقت کی رفتار بدل سکتی ہیں۔ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کم و بیش پندرہ سو سال پہلے پیکرِ علم و حکمت اور کمالِ فن کا درجہ حاصل کر سکتی تھیں اور پردہ نشینی کے عالم میں علماء فضلا کی استاد ہونے کا شرف حاصل کر سکتی تھیں تو آج ہماری عورتیں ان کے نقش قدم پر چل کر کیا کچھ نہیں کر سکتی ہیں۔ کاش! ہم دوسروں کی اندھا دھند تقلید کی عادت ترک کر کے اپنے گھروں میں بہنے والے دریائے علم و معرفت سے قلب و نظر کی دنیا کو سیراب کر سکیں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا

> "اِنَّھَا صَوَّامَۃٌ قَوَّامَۃٌ۔" (ابن سعد)
>
> "آپ سخت روزہ رکھنے والی اور سخت شب بیدار تھیں۔"

آپ کا نام حفصہ رضی اللہ عنہا تھا۔ فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ والدہ زینب بنت مظعون ایک مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح خنیس بن حزافہ سے ہوا جو غزوۂ بدر میں بری طرح زخمی ہوئے اور ان زخموں کی وجہ سے انتقال فرما گئے۔ کچھ عرصہ بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی سادہ طریقے سے نکاح ہو گیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں انتقال فرمایا اور وفات کے وقت غابہ جو جائیداد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے سپرد کر گئے تھے صدقہ کر کے وقف کر دی، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

آپ بیحد ذہین اور دینی امور پر کافی عبور رکھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی تعلیم کا بہت خیال رہتا تھا۔ آپ کثرت سے روزے رکھنے اور راتوں کو جاگ کر عبادت کرنے میں بہت سی ازواج مطہرات سے ممتاز تھیں۔ حد یہ ہے کہ وفات کے وقت تک روزے سے رہیں۔ آپ سے ساٹھ کے قریب احادیث

مروی ہیں۔

آپ کو اختلافات اور جھگڑے فساد سے سخت نفرت تھی۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمانوں میں باہم اختلافات پیدا نہ ہوں بلکہ وہ باہم اتفاق اور محبت سے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں۔ اگر چہ انہوں نے عملی طور پر عام قومی اور ملکی معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا۔ تاہم جب بھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا جس سے امت میں اختلاف کا خطرہ ہوتا تو آپ کو اس سے بہت تکلیف ہوتی۔ جنگ صفین کے بعد جب مسلمانوں میں باہم کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جن کی وجہ سے حالات قابو سے باہر ہوتے دکھائی دینے لگے تو آپ کے حقیقی بھائی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اسے فتنہ خیال کرتے ہوئے الگ تھلگ رہنے اور گوشہ نشینی اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ کوئی نامناسب قدم اٹھ جانے کے باعث وہ بھی حالات کو خراب کرنے والوں میں شریک خیال نہ کیے جائیں جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھائی کے ارادے کا علم ہوا تو انہیں بلا کر کہا کہ اگر چہ ان معاملات میں شریک رہنا ذاتی طور پر تمہارے لیے فائدہ مند نہیں تاہم تمہیں مسلمانوں سے الگ ہو کر گوشۂ تنہائی میں نہیں بیٹھنا چاہیے کیونکہ لوگوں کو تمہاری رائے کا انتظار رہے گا۔ ممکن ہے کہ تمہارے الگ تھلگ رہنے اور موجودہ مسائل میں دخل نہ دینے کی وجہ سے عام مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج اور زیادہ وسیع ہو جائے۔ چونکہ فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ قریب تھے اس لیے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو اس قرب نبوی پر بہت فخر حاصل تھا اور چند ایک مواقع پر انہوں نے اس کا اظہار بھی فرمایا۔ مزاج میں قدرے تیزی تھی اس لیے اپنے خاندانی قرب اور مرتبے کی وجہ سے بعض اوقات سادگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی برابر کا جواب دے دیتی تھیں لیکن ادب واحترام اور عقیدت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو سختی سے

ڈانٹا اور کہا خبردار! میں تمہیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ تھیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی اور اسلام کے بطلِ عظیم کی بیٹی تھیں لیکن زہد و عبادت میں کسی سے پیچھے نہ تھیں انہیں یہ شرف حاصل تھا کہ جب دوسرے لوگ آرام کرتے تھے وہ راتوں کو جاگ کر مجسمہ عجز و انکسار بن کر عبادت کرتی تھیں۔ دن کو مسلسل روزے رکھتی تھیں حتیٰ کہ تادمِ آخر امتیازی شان برقرار رہی۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی یہی وہ خصوصیت تھی کہ اللہ نے انہیں اُمّ المومنین ہونے کا شرف عطا فرمایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دامانِ رحمت میں جگہ دی۔

ہماری ان بہنوں اور بیٹیوں کے لیے جو اپنی خواہشات اور تمناؤں کی پرکشش میں گم رہتی ہیں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے۔

اُمّ المساکین حضرت زینب رضی اللہ عنہا

جن کی پوری زندگی سخاوت اور فیاضی سے عبارت تھی۔

نام زینب رضی اللہ عنہا تھا۔ باپ کا نام خزیمہ بن عبداللہ تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب قریش کے مشہور خاندان عبد مناف تک پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ آپ کا پہلا نکاح عبداللہ بن جحش سے ہوا۔ آپ کے شوہر جنگ اُحد میں شہادت پائی تو اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نکاح میں لے لیا۔ ابھی حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تشریف لائے دو، تین مہینے گزرے تھے کہ اپنے خالق سے جاملیں۔ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے وفات پائی۔ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں وفات کے وقت آپ کی عمر تیس برس تھی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا اس درجہ غریب پرور، مسکین نواز، رحمدل، فیاض اور سخی تھیں کہ آپ کی کنیت ہی ام المساکین یعنی مسکینوں کی ماں مشہور ہوگئی۔ وہ غریبوں، مسکینوں اور بھوکوں کو کھانا کھلانے میں ہر وقت مصروف رہتی تھیں۔ اور اسی میں انہیں روحانی مسرت ملتی تھی۔ ان کا لقب ہی ان کی حیاتِ طیبہ کا منہ بولتا عنوان ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسروں کی خدمت اور اعانت ہی ان کی زندگی کا سب سے

بڑا مقصد تھا۔ اگرچہ وہ چند ماہ تک حرم نبوی ﷺ میں زندہ رہیں مگر ان کی پاکیزہ، سادہ اور جذبہ ایثار میں ڈوبی ہوئی زندگی انسانیت دوستی کا ایک روشن باب ہے۔ اپنی ضروریات کی پروانہ کرتے ہوئے حاجتمندوں کے کام آنا۔ خود فاقہ سے رہنا مگر بھوکوں کو پیٹ بھر کر کھلانا اور کسی کو خالی ہاتھ مایوس نہ جانے دینا اتنا بڑا وصف ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے آج کہاں ہیں ایسی سراپا سخاوت خواتین جو ان کے بنائے ہوئے راستے پر چند قدم بھی چل سکیں۔ جس قوم کو ایسی مائیں اور بہنیں مل جائیں وہ ہمیشہ تاریخ کا رخ بدل دیا کرتی ہیں اور دنیا کی عظمتیں ان کے قدموں پر سجدہ ریز ہوتی ہیں۔

حضرتِ اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا

وہ کامل العقل اور صائب الرائے تھیں۔ (اصابہ)
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات احادیث کا خزانہ تھیں تاہم عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا ان میں کوئی مدمقابل نہ تھا۔ (محمود بن لبید)

آپ کا اصل نام ہند تھا اور کنیت ام سلمہ مشہور تھی۔ خاندانِ بنی مخزوم سے تھیں۔ آپ کے باپ کا نام ابی امیہ سہیل اور ان کی والدہ عاتکہ بنت عامر بنو فراس سے تھیں۔ آپ کے والد فیاضی اور دریا دلی کی وجہ سے زادالراکب کے نام سے مشہور تھے کیونکہ وہ جب بھی سفر پر جاتے تو پورے قافلے کے اخراجات خود برداشت کرتے تھے آپ کا پہلا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رضائی بھائی عبداللہ بن عبدالاسد سے ہوا۔ آغاز نبوت میں شوہر کے ساتھ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئیں۔ اسلام لانے کے بعد حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ واپسی کے کچھ عرصہ بعد دوبارہ مدینے کی طرف ہجرت فرمائی چنانچہ آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والی پہلی خاتون ہیں۔ جب انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کا قصد کیا تو ان کے خاندان والوں نے سختی سے روک دیا۔ چنانچہ ان کے شوہر بیوی اور بچے سلمہ کو چھوڑ کر تنہا چلے گئے یہ روزانہ گھر سے باہر نکل کر رویا کرتی تھیں۔ آخر کئی دن کے بعد خاندان والوں نے ترس کھا کر انہیں جانے

کی اجازت دی تو تنہا روانہ ہو گئیں۔ کعبہ کے کلید بردار عثمان بن طلحہ نے انہیں تنہا جاتے دیکھا تو ازراہِ ہمدردی ساتھ ہو لیا۔ راستے میں جب پڑاؤ ہوتا تو وہ اونٹ کھڑا کر کے کسی درخت کے نیچے چلا جاتا۔ جب روانگی کا وقت آتا تو اونٹ پر کجاوہ رکھ کر ہٹ جاتا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ایسا شریف آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ وادی قباء کے نزدیک عثمان انہیں چھوڑ کر واپس چلا گیا جب وہاں لوگوں کو معلوم ہوا کہ ابو امیہ ایسے معزز رئیس کی بیٹی اس حالت میں ہجرت کر کے آئی ہے تو انہیں سخت حیرت ہوئی۔ ہجرت کے چوتھے سال ان کے شوہر وفات پا گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ابو سلمہ رضی اللہ عنہ نے وفات پائی تو میں وہ بات یاد کی جس کو وہ مجھ سے بیان کرتے تھے اور میں نے دعا شروع کی تو جب میں یہ کہنا چاہتی کہ خداوند! مجھے ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بہتر جانشین دے تو دل کہتا کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہا سے بہتر کون مل سکتا ہے؟ لیکن میں نے دعا کو پڑھنا شروع کر دیا تو ابو سلمہ رضی اللہ عنہا کے جانشین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے۔ عدت کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نکاح کا پیغام دیا تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا کہ کچھ عذر ہیں۔ میں بڑی غیرت مند عورت ہوں، پھر میرے بچے ہیں اور میری عمر بھی کافی ہے مگر رحمۃ للعالمین نے سب عذر قبول فرما لیے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے لڑکے عمر نے خطبہ نکاح پڑھا اور آپ اُمّ المومنین کے زمرے میں شامل ہو گئیں۔ عمر بھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑے ذوق و شوق سے خدمت کرتی رہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے مکان میں تشریف لاتے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بستر آپ کے جانماز کے سامنے بچھتا تھا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے غلام حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کو اس شرط پر آزاد کیا تھا کہ جب تک سرورِ دو عالم زندہ رہیں ان کی خدمت لازمی ہو گی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے فہم و فراست کی مورخین نے بہت تعریف کی ہے۔ صلح

حدیبیہ میں جب آنحضرت ﷺ نے کفارِ مکہ سے صلح کر لی اور صلح کی شرائط عام مسلمانوں کے نزدیک اچھی نہ تھیں اس لیے لوگ کچھ کبیدہ خاطر تھے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو قربانی کرنے کا حکم دیا مگر سب لوگ افسردگی کے عالم میں بیٹھے رہے آنحضرت ﷺ نے گھر آ کر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ذکر کیا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں بلکہ باہر خود نکل کر قربانی کریں اور احرام اتارنے کے لیے بال منڈوائیں۔ آپ کے ایسا کرنے سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ نبی ﷺ کا فیصلہ نہیں بدل سکتا چنانچہ سب نے اسی وقت آنحضور ﷺ کی تقلید کی اور ہر شخص ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔ بظاہر تو یہ معمولی سا واقعہ ہے مگر حقیقت میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی خداداد ذہانت سے ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عالم لوگوں کی نفسیات کو کس گہرائی سے سمجھتی تھیں۔ اکثر بزرگ مورخین نے لکھا ہے کہ عورتوں کی ساری تاریخ اصابتِ رائے کی ایسی شاندار مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ۱۱ھ میں جب آنحضرت ﷺ سخت علیل ہوئے اور طبیعت بہت زیادہ خراب ہوئی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا چیخ اٹھیں، سرکارِ دو جہاں ﷺ نے منع فرمایا اور کہا۔ یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں۔ ایک روز حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حبشہ کے گرجوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہاں مجسمے اور تصویریں ہوتی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ان لوگوں میں جب کوئی نیک انسان مرتا ہے تو وہ اس کے مدفن کو عبادت گاہ بنا لیتے ہیں اور اس کا بت بنا کر اس میں کھڑا کرتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک یہ لوگ بدترین مخلوق ہوں گے۔ ۶۱ھ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے خواب میں دیکھا کہ محبوبِ خدا ﷺ نہایت پریشان حالت میں تشریف لائے ہیں۔ سر اور ریشِ مبارک پر غبار پڑا ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا حال ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حسین رضی اللہ عنہ کے مقتل سے آ رہا ہوں۔ حضرت ام

سلمہ رضی اللہ عنہا جب بیدار ہوئیں تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اور بے تاب ہو کر فرمایا کہ اہل عراق نے حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ خدا ان کو قتل کرے۔ انہوں نے حسین رضی اللہ عنہ کو ذلیل کیا۔ خدا ان لوگوں پر لعنت کرے۔

۶۳ھ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ۸۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان دنوں ولید بن عتبہ مدینہ کا گورنر تھا۔ چونکہ آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ وہ میرے جنازے کی نماز نہ پڑھائے اس لیے وہ جنگل کی طرف نکل گیا اور اپنی جگہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو بھیج دیا۔

آپ کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز میں قرآن پڑھ سکتی تھیں۔ علمِ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ انہیں محدثین صحابہ کے تیسرے طبقے میں شامل کیا جاتا ہے۔ وہ مجتہد تھیں اور ان کی رائے بڑی صائب اور وزنی ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ان کے فتاویٰ جمع کیے جائیں تو کتاب بن سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی خاص فضیلت یہ ہے کہ ان کے فتووں پر بالعموم سب اتفاق کرتے ہیں اس سے ان کی عقل و دانش، فہم و تدبر، قوت فیصلہ انکی نکتہ سنجی کا ثبوت ملتا ہے۔ انہوں نے کئی ایک کبائرِ صحابہ کے فیصلوں کی اصلاح کی ہے جن کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے۔ جن میں مشہور و معروف بزرگوں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے علم حدیث حاصل کیا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر عبدالرحمان بن ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ، رافع رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ اور عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بہت مشہور ہیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بے حد پاکباز، زاہدہ اور عابدہ تھیں۔ ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھتی تھیں۔ یہ شرف ان ہی کو حاصل ہے کہ آیۂ تطہیر ان کے گھر میں نازل ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمۃ الزاہراء رضی اللہ عنہا، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، حضرت امام

حسین رضی اللہ عنہ کو بلا کر کمبل اوڑھایا اور فرمایا: خدایا! یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے ناپاکی کو دور کر اور ان کو پاک کر۔ جب حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے سنا تو عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی ان کے ساتھ شریک ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم اپنی جگہ پر ہو اور اچھی ہو۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا خصوصیت کے ساتھ سنتِ نبوی کی سختی سے پابندی کرتی تھیں اور عام روزمرہ کی باتوں میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کو پیشِ نظر رکھتی تھیں۔

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہا کا یہ شرف ہی کم نہیں کہ وہ شہنشاہ کونین کی محبوب زوجہ مطہرہ تھیں۔ مگر آغوش اسلام میں آنے کے بعد اللہ نے انہیں علم و فضل، تقویٰ و طہارت، وسعتِ قلب ونظر، اصابت رائے اور بے مثل فہم وفراست کی جس دولت سے نوازا اور صحبتِ نبوی میں رہنے سے جس طرح یہ جوہر چمکے وہ ہماری تاریخ کا لازوال سرمایہ ہیں۔ ان کے پاکیزہ کردار عمل کی ایک معمولی سی جھلک آج بھی ہماری دنیا کو بدل سکتی ہے۔ ان بلند رتبہ، بزرگ اور پاک خواتین نے جید عالم صحابہ اور فضلاء کے سینوں کو علمِ دین کی تجلیات سے معمور کر دیا اور وہ ہمیشہ اسی سعادت پر نازاں رہے۔ ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے مسلمان عورتیں خود سوچ سکتی ہیں کہ وہ اگر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں گم ہو کر کندن بن جائیں تو آج بھی فرشِ خاک سے لے کر عالمِ نور تک بلند ترین مراتب اور درجات ان کے لیے چشمِ براہ ہیں۔ کاش! یہ اس شمع نور سے اپنے نہاں خانہ دل کو روشن کر سکیں۔

حضرت زینب بن جحش رضی اللہ عنہا

""میں نے کوئی عورت زینب رضی اللہ عنہا سے زیادہ دیندار، زیادہ پرہیزگار، زیادہ راست گفتار، زیادہ فیاض، سخی، مخیر اور خدا کی رضاجوئی میں زیادہ سرگرم نہیں دیکھی۔""

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا)

""حضرت زینب نیک خو، روزہ دار، نماز گزار تھیں۔""

(حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا)

حضرت زینب رضی اللہ عنہا قریش کے خاندان اسد بن خزیمہ سے تھیں۔ والد کا نام جحش اور والدہ اُمیمہ عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ نبوت کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوئیں۔ آپ کا پہلا نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام متبنیٰ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا اگرچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا قریش کے معزز ترین اور باعظمت خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ اوران کا خاندان کعبہ کا متولی ہونے کے باعث پورے عرب میں شاہانہ وقار کا حامل تھا۔ مگر اسلام نے نسب ونسل کی بلندیوں کا بت چکنا چور کر کے مسلمانوں کو مساوات کی تعلیم دی تھی اسلام کے نزدیک صرف تقویٰ اور دینداری ہی شرف و بزرگی

کا معیار رہا ہے۔ اس کی نگاہ میں امیر و غریب، بلند و پست، گورا اور کالا سب برابر ہیں۔ تہذیب و تمدن میں حیرت انگیز ترقی کر لینے کے باوجود دائرہ اسلام سے باہر رہنے والی دنیا آج بھی انسان کو یہ عظمت نہیں دے سکی۔ یہ شرف حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کو حاصل ہے کہ انہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن ہونے اور عرب کے ممتاز ترین گھرانے سے متعلق ہونے کے باوجود ایک غلام سے شادی کر لی۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما اگر چہ دوسروں کی نظر میں ایک غلام تھے مگر متقی اور صالح ہونے کی حیثیت میں وہ اسلام کے نزدیک کسی عالی نسب رئیس بادشاہ سے زیادہ معزز اور لائقِ احترام تھے۔ تاریخ اسلام میں اس شادی کو اس لیے بے پناہ اہمیت حاصل ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ذاتِ گرامی عملی طور پر نسلی تفاخر اور خاندانی تکبر کے صنم خانے کو پیوندِ زمین کرنے کا باعث بنی اور اسلام کا نظریہ مساوات قلب و ذہن کی گہرائیوں میں پیوست ہو گیا۔ یہ زریں مثال حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے قائم کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ایک مشعل روشن کر دی۔ جس کی روشنی میں بعد کے کئی غلاموں نے شہزادیوں سے شادیاں کیں اور تخت و تاج کے وارث بنے تاریخ ہند میں تو خاندان غلاماں کی حکومت کا ایک باب موجود ہے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شادی کو ابھی بمشکل ایک سال ہی گزرا تھا کہ میاں بیوی میں شکر رنجی شروع ہو گئی۔ چونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ طبیعت کے لحاظ سے بہت زود رنج اور درویش منش تھے مگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی طبیعت میں قدرے تیزی تھی اس لیے دن بدن تلخی بڑھتی گئی آخر ایک روز زید رضی اللہ عنہ نے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ زینب رضی اللہ عنہا ان سے زبان درازی کرتی ہیں۔ اس لیے وہ انہیں طلاق دینا چاہتے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بار بار سمجھاتے رہے اور کوشش فرماتے رہے کہ میاں بیوی میں ناچاقی ختم ہو جائے مگر زید رضی اللہ عنہ طلاق دینے پر مصر رہے جب مصالحت کی کوئی صورت نہ پیدا ہو سکی تو

زید رضی اللہ عنہ نے انہیں طلاق دے دی۔ بعض اسلام دشمن مورخین نے دبی زبان میں اس علیحدگی کو اسلام کے نظریہ مساوات کی ناکامی قرار دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اسلام کا یہ کامل اور جامع نظریہ اس کی تعلیمات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور آج تک اپنی جگہ پر موجود ہے۔ اس کی صداقت اور بنیادی اہمیت مسلّم ہے۔ اسلام نے ساڑھے چودہ سو سال قبل انسان کو جس عظمت سے ہم کنار کیا تھا اور جس فیصلہ کن انداز میں طبقاتی امتیازات کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ یورپ کی ترقی یافتہ تہذیب کا دامن آج بھی اس سے خالی ہے۔ اور موجودہ دور اس حسین خواب کی تعبیر کے لیے ترس رہا ہے جہاں تک حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور زید رضی اللہ عنہ کی علیحدگی کا تعلق ہے۔ وہ صرف طبیعتوں کے اختلاف کا نتیجہ تھا۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ کئی اعلیٰ خاندانی شادیوں کے انجام بھی انتہائی افسوسناک ہوتے ہیں۔ پھر صدیوں بعد کئی ایسی مشہور تاریخی شادیاں ہوئیں جو بے حد کامیاب ثابت ہوئیں۔

ایام جاہلیت میں عربوں کا یہ عام دستور تھا کہ وہ منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کا درجہ دیتے تھے۔ اور ان کے نزدیک متبنّٰی کی بیوی سے شادی کرنا جائز نہ تھا۔ مگر اسلام نے اس قسم کے رشتوں کو خونی رشتوں کے برابر تسلیم نہیں کیا۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بدعت کو عملی طور پر ختم کرنے اور حضرت زینب کی دلجوئی کے لیے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو شادی کا پیغام دے کر بھیجا۔ جب زید رضی اللہ عنہ ان کے گھر پر آئے تو وہ آٹا گوندھ رہی تھیں۔ انہوں نے منہ پھیر کر کہا۔ "زینب رضی اللہ عنہا! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ میں استخارہ کیے بغیر کوئی رائے قائم نہیں کیا کرتی۔ یہ کہا اور جانماز پر کھڑی ہو گئیں۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی۔ چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے رضامندی کا اظہار کر دیا تو نکاح ہو گیا۔ اور آپ بھی اُمّ المومنین کے لقب سے سرفراز ہوئیں۔ شادی کے بعد دعوت ولیمہ ہوئی

جس میں تین صد کے قریب لوگ شریک ہوئے۔اسی دعوت میں آیت حجاب نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اے ایمان والو! نبی ﷺ کے گھروں پر مت جایا کرو۔مگر جس وقت تم کو کھانے کے لیے اجازت دی جائے۔اس طرح کہ تم اس کی تیاری کے منتظر نہ رہو۔لیکن جب تم کو بلایا جائے تب جایا کرو۔پھر جب کھانا کھا چکو تو اٹھ کر چلے جایا کرو۔اور باتوں میں جی لگا کر مت بیٹھے رہا کرو اس بات سے نبی ﷺ کو ناگواری پیدا ہوتی ہے سو وہ تمہارا لحاظ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ صاف بات کہنے سے لحاظ نہیں کرتا۔تو جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر مانگو۔اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے دروازے پر پردہ لٹکا دیا۔آیتِ حجاب کا تعلق اگرچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی دعوتِ ولیمہ سے ہے لیکن یہ مجلسی آداب واطوار کا ایک حسین مرقع بھی ہے جس کا ہر ایک لفظ تہذیب وشائستگی اور شرافت کا سبق دیتا ہے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ۲۰ھ کو وفات پائی۔اس وقت آپ کی عمر پرترپن برس کی تھی۔آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد ازواج مطہرات میں آپ نے سب سے پہلے انتقال فرمایا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا ازواج مطہرات میں ممتاز درجہ رکھتی تھیں چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ازواج میں سے وہی رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں عزت ومرتبہ میں میرا مقابلہ کرتی تھیں۔ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی زینب رضی اللہ عنہا سے زیادہ دیندار، زیادہ پرہیز گار، زیادہ راست گفتار، زیادہ فیاض، سخی، مخیر اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے میں زیادہ سرگرم نہیں دیکھی۔فقط مزاج میں ذرا تیزی تھی جس پر ان کو بہت جلد ندامت بھی ہوتی تھی۔

زہد وعبادات اور تقویٰ و پرہیز گاری کا ایک نمونہ تھیں۔صبر وقناعت اور فیاضی

میں وہ بہت ممتاز تھیں۔ سخاوت اور دریا دلی میں ان کا درجہ بہت ہی بلند تھا چنانچہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ ازواج میں ہے سب سے پہلے کون ان سے ملے گی تو آپ نے فرمایا کہ تم میں مجھ سے جلد وہ ملی گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔ ازواج نے اس ارشاد سے عام معنی اخذ کرتے ہوئے اپنے ہاتھ ناپنا شروع کر دیئے مگر جب وصالِ نبوی ﷺ کے بعد سب سے پہلے ان کا انتقال ہوا تو ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ آنحضرت ﷺ کی مراد سخاوت تھی۔ اس سے ان کی فیاضی کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی محنت سے جو کچھ کماتی تھی وہ بھی راہِ خدا میں لٹا دیتی تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا وظیفہ ارسال فرمایا تو انہوں نے اس پر کپڑا ڈال دیا اور برزہ بنت رافع سے کہا کہ اسے میرے اقرباء اور یتیموں میں تقسیم کر دو۔ جب سب درہم تقسیم ہو چکے تو آپ رضی اللہ عنہا نے دعا کی کہ اے پروردگار! اس کے بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عطیہ سے فائدہ نہ اٹھاؤں چنانچہ دعا قبول ہوئی اور اسی سال رحلت فرمائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے وفات پائی تو مدینہ کے محتاجوں اور مسکینوں میں کہرام مچ گیا اور وہ گھبرا گئے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کے نکاح سے اسلام کا نظریہ مساوات عملی طور پر قائم ہوا اور انسانیت نے عظمت و رفعت کا ایک نیا سبق سیکھا۔ جاہلیت کی یہ رسم ختم ہوئی کہ متبنیٰ حقیقی بیٹے کے برابر حیثیت رکھتا ہے۔ نکاح کے لیے وحی الٰہی نازل ہوئی۔ دعوت ولیمہ میں سادگی کے ساتھ حسنِ تکلف کی آمیزش ہوئی اور پردہ کا حکم نازل ہوا۔ اگرچہ وقت اور انسان دونوں بہتے پانی کی طرح گزر جانے والی چیزیں ہیں۔ وقت بھی گزر جاتا ہے اور انسان بھی اپنی حیاتِ مستعار کے دن پورے کر کے ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ مگر نیکی، صداقت، پارسائی اور بلند اوصاف کی طاقت سے وہ صفحۂ ہستی پر ایسے نقوش مرتسم کر سکتا ہے کہ روز قیامت تک

وہ ماہتاب و آفتاب بن کر چمکتے رہیں۔ اور دنیا ان سے روشنی حاصل کرتی رہے۔
حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی پاک درخشندہ زندگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ حیاتِ جاوید کا راز صرف پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اوصاف میں پوشیدہ ہے۔ اور یہ دولت ہمیں قرآن حکیم اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لازوال خزانے سے ہی مل سکتی ہے۔ انسان فانی ہے۔ وہ فنا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے اوصاف حمیدہ افق زندگی پر ہمیشہ ستاروں کی طرح جگمگاتے رہتے ہیں۔ یوں تو دنیا میں لاکھوں کروڑوں ایسی خواتین ہو گزری ہیں جنہوں نے اپنے بادشاہوں اور شہنشاہوں کے محلات میں جنم لیا یا انہیں آباد رکھا اور اپنی چندروزہ زندگیاں عیش و عشرت میں بسر کیں مگر آج ان کی بہت بھاری اکثریت کا کسی کو علم تک نہیں۔ کوئی ان کے ناموں تک سے واقف نہیں۔ ان کے جاہ و جلال کو مٹی کے ذروں نے اپنے اندر جذب کر کے خاکِ راہ بنا دیا مگر اس کے برعکس کاشانۂ نبوت کو آباد رکھنے والی ان مقدس اور عفت مآب ہستیوں کو دیکھئے کہ فقر و استغناء کے سائے میں زندگیاں بسر کرنے کے بعد آج ایک عالم ان کی سیرت و کردار کے غیر فانی نور سے جگمگا رہا ہے۔ ان کا نام سنتے ہی تاریخ کا سر ادب و احترام سے جھک جاتا ہے۔

اور امت مسلمہ ان سے دینی نسبت ہونے کی وجہ سے فخر کرتی ہے۔ مسلمان عورتیں کتنی خوش قسمت ہیں کہ انہیں ایسی شاندار روایات اور عز و شرف کا خزانہ وراثت میں ملا ہے۔ کاش! وہ اپنے کو اس کا اہل ثابت کر سکیں اور دنیا پر یہ ثابت کرنے کے قابل ہو سکیں کہ مسلمان عورت آج بھی مشعلِ نور تھام کر اجالوں کی پیامبر بن سکتی ہے۔

حضرتِ جویریہ رضی اللہ عنہا

> میں نے کسی عورت کو جویریہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر اپنی قوم کے حق میں مبارک نہیں دیکھا۔ ان کے سبب سے بنو مصطلق کے سینکڑوں گھرانے آزاد کر دیئے گئے۔
>
> (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا)

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا اصل نام برہ تھا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدل کر جویریہ رکھ دیا۔ آپ قبیلہ خزاعہ کے خاندان مصطلق سے تھیں۔ آپ کے والد حارث بن ابی ضرار اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح اپنے قبیلے کے ایک نوجوان مسافع بن صفوان سے ہوا۔ آپ کے والد حارث اور شوہر دونوں اسلام کے مشہور دشمنوں میں سے تھے۔ ۵ھ میں حارث نے قریش کی شہ پر مسلمانوں سے جنگ کرنے کی خاطر تیاریاں شروع کر دیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپ نے تحقیقات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مقابلے کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا چنانچہ اسی سال شعبان میں اسلامی فوج مدینہ سے روانہ ہوئی اور مریسیع نامی مقام پر قیام کیا۔ حارث کو پہلے اسلامی فوج کی روانگی کا علم ہو چکا تھا اور بہت سے لوگ اس کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ یہ صورت حال دیکھ کر حارث بھی کسی جگہ روپوش ہو گیا

مگر مریسیع کے باشندوں نے مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو کر لڑنا شروع کیا لیکن وہ پہلے ہی حملے میں پسپا ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے کئی آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہو گئے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی ان جنگی قیدیوں میں شامل تھیں۔ جب تمام قیدی لونڈی اور غلام بنا کر لوگوں میں تقسیم کیے گئے تو حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ثابت بن قیس کے حصہ میں آئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت سے درخواست کی کہ وہ کچھ روپیہ لے کر اپنے حق سے دستبردار ہو جائیں۔ ثابت نے ان کے بدلہ میں نو اوقیہ سونا طلب کیا۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے پاس اتنا روپیہ نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے لوگوں سے بطور امداد روپیہ جمع کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں تو آپ نے انہیں نکاح کا پیغام دیا اور تمام روپیہ اپنی گرہ سے ادا کرنے کی پیشکش فرمائی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب جویریہ رضی اللہ عنہا کو کنیز بنا کر مدینہ میں لایا گیا۔ تو ان کا باپ حارث دربارِ نبوی میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ اس کی بیٹی کو آزاد کر دیا جائے کیونکہ وہ عرب کے ایک رئیس کی بیٹی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے کو حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی مرضی پر چھوڑ دیا اس کے بعد حارث حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معاملہ تمہاری مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ میں باپ کی حیثیت سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ دیکھو! مجھے ذلیل اور رسوا نہ کرنا مگر حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنا چاہتی ہوں۔ اور واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی چنانچہ حارث سخت مایوس ہوا اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔ ایک دوسری روایت میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے باپ حارث نے ان کی طرف سے زرِ فدیہ ادا کر کے آزاد کرایا تھا اور اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کی۔ اس کے فوراً بعد حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے قبیلے کے تمام جنگی قیدی رہا کر

دیئے گئے۔ جن لوگوں کے حصے میں یہ قیدی آئے تھے انہوں نے کہا کہ جس خاندان میں آنحضرت ﷺ نے شادی کر لی وہ غلام نہیں رہ سکتا چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے کسی عورت کو حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا سے بڑھ کر اپنی قوم کے حق میں مبارک نہیں دیکھا کیونکہ ان کی وجہ سے بنو مصطلق کے سینکڑوں لوگ آزاد کر دیئے گئے۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی دیگر امہاتِ مومنین کی طرح اپنے وقت کا بیشتر حصہ زہد و عبادت میں بسر کرتی تھیں۔ ان کا قلب مبارک ہر وقت ذکر الٰہی سے معمور رہتا اور عبادت کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ ایک روز آنحضرت ﷺ نے آپ کو صبح کے وقت اللہ کی یاد میں مصروف دیکھا۔ جب آپ ﷺ نے انہیں ایک دعا سکھا دی اور فرمایا کہ اتنی دیر عبادت کی جگہ یہ دعا پڑھ لیا کرو۔

علم و فضل میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند تھا۔ ان سے کئی احادیث مروی ہیں۔ حضرت جابر، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت مجاہد رضی اللہ عنہم جیسے القدر بزرگوں نے ان کے علم و فضل سے فیض حاصل کیا اور ان کی علمی فضیلت کا اعتراف کیا۔

آپ کو بھی آنحضرت ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ انہیں ہر وقت یہی خیال رہتا کہ نبی اکرم ﷺ کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کا کوئی موقع ضائع نہ ہو جائے۔ باری کے روز جب آنحضرت ﷺ ان کے مکان پر تشریف لاتے تو وہ بڑی محنت سے اچھے اچھے کھانے پکا کر پیش کرتی تھیں اور انہیں ہر ممکن آرام پہنچانے کی فکر میں رہتی تھیں۔ ۵۰ھ میں وفات پائی جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ وفات کے وقت آپ کی عمر پینسٹھ برس کے قریب تھی۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی زندگی کا یہ پہلو کس قدر عجیب ہے کہ قبول اسلام سے قبل وہ مسلمانوں کی سخت دشمن تھیں۔ ان کے چاروں طرف کفر و شرک کا اندھیرا چھایا

ہوا تھا اور ان کے خاندان کے تمام لوگ اسلام کو ملیا میٹ کرنے کے لیے شمشیر بکف رہتے تھے۔ مگر جب اسیری کی حالت میں انہیں مسلمانوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب نصیب ہوا تو ان کی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ان کا دل نورِ ایمان سے جگمگا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے کفر و ضلالت کا پردہ اٹھ گیا۔ اس کے بعد ان کے باپ نے خاندانی عزت و آبرو اور اپنی ناموس کا واسطہ دے کر انہیں اسی ظلمت کدے میں واپس لے جانا چاہا تو بادۂ توحید سے سرشار بیٹی نے صاف انکار کر دیا انہوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں رہ کر دنیاوی عیش و آرام اور رئیسانہ زندگی کے ٹھاٹھ باٹھ سے محروم ہو جائیں گی بلکہ انہوں نے راہ ہدایت پر رہتے ہوئے فقر فاقہ کی بے سرو سامان زندگی کو ترجیح دی۔ یہ اللہ کے نیک بندوں اور ایمان والوں کی چند روزہ صحبت اور ہم نشینی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے عورت ہوتے ہوئے بھی عیش و طرب کی پر آسائش زندگی کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا اور اس کے بعد زہد و عبادت کو اپنا اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ بے شک سیدھے راستے پر چلنے والے نیک لوگوں کی صحبت انمول دولت ہے۔ اس لیے دوستی اور ہم نشینی کے لیے ہمیشہ ایسے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیے جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر چلتے ہیں اور نیکوکار ہوں۔

حضرت امّ حبیبہ رضی اللہ عنہا

صبر واستقلال اور ایمان واستقامت کا پیکر تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، سنت کا اتباع اور نیک مزاجی ان کا خاص وصف تھا۔

آپ کا نام رملہ کنیت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا مشہور تھی۔ مکہ کے مشہور سردار ابوسفیان بن صخر کی بیٹی تھیں اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن تھیں۔ والدہ کا نام صفیہ بنت ابوالعاص تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب قصی بن کلاب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مل جاتا ہے اس لحاظ سے ماں اور باپ دونوں طرف سے انتہائی معزز اور نجیب تھیں۔ قدرت نے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو حسن سیرت اور نیک فطرت کے ساتھ حسنِ صورت کی دولت بھی بڑی فیاضی سے عطا کی تھی چنانچہ آپ کا باپ ابوسفیان کہا کرتا تھا کہ میرے ہاں عرب کی حسین تر اور جمیل تر عورت موجود ہے۔ آپ کی پہلی شادی قبیلہ بنو اسد کے ایک بہادر نوجوان عبداللہ بن جحش سے ہوئی اگرچہ ان کا باپ کفار مکہ کا سردار تھا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ اس نے اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تکالیف دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی مگر نیرنگیٔ دوراں دیکھیے کہ اسی دشمن اسلام کی وہ فرشتہ خصلت بیٹی جس کے حسن و جمال پر وہ فخر کیا

کرتا تھا اپنے خاوند کے ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہوگئی۔ حالانکہ یہ وہ پر آشوب دور تھا
جب مکہ کے درو دیوار مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہورہے تھے اور کفار نے کمزور
اور نہتے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اس وقت دعوتِ حق پر لبیک کہنا دنیا
بھر کی تکالیف اور مصائب سے ہم آغوش ہونا تھا مگر اللہ نے سردار مکہ ابوسفیان کے گھر
میں شمع ایمان وصداقت روشن کر کے دنیا پر واضح کر دیا کہ حق کی قدسی آواز دلوں کی اس
طرح مسخر کرتی ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اسلام لانے سے پہلے ابوسفیان کی لختِ جگر ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اس کی عزت وناموس
کا نشان تھیں وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنی بیٹی کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اور جب حضرت ام
حبیبہ رضی اللہ عنہا شہزادیوں کی سی زندگی بسر کرتی تھیں۔ گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ دنیا
کی ہر نعمت میسر تھی۔ عیش وآرام کے تمام سامان موجود تھے۔ ہر قسم کی آسائشیں فراہم
تھیں۔ لوگ ابوسفیان کی بیٹی سمجھ کر سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ رشتہ دار، احباب اور
قبیلے کی عورتیں ان کی ہم نشینی پر فخر کرتی تھیں۔ دنیوی جاہ وجلال اور آرام وآسائش کے
کون سے لوازمات تھے جو اس بلند مرتبہ نجیب الطرفین خاتون کو نصیب نہ تھے اس کے
برعکس غریب اور فاقہ کش مسلمانوں کے لیے آزادی سے سانس لینا دشوار ہورہا تھا۔
جب حضرتِ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اپنے شوہر کے ساتھ حق پرستوں کی اس جماعت میں شامل
ہوئی تو ان سے بھی زندگی کا سکھ اور چین تک چھین لیا گیا۔ کیونکہ ان کے باپ ابو
سفیان کے لیے یہ انتہائی ندامت اور شرم کی بات تھی۔ کہ اس کی چہیتی بیٹی اور داماد اس
کے سامنے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ چنانچہ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد انہیں دوسروں
سے زیادہ تکلیف کا شکار ہونا پڑا باپ اور دوسرے قریبی رشتہ دار خون کے پیاسے
ہورہے تھے۔ خدمت گاروں اور ادب و تعظیم سے سر جھکانے والوں نے ڈر اور خوف
کے باعث منہ موڑ لیے۔ آرام وراحت کا دور ایک بھولا بسورا خواب بن گیا۔ چاروں

طرف سے فاقہ وافلاس، بے چارگی، کس مپرسی اور رنج ومصیبت نے گھیر لیا۔ مگر ہمت واستقلال کی اس پیکر اور ایمان واستقامت کی پتلی نے انتہائی خندہ پیشانی سے ہر ظلم برداشت کیا۔ تمام تکالیف سہیں اور بڑی بہادری کے ساتھ ان ناقابل برداشت حالات کا مقابلہ کیا۔ جب ظلم وستم کی انتہا ہوگئی اور ان کا اپنا مولد ومسکن ان کے لیے اذیت ناک جہنم بن گیا تو اللہ کی طرف سے حبشہ کی جانب ہجرت کا حکم نازل ہوا چنانچہ دوسرے مسلمان مہاجرین کے ساتھ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر بھی حبشہ روانہ ہوگئے۔ جہاں کے بادشاہ نجاشی نے انہیں پناہ دی۔ شاید ابھی رنج ومصیبت اور آزمائش کا دور ختم نہ ہوا تھا کہ حبشہ میں کچھ عرصہ بعد ان کے خاوند نے عیسائی مذہب قبول کر لیا اور آزاد زندگی بسر کرنا شروع کر دی۔ وہ کثرت سے شراب پینے لگے اور آخر ان کا انتقال ہوگیا۔ مگر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے غریب الوطنی کے باوجود مرتد ہونے سے انکار کر دیا اور سختی کیساتھ راہِ ہدایت پر گامزن رہیں۔ وطن سے دور، عزہ واحباب اور اہل وطن سے بچھڑ کر پرائے دیس میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے لیے اس سے بڑا صدمہ اور کیا ہوسکتا تھا مگر ان کے پائے استقلال کو جنبش تک نہ ہوئی اور وہ خدا کے فضل وکرم سے اس کڑی آزمائش میں بھی کانٹے کے تول پر پوری اتریں۔ یہ وہی رملہ یعنی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا تھیں جنہوں نے نازونعم کے گہوارے میں پرورش پائی تھی اور لاڈ پیار کے جھولے میں بچپن گزارا تھا۔ انہوں نے صبر واستقلال کے ساتھ ان تمام مصائب کو برداشت کیا۔ اور کبھی اف تک نہ کی۔ آخر اس بلند کرداری اور صبر کے انعام کا دن بھی آپہنچا۔ شوہر کی وفات کے بعد ایک روز آپ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی انہیں بلا رہا ہے۔ آپ نے اس خواب کی تعبیر یہ نکالی کہ آپ کو اُمّ المومنین بننے کا شرف حاصل ہوگا۔ ان کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ عدت کے ایام ختم ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن امیہ ضمری کو نکاح کا پیغام دے کر نجاشی کے پاس بھیجا۔ نجاشی نے اپنی لونڈی

ابرہہ کی وساطت سے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو مژدہ سنایا تو انہیں اس درجہ مسرت ہوئی کہ اس لونڈی کو انعام کے طور پر اپنا تمام زیور دے دیا۔ شام کو نجاشی نے وہاں کے مسلمانوں اور حضرت جعفر بن ابی طالب کو جمع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے آگاہ کرنے کے بعد نکاح پڑھایا۔ حضرت خالد بن سعید اموی وکیل مقرر ہوئے اس وقت حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی عمر چھتیس برس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ نکاح کے چند روز بعد آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئیں۔ حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو ممتاز درجہ حاصل تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی بہت قدر کرتے تھے۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں تہتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکان میں دفن ہوئیں۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا صداقت پر جان فدا کرنے والی تھیں۔ اور صبر و توکل کا نمونہ تھیں۔ وہ بہت بہادر، نیک اور مستقل مزاج تھیں۔ انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ ایک مرتبہ ان کے باپ ابوسفیان کفر کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر بھی گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنا چاہا۔ مر حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فوراً بچھونا الٹ دیا۔ ابوسفیان کو یہ دیکھ کر سخت طیش آیا اور بولے کہ بستر اتنا عزیز ہے کہ اس پر حقیقی باپ کا بیٹھنا بھی پسند نہیں فرمایا۔ یہ بات نہیں۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور آپ مشرک ہیں اس لیے ناپاک ہیں۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سنتِ رسول کی اس قدر پابند تھیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور طریقوں کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو خوشبو لگا کر چہرے پر ملی اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ تین

دن سے زیادہ کسی کا غم نہ کیا جائے۔ ایک مرتبہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جو شخص روزانہ بارہ رکعت نفل پڑھے گا۔ اس کے لیے جنت میں گھر بنایا جائے گا۔ چنانچہ آپ نے عمر بھر اس حکم پر عمل کیا اور ان کے بھائی عتبہ، ان کے بعد عمرو بن اویس اور نعمان بن سالم ہمیشہ یہ نوافل پڑھتے رہے۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی پاکیزہ زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اس چندروزہ زندگی کے عیش و آرام، راحت و انبساط، مال و دولت، عزت و اقتدار اور شوکت و حشمت پر خدا رسول کی محبت، ایمان وراستی اور تقویٰ و طہارت کو قربان کر دینا کسی سچی مسلمان عورت کا شیوہ نہیں ہو سکتا بلکہ خدا پرست عورت تو دنیا کو اس کی تمام دلفریبیوں اور رعنائیوں سمیت ایمان پر قربان کر دینے کی عادی ہوتی ہے۔ آج ہم معمولی آرام و آسائش اور دولت کی خاطر ایمان و ضمیر تک کو بیچ دیتے ہیں اور اپنی بچیوں کو سکوں کی جھنکار پر قربان کر دیتے ہیں اور ہماری عورتیں ذرا سی تکلیف پہنچنے پر طوفان برپا کر دیتی ہیں۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی پاک زندگی ان عورتوں کے لیے نشانِ منزل ہے جو دولت اور آسودگی کو زندگی کا نصب العین سمجھ کر اسی معیار پر کھوٹے کھرے کو پہچاننے کی عادی ہوتی ہیں جن کے لیے اونچے مناصب، رنگا رنگ کے ملبوسات کی بہتات، زیورات اور دولت کی فراوانی اور دنیوی شان و شوکت کا حصول ہی سب کچھ ہے، شرافت، لیاقت، اور دینداری ان کی دہلیزوں پر دم توڑ دیتی ہے۔ ایمان و ضمیر کی آواز ان کے گھروں میں صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ جو خاندانی مصلحتوں، جھوٹے وقار اور جھوٹی عزت کے نام پر اپنی زندگیوں کو مالِ تجارت بنا دیتی ہیں۔ جن کے نہاں خانہ دل میں عیش و طرب میں زندگی بسر کرنے کی تمنائیں ہمیشہ بے تاب رہتی ہیں۔ اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے تمام حدود و قیود کو توڑ دیتی ہیں۔

ایک لمحہ کے لیے حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی آب کوثر سے زیادہ پاک اور مختصر سی زندگی

پر غور کیجئے وہ ایک بلند مرتبہ اور باوقار سردار کی لختِ جگر تھیں۔ انہوں نے شان و شوکت اور آرام و راحت سے بھرپور ماحول میں پرورش پائی۔ دنیا بھر کی نعمتیں انہیں میسر تھیں۔ امیر و کبیر باپ کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی وہاں سب کچھ موجود تھا مگر ایمان نہ تھا۔

حسن و جمال میں اپنی مثال آپ تھیں۔ اوصاف حسنہ اور اخلاق حمیدہ کا جوہر بدرجہ اتم موجود تھا۔ لیاقت اور اہلیت سے سرفراز تھیں۔ شرافت اور نجابت ضرب المثل تھی۔ خاندانی بلندی اور وقار مسلمہ تھا۔ لوگ اس گھرانے سے نسبت پیدا کرنا فخر سمجھتے تھے۔ اور ابوسفیان کی بیٹی جدھر سے گزرتی تھی لوگ عزت و احترام سے راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے۔ خود بہادر اور شجاع تھیں۔

آخر وہ کون سی مجبوری تھی کہ انہوں نے اپنے اس چمن زار عشرت میں شادی کے بعد ایک لمحہ ٹھہرنا پسند نہ کیا۔ بلکہ تمام خاندانی اور نسلی زنجیروں کو ایک ہی جھٹکے سے توڑ ڈالا؟

وہ کون سی مصیبت تھی جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ آرام و آسائش اور دولت و ثروت کو ٹھکرا کر بوریا نشین فاقہ مستوں کی مقدس صف میں جا کھڑی ہوئیں؟

جان بوجھ کر طرح طرح کے مصائب و آلام کو دعوت دی اور خطرات کو گلے لگا لیا۔ ماں باپ کو چھوڑا۔ اعزہ و اقارت سے منہ موڑا۔ وہ پیارا شہر جس کے گلی کوچوں میں بچپن گزرا تھا، جہاں ہر زرہ انہیں جھک سلام کہتا تھا۔ ان کے لیے ایک اجنبی دیس بن گیا۔ پھر غریب الوطنی کا عذاب برداشت کیا۔ رؤسا کی مجالس چھوڑ کر اس قدسی محفل میں جا بیٹھیں جہاں غلام اور کنیزیں ان کے ساتھ ایک ہی صف میں بیٹھے تھے۔ فقر و فاقہ اور احتیاج کی تکالیف برداشت کیں۔

یہی نہیں اسلام قبول کر کے اپنے نامور باپ کے سامنے سینہ سپر ہو گئیں۔

پردیس میں جب خاوند نے ساتھ چھوڑ دیا تو صرف اللہ کے بھروسے پر ایمان کا

دامن اتنی مضبوطی سے تھامے رکھا کہ صبر و استقلال کی ایک روشن مثال سے تاریخ کے صفحات جگمگا اٹھے۔

آخر انہوں نے کس مقصد کے لیے یہ سب کچھ قربان کر دیا اور اپنی زندگی کو خار دار راستہ بنا لیا صرف ایمان اور ہدایت کی تڑپ تھی۔ سچائی اور صداقت کی طلب تھی، حقیقت کی جستجو تھی۔ اور رضائے الہٰی کی تلاش تھی جسے حاصل کرنے کے لیے انہوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، نہیں بلکہ فریب کے بدلے حقیقت، ظلمت کے بدلے نور، اور کچھ نہیں کے عوض سب کچھ حاصل کر لیا۔ ورنہ دنیا میں کروڑوں عورتیں پیدا ہوئیں اور مر گئیں مگر آج کوئی ان کا نام لیوا بھی باقی نہیں، ان کی پھولوں بھری رنگین دنیا ان کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔ ان کے پاس سب کچھ تھا کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اس کے برعکس ایک طرف وہ بلند مقام اور پاک خواتین بھی ہیں جو شراب زیست کے نشے میں مدہوش نہ ہوئیں۔ انہوں نے دنیوی لالچ اور حرص و طمع کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی بلکہ اپنی پاکیزہ زندگیاں اعلیٰ و ارفع مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف کر دیں۔ تو وقت کے انصاف پسند ہاتھ نے آگے بڑھ کر انہیں حیاتِ دوام کا تاج پہنایا۔

انہوں نے دولت اور دنیا سے محبت نہیں کہ بلکہ خود کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت واطاعت میں فنا کر دیا۔ وہ آج بھی زندہ ہیں اور قیامت تک دنیا کے ان گنت انسان ان کے پاک اور مقدس ناموں پر عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کرتے رہیں گے۔ دولت اور دنیا کا عیش و آرام وقت کے ساتھ فنا ہو گیا۔ مگر ان مبارک ہستیوں کی روشن کی ہوئی شمع ایمان اور قندیل تسلیم و رضا آج بھی اسی طرح روشن ہے اور ہمیشہ اسی تابانی سے روشن رہے گی۔

بدقسمت ہیں وہ لوگ جو ان ہستیوں کے سدا بہار چمنستان کی نکہت سے محروم رہتے ہیں اور ہمیشہ فنا کا سودا کرتے ہیں۔

حضرتِ میمونہ رضی اللہ عنہا

میمونہ رضی اللہ عنہا خدا سے بہت ڈرتی اور صلہ رحمی کرتی تھیں۔

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا)

آپ قبیلہ قریش سے تھیں۔ والد کا نام حارث بن حزن تھا۔ والدہ ہند بنت عوف قبیلہ حمیر سے تھیں۔ پہلا نکاح مسعود بن عمرو سے ہوا لیکن بعد میں کسی وجہ سے علیحدگی ہوگئی اس کے بعد عوام بن عبدالعزیٰ کے نکاح میں آئیں جو کچھ عرصہ بعد فوت ہو گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۷ھ میں مکہ روانہ ہوئے تو راستے میں احرام کی حالت میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ جب مدینہ واپس ہوئے تو مکہ سے دس میل دور سرف کے مقام پر رسم عروسی ادا ہوئی۔ آپ نے ۵۱ھ میں سرف میں ہی انتقال فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں، جنازہ کو زیادہ حرکت نہ دو۔ ادب واحترام کے ساتھ آہستہ آہستہ لے چلو۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی زندگی سادگی، تقویٰ اور قناعت سے عبارت تھی۔ ان سے چالیس سے زیادہ احادیث مروی ہیں اور کئی بلند پایہ بزرگوں نے ان سے روایت کی ہے۔ وہ انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ عبادت کیا کرتی تھیں اور بے حد رحم دل

تھیں۔ ہر لحظہ خدا سے ڈرتے رہنا ان کا خاص وصف تھا چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میمونہ رضی اللہ عنہا خدا سے بہت ڈرتی تھیں۔ اور صلہ رحمی کرتی تھیں۔ انہیں ہر قدم پر احکام ربانی اور ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اگر کسی کو خلاف سنت کام کرتے پایا تو ٹوک دیا اور پھر بڑے پر شفقت لہجہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ سمجھا دیتی تھیں۔ فقہ سے متعلق انہیں کافی معلومات حاصل تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اکثر اہل علم بزرگ ان سے بھی فیض حاصل کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک عورت بیمار ہوگئی تو اس نے منت مانی کہ شفا پانے کے بعد وہ بیت المقدس میں جا کر نماز ادا کرے گی۔ اتفاق سے وہ جلد ہی شفایاب ہوگئی اور اس نے بیت المقدس جانے کے لیے تیاری مکمل کر لی۔ جب وہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کے لیے آئی تو آپ نے فرمایا کہ تم یہیں رہو اور مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز ادا کر لو۔ کیونکہ یہاں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں کے ثواب سے ہزار گنا زیادہ ہے۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا میں انسان دوستی اور رحم و اکرام کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کو غلام اور کنیزیں آزاد کرنے کا بے حد شوق تھا۔ ایک دفعہ آپ نے لونڈی کو آزاد کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعائے خیر فرمائی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اکثر قرض لیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے بہت زیادہ رقم قرض لے لی تو کسی نے پوچھا کہ اسے ادا کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ آپ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص ادا کرنے کی نیت رکھتا ہے خدا خود اس کا قرض ادا کر دیتا ہے۔

شفقت، مروت، رحم دلی، سادگی اور خدا خوفی کے یہ زریں اوصاف تھے جو اسلام کی بے مثل تعلیم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے ان بزرگ خواتین میں پیدا کر دیے تھے یہی وہ اوصاف تھے جو آخر میں پوری انسانی زندگی پر ابرِ رحمت بن کر چھا گئے اور

اسلام دنیا کی ناقابلِ تسخیر طاقت بن گیا۔ اگر آج ہماری خواتین اپنی زندگیوں کو ایسے ہی سانچوں میں ڈھال لیں تو مسلمان ایک بار پھر تاریخ کو دہرانے کی ہمت پیدا کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج ہم سب کو ایک دوسرے کی مخلصانہ شفقت اور محبت کی ضرورت ہے وہی مروت، فیاضی اور غم گساری ہماری پیاس بجھا سکتی ہے جس کا سرچشمہ خوفِ خدا رکھنے والے دل میں ہو۔ ایک مسلمان عورت کی سیرت کا یہی نمایاں پہلو ہوتا ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

حضرتِ صفیہ رضی اللہ عنہا

> ''صفیہ رضی اللہ عنہا عاقلہ، فاضلہ اور حلیم الطبع تھیں۔'' (زرقانی)
>
> ''وہ نہایت عاقلہ تھیں۔'' (اسد الغابہ)

آپ کا اصل نام زینب تھا لیکن بعد میں اس وجہ سے صفیہ رضی اللہ عنہا کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ کہ آپ جنگِ خیبر میں خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں آئی تھیں۔ اور عرب میں مالِ غنیمت کے اس حصے کو جو سردارِ قوم یا امیر ریاست کے لیے علیحدہ کیا جاتا تھا صفیہ کہتے تھے۔ آپ بھی اسی نسبت سے صفیہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا عرب کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ کے والد کا نام حی بن اخطب تھا۔ وہ قبیلہ بنو نضیر کا سردار تھا کیونکہ اسے حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے سمجھا جاتا تھا۔ آپ کی والدہ ضرد بنی قریظہ کے رئیس سموئل کی بیٹی تھی۔ یہ دونوں قبیلے بنو اسرائیل میں بہت ممتاز خیال کیے جاتے تھے۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی پہلی شادی سلام بن مشکم سے ہوئی مگر اس نے طلاق دے دی۔ دوسرا نکاح کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا۔ جنگ خیبر میں حضرتِ صفیہ رضی اللہ عنہا کے شوہر، باپ اور بھائی قتل ہو گئے اور انہیں بھی گرفتار کر لیا گیا جب تمام قیدی جمع کیے گئے تو

آنحضرت ﷺ نے ایک صحابی کے کہنے پر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے خود نکاح کر لیا۔ اور صہبا کے مقام پر رسم عروسی ادا ہوئی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ۵۰ھ میں وفات پائی اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئیں ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ ترکہ چھوڑا اور ایک تہائی رقم اپنے ایک یہودی بھانجے کے لیے وصیت کر گئیں۔

اکثر کتب سیرت میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے فہم وفراست اور دانشمندی کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ ان سے بھی کئی احادیث مروی ہیں۔ اور وہ بھی اپنے زمانے میں علم وحکمت کا سرچشمہ خیال کی جاتی تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ بے حد عقلمند، فاضلہ اور رحمدل تھیں۔ نرم دلی اور حلم ان کا خاص وصف تھا۔ ان کے مکان پر ہر وقت مسائل معلوم کرنے والی عورتوں کا جھمگٹا رہتا تھا۔ اور وہ سب کو تسلی بخش طریقے سے مسائل دین سمجھاتی تھیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ جنگِ خیبر میں جب وہ اپنی بہن کے ساتھ گرفتار کر کے لائی جا رہی تھیں تو ان کی بہن یہودی مقتولوں کو دیکھ کر چیخ رہی تھیں۔ لیکن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جب اپنے خاوند کی نعش کے قریب سے گزریں تو کسی نے انہیں آہ و بکا کرتے یا روتے پیٹتے نہیں دیکھا بلکہ وہ بڑے صبر وتحمل اور متانت سے گزر گئیں۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی ایک کنیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کیا کرتی تھیں کہ وہ اب بھی یوم السبت کو اچھا سمجھتی ہیں اور یہودیوں کی مدد کرتی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت کرایا تو جواب دیا کہ یوم السبت کو جمعہ کے مقابلے میں اچھا سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں البتہ میں یہودیوں کے ساتھ مروت سے ضرور پیش آتی ہوں کیونکہ وہ میرے رشتہ دار اور بھائی بند ہیں۔ اس کے بعد آپ نے لونڈی کو آزاد کر دیا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو بھی دیگر ازواج کی طرح آنحضرت ﷺ سے بے پناہ

محبت تھی۔ جب آپ بیمار ہوئے تو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش! آپ کی بیماری مجھے ہو جاتی۔ دوسری ازواج مطہرات نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سچ کہتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے اور ہر ممکن دلجوئی فرماتے تھے۔ ایک بار دورانِ سفر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا اونٹ بیمار ہو گیا تو آپ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے انہیں اونٹ دینے کو کہا لیکن انہوں نے کہا میں اس یہودیہ کو اپنا اونٹ کیوں دوں۔ یہ جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا ناگوار گزرا کہ دو ماہ تک ان کے پاس نہیں گئے۔ جب انہیں حرمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی یہودیہ ہونے کا طعنہ دیتا تھا تو وہ رو پڑتی تھیں۔ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ زار و قطار رو رہی ہیں پوچھنے پر بتایا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور حفصہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ہم تمام ازواج میں ہیں کیونکہ وہ آپ سے دوسری نسبت بھی رکھتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے جواب کیوں نہ دیا کہ ہارون علیہ السلام میرے باپ، موسیٰ علیہ السلام میرے چچا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم میرے شوہر ہیں اس لیے تم افضل کس طرح ہو سکتی ہو۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے متعلق مشہور ہے کہ بہت سخی اور سیر چشم تھیں۔ ہر ایک کے ساتھ صلہ رحمی سے پیش آنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ وہ بے حد ہمدرد، غمگسار اور شفیق تھیں۔ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر بے تاب ہو جاتی تھیں اور اپنی طرف سے ہر ممکن مدد دینے سے گریز نہ کرتی تھیں۔ تحمل، بردباری اور سیر چشمی ان کے خاص اوصاف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودی النسل ہونے کے باوجود وہ بڑی فیاض اور دریا دل تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک صحبت نے ان کی شخصیت کو ایسی جلا بخش دی تھی کہ قدیم مورخین کے الفاظ میں آج بھی ان کی زندگی کی مقدس جھلک دکھائی دیتی ہے تو ہر مسلمان کا دل ادب و احترام سے جھک جاتا ہے۔ یہ ان کی سیرت کی دلکشی اور اخلاق

کی بلندی تھی کہ آنحضرت ﷺ فرطِ محبت سے خود ان کے آنسو پونچھ دیا کرتے تھے۔ اور انہیں یہ بھی شرف حاصل تھا کہ حضور خود ان کی دلجوئی میں مصروف رہتے تھے اور ان کے متعلق کوئی سخت بات سننا پسند نہیں فرماتے تھے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کے قد سے متعلق کوئی طنزیہ جملہ کہا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم نے یہ ایسی بات منہ سے نکالی ہے کہ اگر سمندر میں چھوڑ دی جائے تو اس میں مل جائے۔ نبی ﷺ ان کی دانش مندی، صبر وتحمل اور ایثار کیشی کی وجہ سے ان کی بہت قدر کرتے تھے۔

خدا کرے کہ ہماری بہنیں اور بیٹیاں آفتابِ نبوت کی ان مقدس کرنوں سے اپنے قلوب اور اذہان کو منور کرنے کے قابل ہو سکیں۔ بات بات پر خفا ہو جانے اور لڑنے جھگڑنے والی مسلمان خواتین کو حضرت صفیہ کے تحمل اور بردباری سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اور سیکھنا چاہیے کہ بڑی سے بڑی مصیبت کے وقت بھی متانت، سنجیدگی اور صبر وتحمل کو کیسے برقرار رکھا جا سکتا ہے کیونکہ جو شخص اپنے جذبات پر قابو پانے کی طاقت پیدا کر لیتا ہے وہ دنیا میں کسی سے شکست نہیں کھا سکتا۔ فتح وکامرانی زندگی میں ہر مقام پر اس کے قدم چومتی ہے۔

بناتُ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہم

حضرت زینب رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں۔ بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے دس سال قبل پیدا ہوئیں۔ اپنے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع بقیط سے نکاح ہوا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے شوہر کے پاس مکہ میں رہ گئیں۔

جنگِ بدر میں ابوالعاص کفار کی فوج میں شامل تھے۔ شکست کے بعد گرفتار ہو کر دربارِ رسالت میں پیش ہوئے۔ آپ نے ابوالعاص کو اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ مکہ واپس جا کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بھیج دیں۔ چنانچہ انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ نہایت شریفانہ برتاؤ کیا اور کفار کی مزاحمت کے باوجود حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ روانہ کر دیا۔ ۶ھ میں ابوالعاص دوبارہ گرفتار ہو کر مدینہ آئے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے انہیں پناہ دی اور ان کی سفارش پر ابوالعاص کو ان کا مال بھی واپس کر دیا گیا۔ ابوالعاص حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حسنِ سلوک، مروت اور نیک دلی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً مکہ آ کر لوگوں کی امانتیں واپس کیں اور صدق دل سے اسلام قبول کر لیا بعض روایات میں ہے کہ ابوالعاص سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا دوبارہ نکاح ہوا۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہا بہت تھوڑا عرصہ زندہ رہیں۔ ۸ھ میں انتقال فرمایا۔

حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا، حضرت سودہ رضی اللہ عنہا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے انہیں غسل دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی اور قبر میں اتر کر اپنی لختِ جگر کو سپردِ خاک کیا۔

بعض مشہور روایات کے مطابق حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بیٹی تھیں۔ نبوت سے قبل ابولہب کے بیٹے عتبہ سے شادی ہوئی۔ تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے بیٹے عتیبہ سے ہوئی تھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان فرمایا اور کفار مکہ نے شدید مخالفت شروع کر دی تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں سے علیحدگی اختیار نہیں کرو گے تو تمہارے ساتھ میرا اٹھنا بیٹھنا حرام ہے چنانچہ دونوں نے باپ کے کہنے پر اپنی بیویوں کو طلاق دے دی۔ اسکے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے کر دی۔ جب مکہ میں کفار نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا تو حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ دو مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ ۲ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنگِ بدر کی تیاری میں مصروف تھے تو حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بیمار پڑ گئیں میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوتے وقت آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو تیمارداری کے لیے چھوڑ گئے۔ عین اس روز جب قاصد مدینہ میں فتح کی خوشخبری لے کر پہنچا حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا انتقال کر گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔ واپسی پر یہ خبر سنی تو بہت رنجیدہ حالت میں قبر پر تشریف لائے۔ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ وہ قبر کے پاس بیٹھ کر روتی جاتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کپڑے سے ان کے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔ آپ نہایت جمیل اور اوصافِ حمیدہ سے متصف تھیں۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری بیٹی حضرت ام

کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دے دیا۔ اسی شرف کی بنا پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ذوالنورین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بھی بہت خوبصورت اور نیک سیرت تھیں ایک روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھیں تھیں کہ آنحضرت رضی اللہ عنہا نے دیکھ کر فرمایا ایسا خوبصورت جوڑا کبھی نہیں دیکھا۔ شعبان ۹ ھ میں وفات پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، فضل بن عباس رضی اللہ عنہ اور اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ نے قبر میں اتارا۔

حضرت سیدۂ عالم حضرتِ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

"اِنَّ فَاطِمَۃَ سَیِّدَۃُ نِسَآءِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔" (طبرانی)

"بے شک فاطمہ رضی اللہ عنہا تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔"

"تم لوگوں کی تمام عورتوں میں تقلید کے لیے چار عورتیں کافی ہیں۔ مریم بنت عمران، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد اور آسیہ زوجہ فرعون رضی اللہ عنہم۔" (ترمذی شریف)

"یاد رہے فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے جو اسے تکلیف دیگا تو گویا اس نے مجھے تکلیف دی۔" (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم)

سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ مورخین نے سنِ ولادت میں اختلاف کیا ہے۔ تاہم عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ سیدہ عالم بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تقریباً ایک سال قبل پیدا ہوئیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو امہات المومنین میں جو فضیلت اور مقام حاصل ہے وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔ سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا عالی مقام ہستی ہیں کہ ان کے شرف و تقدس پر کائناتِ ہستی جتنا فخر

کرے کم ہے جنہیں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے حاصل کونین باپ کی محبت و شفقت اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ایسی فضیلت مآب والدہ کا آغوشِ تربیت نصیب ہوا ان کی خوبیوں اور اوصاف کا کیا شمار ہو سکتا ہے۔ سیدۃ النساء کے معصوم بچپن کے سامنے کوثر وزمزم کی پاکیزگی اور طہارت آب آب تھی۔ آفتابِ رسالت کی ضیاء باری نے آپ کی پاک واطہر زندگی کو بقعہ نور بنا رکھا تھا۔ اور قلبِ مبارک، انوار الٰہی کا مرکز و مخزن تھا۔ ان کے ہر انداز سے پیغمبرانہ عظمت ٹپکتی سرکار دو عالم حضرت احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کا مقدس پرَتو تھیں۔ وہی لب ولہجہ، وہی نشست و برخاست کا انداز اور وہی چال ڈھال جس سے رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کوسوں دور سے پہچانے جاتے تھے۔ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی بہت بڑی خصوصیت تھی۔ ایسی مبارک ہستی کو کھیل کود، لہو ولعب اور فضول باتوں سے کیا سروکار ہو سکتا تھا۔ جب نے بچپن سے توحید باری کے روح پرور نغمات اور حق وصداقت کی طلسم شکن آواز کے سوا اور کچھ نہ سنا ہو جس کی مبارک آنکھوں نے اعلائے کلمۃ الحق کے مناظر کے علاوہ اور کچھ نہ دیکھا ہو۔ جس کے شعور نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی ہوں جہاں چاروں طرف قرآن کی صدا گونج رہی تھی۔ فرشتوں کی حمد وتحمید کی آوازیں سنائی دیتی تھیں اور اللہ کی راہ میں مر مٹنے کے والہانہ جذبات نے ان قدسی نفوس کی زندگیوں کو فقر واستغناء اور ایثار وقربانی اور زہد وعبادت کے مجسموں میں ڈھال دیا تھا۔ اس کا بچپن اور اس کی جوانی کن صفات ومحامد کا لازوال خزانہ ہو گی۔ اس کا ثبوت اس حقیقت سے مل سکتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کی پاک زندگی کے خدوخال چاند سورج بن کر دنیائے کردار کے اندھیرے میں نور پھیلا رہے ہیں۔

جب حضرت فاطمہ الزاہراء رضی اللہ عنہا کی عمر پندرہ سال ساڑھے پانچ مہینے کے لگ بھگ ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ان کی شادی

کردی۔ بعض روایات میں ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت سے اس مقصد کے لیے درخواست کی مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو خدا کا حکم ہوگا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی درخواست دہرائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ جو خدا کا حکم ہوگا۔ اس کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے شادی کے لیے درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی مرضی معلوم فرمائی۔ وہ خاموش رہیں اور اس طرح رضامندی کا اظہار کردیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ مہر میں دینے کے لیے ان کے پاس کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کچھ نہیں۔ آپ نے پوچھا وہ زرہ کیا ہوئی جو انہیں جنگِ بدر میں ہاتھ آئی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ تو ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس وہ زرہ ہی کافی ہے چنانچہ یہ زرہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار سو اسی درہم میں خرید لی۔ اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کل اثاثہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک پرانی یمنی چادر تھی۔ اللہ اللہ! شہنشاہ کونین، سرورِ عالم اور فخرِ موجودات کی سب سے پیاری اور عزیز ترین لختِ جگر کی شادی ہو رہی تھی۔ یہ وہ دربار تھا جس کی دربانی دنیا کے شہنشاہوں کے مقدر میں نہ تھی۔ جہاں قیصر وکسریٰ کی قسمتوں کے فیصلے ہوتے تھے۔ جہاں سے پوری دنیا کی عظمت وشوکت کو للکارا جاتا تھا اور جہاں کا ایک اشارہ دنیا کی بساط الٹ دینے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ یہ وہ گھرانا تھا جس کی رفعتیں عرشِ اعظم کو چومتی تھیں اور فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اس گھرانے کی وہ بیٹی تھیں جن پر خود اللہ سلام بھیجتا تھا۔ اس گھر سے کبھی کوئی حاجت مند خالی ہاتھ جاتا ہوا نہ دیکھا گیا اور کبھی کوئی دل شکستہ مایوس حالت میں واپس نہیں ہوا تھا۔ دنیا کے اس عظیم ترین اور مقدس ترین گھر کی سب سے محبوب بیٹی جس ساز وسامان کے ساتھ رخصت ہوئی وہ بھی سن لیجئے۔ اقلیم دین ودنیا کے شہنشاہِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سب سے پیاری لاڈلی نورِ نظر کو بان کی ایک چارپائی، چمڑے کا ایک گدا جس میں روئی کی جگہ

کھجور کے پتے بھرے تھے۔ ایک چھاگل، دو ایک گھڑے، ایک مشک اور دو چکیاں عنایت فرما کر رخصت کیا اور دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان کس طرح جیتے ہیں۔ اس وقت تک حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی رہتے تھے شادی کے بعد سیدۃ النساء نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ انہیں حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہما سے کوئی گھر دلوا دیں کیونکہ ان کے پاس کئی مکانات تھے اور پہلے بھی چند مکانات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کر چکے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اب ان سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو فوراً بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو کر کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ خدا کی قسم میرا جو مکان آپ قبول فرما لیتے ہیں مجھے اس سے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے اپنا ایک مکان خالی کر دیا جب سیدہ عالم اپنے گھر میں تشریف لے گئیں تو رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لائے اور ایک برتن میں پانی منگوا کر اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈالے۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پر یہ پانی چھڑک کر فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں بہتر شخص سے تمہارا نکاح کیا ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی پوری زندگی صبر و توکل کی تصویر بن کر شیر خدا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بسر کی۔ جب آپ کی عمر ۲۹ برس کی تھی تو سرکارِ دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ وصال سے ایک روز قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدۃ النساء کو بلا بھیجا وہ تشریف لائیں تو ان کے کان میں کچھ فرمایا تو وہ رونے لگیں۔ پھر بلا کر دوبارہ کان میں کچھ کہا تو وہ ہنس پڑیں۔ ازواجِ مطہرات نے اصرار کے ساتھ پوچھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کان میں راز داری سے کیا کہا تھا مگر انہوں نے بتانے سے انکار کر دیا۔ بعد میں آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتایا کہ پہلی دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اسی بیماری میں انتقال فرما جائیں گے تو میں رو پڑی۔ پھر فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے تم ہی

مجھ سے ملوگی تو میں ہنسنے لگی۔ وصال سے قبل سرورِ کائنات ﷺ پر بار بار غشی طاری ہو رہی تھی۔ اور آپ سخت بے چینی میں تھے۔ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا بے تاب ہو کر بول اٹھیں۔ ''ہائے میرے باپ کی بے چینی۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا باپ آج کے بعد کبھی بے چین نہ ہوگا۔'' جب آنحضرت ﷺ انتقال فرما گئے تو خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا لیکن صبر واستقلال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ اس کے بعد جب تک زندہ رہیں کبھی کسی نے ہونٹوں پر تبسم نہیں دیکھا۔ آنحضرت ﷺ کے وصال کے چھ ماہ بعد ہی حضور ﷺ کی پیشین گوئی پوری ہونے کی ساعت آپہنچی۔ رمضان ۱۱ھ کی تیسری تاریخ کو منگل کے دن خواتینِ اسلام کی قافلہ سالار اپنے خالق سے جاملیں۔ اس وقت عمر انتیس اور تیس برس کے درمیان تھی۔ چونکہ سن ولادت میں اختلاف پایا جاتا ہے اس لیے وفات کے وقت ان کی صحیح عمر پر بھی اتفاق رائے نہیں ہے۔ خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کا جنازہ اٹھاتے وقت یہ خاص اہتمام کی ابتدا حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا سے ہوئی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ اس سے پہلے مرد اور عورت سب کا جنازہ کھلا ہوا جاتا تھا۔ چونکہ حضرت فاطمۃ الزاہرا رضی اللہ عنہا عصمت وعفت اور شرم وحیا کا ایک زندہ جاوید پیکر تھیں۔ اس لیے انہوں نے حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے ایک مرتبہ فرمایا کہ کھلا جنازہ لے جانے سے عورتوں کی بے پردگی ہوتی ہے جس کو میں سخت ناپسند کرتی ہوں۔ یہ سن کر حضرت اسماء بنت عمیس نے یہ تجویز پیش کی جسے سن کر آپ بے حد خوش ہوئیں اور فرمایا کہ یہ بہترین طریقہ ہے۔ چنانچہ خاتونِ جنت کے وصال کے بعد ان کی اس خواہش کا پورا احترام کیا گیا۔ پھر یہ طریقہ ہمیشہ کے لیے رائج ہو گیا۔ آپ کو دارِ عقیل میں دفن کیا گیا جہاں آج تک امت محمد ﷺ عقیدت کے پھول نچھاور کرتی ہے۔ آپ کے ہاں پانچ اولادیں ہوئیں۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ، حضرت امام

حسین رضی اللہ عنہ، شہید نینوا، حضرت محسن رضی اللہ عنہ، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا۔ ان میں سے حضرت محسن رضی اللہ عنہ نے بچپن میں ہی انتقال کیا اور باقی ہستیوں کے دردناک ذکر سے تاریخ کی آنکھیں آج بھی اشک بار ہیں۔

سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزاہراء رضی اللہ عنہا کو تاریخ اسلام اور مسلمان خواتین میں جو شرف اور مرتبہ حاصل ہے اسے ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں تاہم میں اپنی بہنوں کی راہنمائی کے لیے خاتون جنت کی چند نمایاں صفات تحریر کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام بنات طاہرات میں یہ شرفِ امتیاز صرف سیدہ عالم کو حاصل ہے کہ ان سے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل باقی رہی۔ اسی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت فاطمۃ الزہراء کی اولاد سے بے پناہ محبت تھی بالخصوص حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ تو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی گفتگو، لب ولہجہ، رفتار و گفتار اور اٹھنے بیٹھنے کا انداز بالکل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ تھا۔ آپ سے کم وبیش اٹھارہ احادیث مروی ہیں۔ جنہیں بڑے بڑے جلیل القدر اور بزرگ صحابہ نے روایت کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے اس قدر محبت تھی کہ تاریخ میں وہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ''فاطمہ رضی اللہ عنہا میرے جسم کا ایک حصہ ہے جو اس کو ناراض کرے گا۔ مجھ کو ناراض کرے گا۔'' صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابوجہل کی بیٹی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ دربارِ رسالت میں اطلاع ہوئی تو آپ نے منبر پر چڑھ کر فرمایا:

''آل ہشام، علی ابن ابی طالب سے اپنی بیٹی کا عقد کرنا چاہتی ہے اور مجھ سے اجازت مانگتی ہے لیکن میں اجازت نہ دوں گا! کبھی نہ دوں گا، کبھی نہ دوں گا البتہ ابن ابی طالب میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح کر سکتے ہیں۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا

میرے جسم کا ایک حصہ ہے جس نے اس کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھ کو اذیت دی۔ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے نہیں کھڑا ہوا لیکن خدا کی قسم ایک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ایک دشمنِ خدا کی بیٹیاں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بصیرت افروز خطبہ کے بعد یہ بات دب کر رہ گئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا کی حیاتِ طیبہ میں کبھی دوسری شادی کا خیال تک نہ کیا۔

حضرت سیدہ رضی اللہ عنہا عالی مقام کی فضیلت اور ان کا شرف و مرتبہ ترمذی کی ایک حدیث سے ظاہر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کا شمار دنیائے انسانیت کی برگزیدہ اور مقدس ترین خواتین میں فرمایا ہے:

"تمہاری تقلید کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں مریم علیہا السلام، خدیجہ رضی اللہ عنہا، فاطمہ رضی اللہ عنہا اور آسیہ رضی اللہ عنہا کافی ہیں۔"

جہاں سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کو قیامت تک کے لیے بلند سیرت و کردار کا نمونہ قرار دیا گیا ہے وہاں بیٹی کو بھی وہی شرف بخشا گیا ہے پوری انسانی تاریخ میں ایسی ماں بیٹی کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتی۔ ان کے بعد یہ بلند ترین مقام کسی عورت کو ابد تک نصیب نہیں ہو سکتا۔ آپ کی خانگی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ میں چکی پیستے پیستے نشان پڑ گئے تھے اور پانی کی مشک ڈھوتے ڈھوتے ان کی گردن داغدار ہو گئی تھی۔ اور گھر میں جھاڑو دینے سے ان کپڑے غبار آلودہ ہو جاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غلام آئے تو میں نے کہا فاطمہ رضی اللہ عنہا! کیا اچھا ہو جو تم اپنے باپ سے جا کر ایک خادم کا سوال کرو۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو وہاں بہت سے لوگوں کو باتیں کرتے دیکھا

تو واپس آ گئیں۔ پھر دوسرے دن آ کر حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا کام ہے؟ فاطمہ خاموش رہیں۔ میں نے کہا کہ میں عرض کرتا ہوں بات یہ ہے کہ چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھ اور مشکیزہ اٹھاتے رہنے کہ وجہ سے ان کی گردن پر داغ پڑ گئے ہیں جب آپ کے پاس کچھ خدام آئے تو میں نے ان کہا کہ حضور ﷺ کے پاس جا کر ایک خادم کا سوال کریں تاکہ یہ اس مشقت سے بچ جائیں جس میں گرفتار ہیں یہ سن کر سرکار دو جہاں ﷺ نے فرمایا: فاطمہ رضی اللہ عنہا! تقویٰ اختیار کر اور اپنے رب کا فرض ادا کر۔ اپنے گھر والوں کا کام کیا کر اور جب تو سونے لگے تو تینتیس بار تسبیح (سبحان اللہ) اور تینتیس بار تحمید (الحمد للہ) اور چونتیس بار تکبیر (اللہ اکبر) پڑھ کر سو ۱۰۰ کی تعداد پوری کر لیا کر۔ یہ ورد تیرے لیے ایک خادم سے زیادہ بہتر ہوگا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے راضی ہوں۔ غرض حضور نے انہیں کوئی خادم نہیں دیا۔

(ابوداؤد، ترمذی)

اسی طرح ایک اور روایت ہے کہ ایک مرتبہ خاتونِ جنت فخر النساء حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کو ہاتھوں کے چھالے دکھائے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"جان پدر! بدر کے یتیم تم سے پہلے اس کے مستحق ہیں۔"

کون نہیں جانتا کہ سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اس فقید المثال عظمت کے مالک باپ کی لختِ جگر تھیں جن کے قدموں میں دنیا بھر کے خزانے بچھے رہتے تھے اور اسلام کے اس مایہ ناز فرزند کی اہلیہ تھیں جن کی شمشیر جوہردار نے صفحہ ہستی پر انمٹ نقوش ثبت کر کے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ دنیا اس گھرانے کے تقدس کی قسم کھاتی تھی لیکن اس کے باوجود دخترِ خیر الانام کی زندگی اس حالت میں گزری کہ کبھی دو وقت کے پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہ ہوئی۔ وہاں سامان آرائش و زیبائش کا نشان تک نہ تھا۔ قیمتی

اور خوبصورت ملبوسات کا کیا ذکر وہاں کبھی تن ڈھانپنے کے لیے پورا لباس میسر نہ آیا۔
ایک دفعہ آنحضرت ﷺ اپنی محبوب نور نظر سے ملنے تشریف لائے تو دیکھا کہ اس قدر چھوٹی چادر اوڑھ رکھی ہے کہ سر ڈھانپتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ رہ جاتا ہے۔ اس ناداری اور افلاس کی یہ وجہ نہ تھی کہ دنیا کی دولت انہیں مل نہ سکتی تھی بلکہ یہ خاندانِ نبوت کا وہ امتیاز تھا جس نے فقر و استغناء کا آخری تصور قائم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ جو اللہ کے لیے جیتے اور مرتے ہیں، دنیا کی زیبائش و آرام اور اثاثہ و دولت ان کے لیے خاکِ پا سے بھی کم تر حیثیت رکھتی ہے۔ وہ دنیا کو دینے کے عادی ہوتے ہیں لینا نہیں جانتے۔ آنحضرت ﷺ ہرگز پسند نہ فرماتے تھے کہ ان کے گھرانے میں فقر و توکل کے سوا کسی اور چیز کا ذکر کیا جائے۔ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سیدہ کو سونے کا ایک ہار لا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو فرمایا:

"فاطمہ! کیا لوگوں سے یہ کہلوانا چاہتی ہو کہ پیغمبر کی بیٹی آگ کا ہار پہنتی ہے۔"

حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے اسی وقت اتار کر فروخت کر دیا اور اس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ سرور کائنات ﷺ کسی جنگ سے واپس تشریف لائے تو حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے خوش آمدید کی خاطر گھر کے دروازوں پر پردے لٹکا دیئے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ کو چاندی کے کنگن پہنائے۔ جس وقت آنحضرت ﷺ حسب معمول سیدہ کے کاشانہ مبارک میں تشریف لائے تو یہ صورت دیکھ کر واپس ہو گئے۔ جب خاتونِ جنت کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے پردے اتار کر پھینک دیئے۔ اور کنگن نکال ڈالے۔ بچے روتے ہوئے دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"یہ میرے اہل بیت ہیں میں نہیں چاہتا کہ وہ ان باتوں سے آلودہ ہوں

اسکے بدلے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے ایک عصیب کا ہار اور ہاتھی دانت کے دو کنگن خرید لاؤ۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگ امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اور دعوتِ اسلام سے قبل ہی یہ تسلیم کرتے تھے کہ راستی اور صداقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بہت بڑا وصف ہے۔ پَرتو سیرت و کردار پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمۃ الزاہراء رضی اللہ عنہا اس خصوصیت میں دنیا بھر کی عورتوں سے ممتاز تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کسی کو راست گفتار اور صاف گو نہیں دیکھا البتہ ان کے والد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔"

عصمت وعفت اور شرم وحیا میں سیدہ کا درجہ بہت زیادہ بلند تھا۔ کیوں نہ ہوتا وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک کا ایک حصہ تھیں۔ اور اس سرچشمہ حیاء کا ایک دھارا تھیں جس سے پوری انسانیت سیراب ہوتی آرہی ہے۔

سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو شاہِ کونین سے بے پناہ محبت تھی اور وہ بچپن ہی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے حد گرویدہ تھیں۔ ایک دفعہ مکہ میں جب وہ بچی تھیں تو انہیں معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف ہیں اور ایک شخص عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی ہے اور لوگ اردگرد جمع ہو کر تمسخر اڑا رہے ہیں کمسن ہونے کے باوجود یہ سنتے ہی محبت نے ایسا جوش مارا کہ آپ بھاگ کر اس جگہ پہنچیں۔ فوراً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن سے اوجھڑی ہٹا کر دور پھینکی اور عقبہ کو بددعائیں دیتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ اور باپ ہوتے ہوئے بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے جب کبھی سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے پہلے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے پاس جاتے اور واپسی پر بھی جن کو سب سے پہلے باریابی کا شرف نصیب ہوتا وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

ہوتی تھیں۔ اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ جب خاتونِ جنت پیغمبر ﷺ کی خدمت میں تشریف لے جاتیں تو آپ ﷺ فرطِ محبت سے اٹھ کر کھڑے ہو جاتے۔ ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست سے ہٹ کر اپنی جگہ پر بٹھاتے۔ اللہ اکبر! دربار رسالت میں جن کا یہ رتبہ ہو ان کی رفعت و عظمت کا کون حریف ہو سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا باہم انتہائی خوشگوار زندگی بسر کریں۔ بہ تقاضائے بشری اگر ان دونوں میں کبھی شکر رنجی ہو جاتی تو فوراً صلح کرا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ دونوں کی صلح کرانے کے بعد گھر سے باہر تشریف لائے تو لوگوں نے پوچھا کہ جب آپ اندر گئے تھے تو آپ کی حالت اور تھی اب اس قدر مسرور اور خوش باہر تشریف لائے ہیں۔ فرمایا: میں نے ان دوستوں میں صلح کرا دی ہے جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

اس قسم کے بے شمار واقعات اور مناقب سے احادیث دسیر کی کتب بھری پڑی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ سیدۃ النساء میں وہ کون سی صفات تھیں کہ پیغمبر ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان سے یہ الفاظ نکلے۔

"اِنَّ فَاطِمَةَ سَیِّدَةُ نِسَآءِ اَهْلِ الْجَنَّةِ"

"بے شک فاطمہ رضی اللہ عنہا تمام جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔"

آج کی مسلمان خواتین اگر خود اپنا جائزہ لینا پسند کریں کہ وہ کس حد تک اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر کاربند ہیں۔ وہ کیا ہیں اور انہیں کیا ہونا چاہیے تو سیدۃ النساء خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے حیاتِ طیبہ سے بہتر معیار ان کے لیے کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس صاف و شفاف آئینے میں بخوبی اپنے خدوخال دیکھ سکتی ہیں اور یہ سمجھ سکتی ہیں کہ اسلام ایک مسلمان خاتون سے کن باتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ ہماری بہنوں کو آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان ہونے کی

حیثیت سے وہ صرف حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی تقلید کرسکتی ہیں۔ اسی میں اُن کی بھلائی اور بہتری ہے۔ یہی وہ صحیح منبع ہے جہاں سے انہیں بے داغ نسوانی کردار، بے مثال وقار اور حوروں کو شرما دینے والی ملکوتی صفات کا آب حیات مل سکتا ہے۔ دوسروں کی تقلید اور تتبع مسلمان عورت کے لیے سراسر باعث توہین ہے کیونکہ تاریخ عالم میں وہ ہمیشہ خود دوسروں کی تقلید بنتی رہی ہے۔ آج دوسروں کی گدائی انہیں زیب نہیں دیتی۔ سیرت و کردار کے معاملے میں سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا مسلمان عورتوں میں ایک مشعلِ نور ہیں۔ جو قیامت تک روشن رہے گی۔

وہ انسان کامل تاجدار انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ دل ہیں اور ان کی تربیت آغوش نبوت میں ہوئی۔ ان کی عظیم المرتبت والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا وہ ہستی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے برگزیدہ ترین خواتین میں شمار فرمایا۔ بیٹی ہونے کے لحاظ سے کوئی بھی دوسری عورت ان کی عظمت و رفعت کی مثیل نہیں ہوسکتی۔ وہ ایک عالی نسب درویش خلیفہ اور خیبر شکن مجاہدِ اعظم شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں اور بیوی کی حیثیت سے ایک روشن قندیل ہیں جس کی نورانی کرنیں ساری دنیا کو منور کررہی ہیں۔ وہ جگر گوشۂ رسول شہید کربلا، محسنِ اسلام حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں اور ان کی مبارک زندگی دنیا بھر کی ماؤں کے لیے اسوۂ کامل ہے۔ ان کے آغوشِ تربیت نے دنیا کو حضرت امام حسن ایسا متقی اور عاشقِ اسلام فرزند بخشا۔ سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ ایسی پیکرِ شجاعت اور مجسم تسلیم و رضا ہستی بخشی۔ جن کے پاک اور مقدس خون نے ہمیشہ کے لیے ظلم و استبداد کی قوت کو شرمسار اور منفعل کردیا۔ اسی آغوش نے قدسی حسن و جمال کے سانچے میں ڈھلی ہوئی غیرت و عفت صبر و استقامت اور شجاعت و دلیری حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی صورت میں عطا کی۔ حضرت فاطمۃ الزاہراء رضی اللہ عنہا کی پاک زندگی میں ہماری عورتوں کے لیے بے شمار اسباق پوشیدہ

ہیں۔ ان کی سیرت کے بہت سے دوسرے اہم گوشوں کے علاوہ سیدہ کی شادی کا واقعہ بھی بہت اہم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے شادی کا سوال پیدا ہوتے ہی حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کے جذبات اور احساسات کا پورا خیال رکھتے ہوئے کسی قسم کا فیصلہ کرنے سے قبل اپنی محبوب بیٹی سے بھی رائے طلب کی۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اسی گھرانے میں رہے وہیں ان کا بچپن گزرا اور وہیں جوان ہوئے لیکن سرکارِ دو عالم ﷺ نے اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کیے بغیر کوئی فیصلہ صادر فرمانا مناسب خیال نہ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی پیاری لختِ جگر کے لیے جو رشتہ منتخب فرمایا اور انتخاب کا جو معیار سامنے رکھا وہ ہم سب کو دعوتِ فکر دیتا ہے کیا اس وقت حدود عرب میں بڑے بڑے روساء اور دولت مندوں کی کمی تھی؟ خود مسلمانوں کے اندر بھی اس وقت ایسے لوگ موجود تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے دل کھول کر دینا کی نعمتیں عطا کی تھیں۔ وہ اعلیٰ سماجی حیثیت کے مالک بھی تھے لیکن شاہِ دو جہاں نے کسی بھی ایسی بات کو قابلِ غور خیال نہ فرمایا۔ بلکہ اپنی نورِ نظر کی رضا و مرضی کے ساتھ ایک ایسی ہستی کو منتخب کیا جن کے پاس شادی کے مصارف ادا کرنے کیلیے بھی ایک زرہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ وہ دولت مند تھے، نہ ان کی کوئی ملکیت اور جائیداد تھی بلکہ رہائش تک کے لیے مکان نہ تھا اور پھر گزارے کا بھی کوئی معقول بندوبست نہ تھا لیکن تقویٰ و طہارت کی لافانی دولت سے ان کا خزانہ دل معمور تھا۔ وہ نیک و پارسا اور پاکباز تھے۔ ان کے پاس بلند کردار اور اعلےٰ سیرت کے ہیرے اور جواہرات ان گنت صورت میں موجود تھے۔ وہ علم و فضل کی جوئے بیکراں تھے۔ مانے ہوئے بہادر اور شجاع تھے۔ فقر و استغناء کا پیکر تھے۔ قربانی و ایثار کا ایک اعلےٰ نمونہ تھے۔ نیکی اور شرافت کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ یہی وہ دولت ہے جو ایک سچے مسلمان کو دنیاوی سامانِ آسائش و آرام سے محروم ہوتے ہوئے بھی باعثِ رشک بنا دیتی ہے۔ آج جو لوگ دولت اور جھوٹی حیثیت کے طلسم میں اسیر ہو کر

اپنی بہنوں اور بیٹوں کو کئی قسم کی دنیوی مصلحتوں پر قربان کر دیتے ہیں انہیں سوچنا چاہیے کہ کیا وہ سنتِ رسولِ مقبول ﷺ پر عمل کر رہے ہیں۔ یا مکروہ تجارت کر کے عذاب الٰہی کے مستحق بن رہے ہیں۔ ہماری بہنیں یہ بھی پڑھ چکی ہیں کہ شہنشاہِ کونین کی سب سے پیاری بیٹی کو رخصت ہوتے وقت کیا کچھ جہیز میں ملا۔ اور اپنے عالی مرتبہ خاوند کی جانب سے انہیں کیا دیا گیا؟ حالانکہ اگر سرکار دو عالم ﷺ چاہتے تو دنیا بھر کی دولت اپنی بیٹی کے قدموں میں جمع کر دیتے اور اس کے لیے ان کا ایک اشارہ کافی تھا۔ مگر ایسا نہ ہوا بلکہ حضور ﷺ نے اپنی امت کے لیے سادگی کی ایک درخشاں مثال قائم فرمائی۔ اس کے بعد سیدہ عالم نے نہایت خلوص، دلسوزی، محنت و استقلال اور صبر و توکل کے ساتھ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر میں زندگی بسر کی۔ ایسی زندگی جو ہر قسم کی دنیوی شان و شوکت سے خالی تھی۔ جہاں کئی کئی روز چولہے میں آگ نہ جلتی تھی۔ فقر فاقہ اور بے سرو سامانی کا عالم ہوتا تھا۔ روزمرہ کی زندگی کے لیے بنیادی ضروریات بھی پوری نہ ہوتی تھیں اور گھر کے سخت سے سخت کام انہیں اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتے تھے۔ اس کے باوجود اس پیکر صدق و صفا کی یہ حالت تھی کہ سیدہ کونین کے مبارک ہاتھ رات رات بھر چکی پیسنے میں مصروف رہتے اور ہونٹوں پر قرآن کی تلاوت جاری رہتی۔ چکی کے ترنم میں بسی ہوئی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی پاک آواز کا قرآنی سوز و گداز ملائک کو بھی مبہوت و بے خود کر دیتا ہوگا اور اس وقت اس کے پاک آواز کے زیر و بم کے ساتھ اللہ کی ان گنت رحمتیں کاشانہ بتول رضی اللہ عنہا پر نازل ہوتی ہوں گی۔ اس کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول احکام کی سخت پابندی، زہد و تقویٰ، عبادت، راست گفتاری، شرم و حیا کی انتہا، عشقِ رسول اور اپنے شوہر کی اطاعت وہ جوہر تھے جن سے سیرتِ زہراء رضی اللہ عنہا کا فلک بوس محل آج تک جگمگا رہا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایسی بزرگ ہستی نے ان کی سچائی، راست گفتاری اور صدق و صفا کی قسم

کھائی ہے۔

خدا کرے کہ ہمارے گھرانے سیرتِ زہراء رضی اللہ عنہا کے نور سے ایک بار پھر منور ہو جائیں تا کہ اسلام کو سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کی عظمت کو برقرار رکھنے والے قافلہ سالار مل جائیں اور ہماری قوم کا مطلع تاریک ایک بار پھر دنیا میں نور پھیلانے والے چاند ستاروں سے مزین ہو جائے۔

حضرتِ امامہ رضی اللہ عنہا

آنحضرت ﷺ کو حضرت امامہ رضی اللہ عنہا سے اتنی محبت تھی کہ آپ ﷺ ان کو اوقات نماز میں بھی جدا نہیں کرتے تھے۔
•(صحیح بخاری)

حضرت امامہ رضی اللہ عنہا آنحضرت ﷺ کی نواسی تھیں۔ حضور ﷺ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئیں۔ باپ کا نام ابوالعاص بن ربیع تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ ان سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ مسجد میں اس حالت میں تشریف لائے کہ امامہ رضی اللہ عنہا کندھے پر سوار تھیں۔ آپ ﷺ نے اسی حالت میں نماز پڑھائی جب رکوع میں جاتے تو ان کو اتار دیتے پھر جب کھڑے ہوتے تو کندھے پر چڑھا لیتے۔ اسی طرح پوری نماز ادا فرمائی۔ طبقات میں لکھا ہوا ہے کہ ایک روز کسی نے بارگاہ نبوت میں کچھ اشیا ہدیہ کے طور پر بھیجیں جن میں ایک زریں ہار بھی تھا۔ امامہ رضی اللہ عنہا اس وقت ایک طرف کونے میں کھیل رہی تھیں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کی میں یہ ہار اپنی عزیز ترین اہل کو دوں گا، ازواج نے خیال کیا کہ یہ شرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوگا لیکن آپ ﷺ نے حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر خود وہ ہار ان کے گلے میں ڈال دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تحفہ

شاہ حبشہ نجاشی کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال فرمایا تو اس وقت حضرت امامہ رضی اللہ عنہا جوان ہو چکی تھیں۔ خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا۔ مشہور ہے کہ حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کے والد نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو امامہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی وصیت کی تھی۔ چنانچہ یہ نکاح ان کی مرضی سے ہوا۔ جب ۴۰ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت نوش فرمایا تو آپ رضی اللہ عنہ نے مغیرہ بن نوفل کی وصیت کی کہ وہ امامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیں۔ ابھی مغیرہ نے اس وصیت پر عمل نہیں کیا تھا کہ حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کو امیر معاویہ کی طرف سے شادی کا پیغام موصول ہوا۔ لیکن حضرت امامہ رضی اللہ عنہا نے یہ پیشکش رد کر دی اور فوراً مغیرہ کو یہ اطلاع دی۔ انہوں نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی اجازت سے نکاح پڑھوالیا۔ حضرت مغیرہ کا یہ اقدام ظاہر کرتا ہے کہ اس مبارک دور کی پاکباز مسلمان خواتین میں کس درجہ دینی حمیت موجود تھی اور وہ دنیوی شان و شوکت اور امارات کو کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ایک دلیر اور بہادر خاتون تھیں۔ جن میں صبر واستقامت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا رشتہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اور خالہ زاد بہن بھی تھیں۔ آپ عبدالمطلب کی نورِ نظر تھیں۔ ماں کا نام ہالہ بنت وہب تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ مکرمہ آمنہ کی ہمشیر تھیں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ کے حقیقی بھائی تھے۔ پہلی شادی ابوسفیان بن حرب کے بھائی حارث سے ہوئی اس کے انتقال کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بھائی عوام بن خویلد سے نکاح ہوا جن سے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے مؤرخین نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام پھوپھیوں میں یہ شرف صرف حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا ہے کہ انہوں نے صدق دل سے دعوت اسلام پر لبیک کہی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی معیت میں ہجرت فرمائی۔ جنگ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو وہ بیتاب ہو کر مدینہ سے باہر نکلی اور نہایت غصہ کے ساتھ صحابہ اکرام کو مخاطب کر کے کہنے لگیں۔ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو، جب آنحضرت نے انہوں کو ادھر آتے ہوئے دیکھا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ صفیہ رضی اللہ عنہا حضرت

حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش دیکھنے کے لیے نہ جائیں کیونکہ کفار نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کا چہرہ مسخ دیا ہے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دیا تو کہنے لگیں کہ میں اپنے بھائی سے متعلق تمام حالات سن چکی ہوں۔ خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ یہ بلند عزم وضبط اور حوصلہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نعش پر جانے کی اجازت دے دی۔ دیکھا کہ بھائی کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے اور خون کا تالاب بنا ہوا تھا۔ کلیجہ تھام کر یہ دردناک منظر دیکھا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے عزیز بھائی کی شہادت پر ایک دردناک مرثیہ لکھا جس کے ایک ایک شعر میں انہوں نے اپنے دل کا درد سمو دیا تھا۔ اس مرثیے کے کئی اشعار آج بھی کئی کتابوں میں ملتے ہیں جن سے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی بے مثال بہادری کا ایک اور واقعہ خاص طور پر بہت مشہور ہے غزوہ خندق کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو فارع کے قلعہ میں رہنے کا حکم دیا کیونکہ یہ قلعہ زیادہ مستحکم اور مضبوط تھا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ خواتین کی حفاظت کے لیے مقرر ہوئے اور مسلمان میدان جنگ میں چلے گئے جب یہودیوں نے یہ دیکھا کہ تمام مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میدان جنگ میں چلے گئے ہیں اور قلعے میں صرف عورتیں پناہ گزین ہیں تو ایک یہودی قلعے کے دروازے تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھنے لگا۔ اچانک حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اس یہودی کو دیکھ لیا اور حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ فوراً جا کر اس یہودی کو قتل کر دو ورنہ یہ واپس جا کر دشمنوں کو ہمارے ٹھکانے سے آگاہ کر دے گا۔ مگر حضرت حسان رضی اللہ عنہ ایک نرم دل شاعر تھے ویسے بھی انہیں ایک ایسا عارضہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ بچپنی کے عالم میں ہی لڑائی کے نام سے بھی دور بھاگتے تھے چنانچہ انہوں نے جواب دیا کہ میں اس کام

کے قابل ہوتا تو یہاں کیوں بیٹھا ہوتا۔ یہ سن کر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو سخت طیش آیا۔ انہوں نے فوراً خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور نیچے اتر کر اس زور سے یہودی کے سر پر ماری کہ اس کی کھوپڑی ٹوٹ گئی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے واپس آ کر حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جا کر اس کے ہتھیار اور کپڑے لے آئیں مگر انہوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا جانے دیجئے مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں اس کے بعد حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے باہر پھینک دیں تا کہ دوسرے یہودیوں کو معلوم ہو کہ قلعہ کے اندر بھی فوج موجود ہے مگر حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے یہ کام کرنے سے بھی معذوری ظاہر کر دی تو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے خود اس یہودی کا سر کاٹ کر نیچے پھینک دیا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا خیال بالکل درست ثابت ہوا جب یہودی کا سر نیچے گرا تو یہودی مرعوب ہو کر بھاگ گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ عورتوں کی حفاظت کے لیے قلعے کے اندر بھی فوج موجود ہے۔

۱۱ھ میں جب آفتاب رسالت غروب ہو گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غم میں ایک دردانگیز مرثیہ لکھا۔ ایک مشہور مورخ ابن اسحاق نے اپنی کتاب میں یہ پورا مرثیہ نقل کیا ہے۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے تہتر برس کی عمر میں ۲۰ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

حضرت اُم رومان رضی اللہ عنہا

"جو شخص عورتوں میں حور عین کو دیکھنا چاہے وہ ام رومان کو دیکھ لے۔" (ارشاد نبوی ﷺ)

آپ اپنی کنیت اُمِ رُومان ہی سے مشہور ہیں۔ اصل نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ان کی والدہ کا نام عامر بنت عویمر تھا۔ قبیلہ کنانہ کے فراس نامی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک امیر کبیر شخص عبداللہ سے نکاح ہوا۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ مکہ آ کر مقیم ہوئیں۔

حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا بچپن سے ہی بے حد ہمدرد، غمگسار، ملنسار اور نرم دل مشہور تھیں۔ ان ہی قابل رشک اوصاف کی وجہ سے وہ اپنے قبیلے کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ اور ہر شخص آپ کو قدر و محبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جہاں بڑی فیاضی کے ساتھ حسن جمال کی دولت سے مالا مال کیا تھا وہاں ان کا خزانہ سیرت بھی اوصاف جمیلہ کے زر و جواہرات سے پُر کر دیا تھا۔ شروع ہی سے انہیں دوسروں کی خدمت کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ انہوں نے کھیل کود کی طرف زیادہ توجہ نہ دی تھی۔ بلکہ اپنا تمام وقت ماں باپ کی خدمت گزاری، اطاعت، فرمانبرداری اور تعمیل احکام میں بسر کرتی تھیں۔ قبیلے کے دوسرے لوگ اپنے بچوں کو آپ کی مثال دے کر اچھے کاموں پر آمادہ کیا کرتے تھے۔ چھوٹی عمر میں ہی اتنی

ملنسار اور مہمان نواز تھیں کہ اپنی ہم عمر سہیلیوں اور ہجولیوں کو گھر بلا کر دعوتیں کھلانا ان کا محبوب شغل تھا۔ وہ دوسروں کی خاطر تواضع اور مہمان نوازی سے بے حد مسرور ہوتی تھیں۔ نرم دل اور انسانیت دوستی کا یہ عالم تھا کہ اڑوس پڑوس میں کوئی بیمار پڑ جاتا یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو جاتا تو ننھی بنت عامر مضطرب و بے تاب ہو جاتیں۔ دن میں کئی بار وہاں جاتی، معصوم زبان سے اسے دلاسہ دیتی، جہاں تک ممکن ہوتا بڑے ذوق و شوق سے تیمارداری کرتی، چھوٹے موٹے کام خود کر دیتی اور پروانہ وار اس کے گھر کے ارد گرد منڈلاتی رہتی۔ جب تک اسے پوری طرح آرام نہ آ جاتا بنت عامر کو چین نصیب نہ ہوتا گھر سے جو کچھ اپنے خرچ کے لیے ملتا اسے اپنے ہم عمر بچوں میں تقسیم کر کے خوش ہونا بنت عامر کا امتیاز تھا۔ اگر گھر کے دروازے پر کوئی سائل آ جاتا تو سب سے پہلے یہ ننھی حور آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کرتی اور ہر ممکن کوشش کرتی کہ سائل خالی ہاتھ واپس نہ جائے۔

جوان ہوئیں تو یہ تمام صفات حسنہ بھی عمر کے ساتھ پروان چڑھ کر اوج کمال تک پہنچیں وہ سراپا رحمت بن کر اپنے شوہر کے گھر میں تشریف لائیں اور اسے رشک جنت بنا دیا۔ وہ جب اپنے ماں باپ کے گھر میں تھیں تو انہوں نے ایک نیک اور سعادت مند بیٹی بن کر ان کی عزت کو چار چاند لگائے اور ہر شخص سے خراج تحسین حاصل کیا۔ جوان ہو کر شوہر کے گھر آئیں تو ایک سلیقہ شعار، خدمت گزار، مجسم ایثار اور سگھڑ بیوی بن کر سسرال کے ہر فرد کو اپنا گرویدہ بنا لیا نکاح کے کچھ عرصہ بعد ہی ان کے شوہر عبداللہ اچانک وفات پا گئے۔ خاوند کی وفات کے بعد آپ رضی اللہ عنہا کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جس کا نام طفیل تھا۔

حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا کا دوسرا نکاح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہوا اور اپنی بہترین صفات کی بدولت انہوں نے جلد ہی حضرت ابوبکر کے ہاں قدر و منزلت کا مقام حاصل کر لیا۔ بعد میں ان کے ساتھ ہی حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔ جب کفار مکہ نے مسلمانوں پر بے پناہ سختیاں اور مظالم شروع کر دیئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہی مدینہ کی طرف ہجرت فرما گئے۔ مگر ام رومان رضی اللہ عنہا بعد میں مدینہ گئیں۔ ہجرت کے بعد وہ حسب عادت ہر وقت آنحضرت ﷺ اور اصحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں۔ اس پر آشوب دور میں حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا نے انتہائی دردمندی اور دل سوزی کے ساتھ گھرے ہوئے مسلمانوں کی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ وہ ہر مہاجر مسلماں کے غم واندوہ اور دکھ درد میں برابر کی شریک ہوتی تھیں۔

حضرت اُمِ رومان رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ عام کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ چند درویش منش اور غریب اصحاب رسول ﷺ کو کھانے پر اپنے گھر بلا لائے اور خود کسی ضروری کام کی غرض سے دربار رسالت میں تشریف لے گئے آپ رضی اللہ عنہ کو واپس آنے میں دیر ہوگئی۔ حضرت اُمِ رومان رضی اللہ عنہا نے مہمانوں کو کھانا بھیجا تو انہوں نے غالباً اس خیال سے کھانے سے انکار کر دیا کہ شاید اہل خانہ کے لیے کچھ نہ بچا ہو۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ واپس تشریف لائے تو انہوں نے اُمِ رومان سے دریافت کیا کہ مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا۔ انہوں نے جواب دیا کہ کھانا بھیجا تھا مگر مہمانوں نے انکار کر دیا ہے اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اصرار کے ساتھ سب کو کھلایا تو اللہ نے اس کھانے میں اتنی برکت دی کہ مہمانوں کے شکم سیر ہو کر کھانے کے بعد بھی بہت بچ رہا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اب کتنا کھانا باقی ہے تو حضرت اُمِ رومان رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تین گنا سے زیادہ بچا ہوا ہے چنانچہ آپ نے باقی کھانا آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آپ کے ہاں دو بچے حضرت عبدالرحمان رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہوئے۔ بعد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آنحضرت ﷺ کی محبوب اہلیہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت اُمِ رومان رضی اللہ عنہا نے اپنی باقی پوری

زندگی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت اور معیت میں بسر کردی۔ آپ کا صحیح سنِ وفات معلوم نہیں ہوسکا کہا جاتا ہے کہ ۹ ھ کے بعد رحلت فرمائی۔ وفات کے بعد سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انہیں قبر میں اتارا اور فرمایا کہ جو شخص عورتوں میں حورعین کو دیکھنا چاہتا ہے وہ اُمِ رومان کو دیکھ لے۔

حضرت اُمِ رومان رضی اللہ عنہا کی زندگی نسوانی اوج و وقار کی صحیح تصویر ہے۔ خدا ہماری بہنوں کو توفیق دے کہ وہ مسلمان عورت کے عزوشرف کا راز حضرت اُمِ رومان رضی اللہ عنہا کی زندگی میں پاسکیں اور اپنے اندر وہ تمام اوصاف پیدا کرسکیں۔

حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا

"وہ نہایت صالح بی بی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی زیارت کے لیے تشریف لاتے اور ان کے گھر میں آرام فرماتے تھے۔"

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حیدر کرار، شیر خدا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی والدہ ماجدہ تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا کے والد کا نام اسد بن ہاشم تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے شادی ہوئی۔ ایک بزرگ مؤرخ نے لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ بنت اسد رضی اللہ عنہا پہلی ہاشمی خاتون تھیں جن سے ہاشمی لڑکا پیدا ہوا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب رضی اللہ عنہا وفات پا گئے۔ اور جناب ابو طالب رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش کا فرض انجام دینا شروع کیا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو آپ کی حقیقی چچی تھیں۔ انتہائی محبت اور لطف و کرم کے ساتھ آپ کا ساتھ دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے یتیم بھتیجے کو آرام اور راحت پہنچانے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور دونوں ہاتھوں سے اللہ کی رحمت سمیٹ کر تاریخ میں حیات جاوید حاصل کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار خود ان کی شفقت اور محبت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا کہ ابو طالب رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کوئی شخص میرے ساتھ شفقت اور مہربانی سے پیش نہیں آیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پیرانہ سالی میں رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت فرمائی اور مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ مدینہ منورہ میں ہجرت

کا شرف حاصل کیا۔ جب جگر گوشتہ رسول حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوا تو اس وقت آپ زندہ تھیں اور بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ نکاح کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر آئے اور اپنی والدہ مکرمہ سے فرمایا کہ رسول ﷺ کی نور نظر حضرت بتول رضی اللہ عنہا ان کی بہو بن کر تشریف لا رہی ہیں۔ میں پانی بھروں گا اور باہر کا کام کروں گا اور وہ چکی پیسنے اور آٹا گوندھنے میں آپ کی مدد کریں گی۔

آنحضرت ﷺ کی زندگی میں وفات پائی۔ یہ وہ مبارک ہستی تھیں جنہیں کفن کے لیے سرکار دو عالم ﷺ نے اپنی قمیض عطا فرمائی اور جب قبر تیار ہو چکی تھی تو رحمۃ اللعالمین خود قبر میں اتر کر لیٹ گئے لوگ سخت حیران ہوئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ابو طالب رضی اللہ عنہ کے بعد فاطمہ رضی اللہ عنہا مجھ پر سب سے زیادہ شفقت فرماتی تھیں۔ انہوں نے میری بڑی خدمت کی ہے میں نے اپنی قمیض انہیں اس لیے پہنا دی ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ جنتی لباس عطا فرمائے اور قبر میں اس لیے لیٹ گیا تھا کہ یہ بزرگ ہستی ہر قسم کے عذاب سے حفاظت میں رہے۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت اسد کی زیارت کے لیے ان کے ہاں جایا کرتے تھے اور عام طور پر ان کے گھر میں آرام فرمایا کرتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ نہایت نیک، پاکباز اور صالح بی بی تھیں اور آنحضرت ﷺ انہیں دیکھنے جایا کرتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہیں سرور کونین ﷺ اپنی ماں سمجھ کر انتہائی عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے اور ان کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت اسد کے ہاں چار بیٹے ہوئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ، طالب رضی اللہ عنہ اور عقیل رضی اللہ عنہ ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ بہت زیادہ مشہور ہیں۔

حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا

> ''عمر رسیدہ ہونے کے باوجود انہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے والہانہ محبت تھی ان کی زندگی سادگی اور پاکیزگی کا نمونہ تھی۔''

آپ رضی اللہ عنہا کا اصل نام برکہ تھا۔ باپ کا نام ثعلبہ بن عمرو تھا۔ بعض روایات کے میں ہے کہ آپ کا وطنِ مالوف حبشہ تھا۔ کنیت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا مشہور تھی۔ حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد حضرت عبداللہ کی کنیز تھیں۔ اور بچپن سے ان کے پاس ہی رہتی تھیں۔ جب حضرت عبداللہ انتقال کر گئے تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہنے لگیں۔ جب وہ بھی فوت ہو گئیں تو حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہنے لگیں۔ پہلا نکاح عبید بن زید سے ہوا۔ مگر جب وہ انتقال کر گئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح کر دیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی ہوتے ہی آپ نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا نے بھی دوسرے ستم رسیدہ مسلمانوں کے ساتھ حبشہ کہ طرف ہجرت کی اور وہاں سے مدینہ منورہ تشریف لائیں۔ مختلف روایات میں ہے کہ آپ نے جنگ احد اور جنگ خیبر میں شرکت فرمائی تھی۔ زخمیوں کو پانی پلانے اور مرہم پٹی کرنے کا کام آپ کے ذمہ تھا۔ جب ۱۱ھ میں

آنحضرت ﷺ نے وصال فرمایا تو اس وقت زندہ تھیں اور زار و قطار رو رہی تھیں۔

غم واندوہ کی وجہ سے ان کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس آنحضرت ﷺ کے لیے بہتر جگہ ہے۔ اس وقت حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا نے انہیں جواب میں جو کچھ فرمایا وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اور ہماری خواتین کے لیے دعوتِ فکر ہے کہ وہ اس زرّیں دور کی خواتین کے بے مثل کردار پر غور کریں اور اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں کہ انہیں کس چیز سے والہانہ عشق تھا اور ان کے سوچنے کا انداز کیا تھا اور آج کے دور میں ہماری عورتوں کی دلچسپیوں کے مرکز کہاں ہیں۔ حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا نے فوراً جواب دیا۔

> ”مجھے یہ خوب معلوم ہے اور میرے رونے کا یہ سبب نہیں (جو آپ سمجھتے ہیں) بلکہ میں تو اس لیے رو رہی ہوں کہ اب وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔“

یعنی ہدایت و معرفت کا وہ آفتابِ عالم تاب غروب ہو گیا ہے جس کی ضیاء باری سے کائنات عالم کا ہر ذرہ رشک قمر بنا ہوا تھا۔ اور ضلالت و گمراہی کے اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے والی انسانی مخلوق کو اس کے مبداءِ فیض سے نئی زندگی مل رہی تھی۔

اس کے بعد جب ۲۳ھ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جامِ شہادت نوش فرمایا تو اس حادثہ پر بھی زار و قطار روئیں۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ اب کیوں روتی ہو فرمایا: اس لیے کہ اسلام کمزور ہو گیا۔ اللہ اللہ! یہ ان بلند مرتبہ خواتین کی اللہ اور اس کے دین کے ساتھ محبت اور شیفتگی کا عالم تھا۔ وہ ذاتی تعلقات و مراسم اور دنیوی فوائد و اغراض سے کتنا بلند ہو کر سوچتی تھیں۔

☆ آنحضرت ﷺ ام ایمن رضی اللہ عنہا کی بے پناہ عزت کرتے تھے اور کئی دفعہ فرمایا: اُمِ

ایمن رضی اللہ عنہا میری ماں ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

ایک طرف ان بزرگ خواتین کی پاک زندگیوں کو رکھیے اور دوسری طرف عمر رسیدہ خواتین کو دیکھیے کہ زندگی جتنی کم ہوتی جاتی ہے دنیا، مال، اولاد کے ساتھ ان کی محبت اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے انہیں غم ہوتا ہے تو گھر میں اپنا عمل دخل کم ہونے کا، اور افسوس ہوتا ہے تو بہو کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا۔ اگر کچھ یاد آتا ہے تو بیتے ہوئے خوشگوار لمحات جب وہ اپنے گھر میں بلاشرکت غیر سے حکومت کرتی تھیں۔ کتنے مبارک اور سعید ہیں وہ گھرانے جن میں آج بھی ام ایمن رضی اللہ عنہا کی سیرت کا چراغ روشن ہے اور جہاں بزرگی کے نورانی لباس میں ہدایت و محبت کی شمعیں جل رہی ہیں۔

شہیدۂ اوّل حضرتِ سُمیّہ رضی اللہ عنہا

''جن کی بے مثل قربانی نے تاریخ عالم میں عورت کا مرتبہ اتنا بلند کر دیا ہے کہ دنیا بھر کی عورتیں ان کی بلندی کردار پر جتنا فخر کریں کم ہے۔''

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے والد کا نام خباط تھا۔ مکہ کے ایک شخص ابو حذیفہ بن مخزومی کی کنیز تھیں۔ ابو حذیفہ نے اپنے ایک حلیف یاسر عبسی سے نکاح کر دیا۔ اور کچھ عرصے بعد انہیں آزاد کر دیا۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا مشہور صحابی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اسلامی تاریخ میں قابل رشک مقام حاصل ہے ایک ایسی عورت جو طلوع اسلام سے قبل معمولی کنیز تھیں جس کی کوئی حیثیت نہ تھی اس نے اسلام کے دامنِ رحمت میں آنے کے بعد صبر و استقلال اور ایثار و قربانی کی ایسی درخشندہ مثال قائم کی کہ تاریخ کے صفحات آج بھی اس کے نور سے جگمگا رہے ہیں۔

جب فاران کی چوٹی سے ختم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم و جور کے قالب میں ڈھلی ہوئی دنیا کو راہ ہدایت کی طرف آنے کی دعوت دی۔ اور اپنی رسالت کی خبر دی تو اپنے پرائے سب جان کے دشمن ہو گئے۔ جو کل تک عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و صفائی کی قسمیں کھاتے تھے وہی تذلیل و تحقیر

پر اتر آئے اور جن کی آنکھوں میں محبت و مروت تھی وہاں انتقام کی خون آشام بجلیاں لہرانے لگیں۔اس وقت حق وصداقت کی اس آواز پر لبیک کہنا شہادت گاہ الفت میں قدم رکھنا تھا۔آج کی دنیا میں رہتے ہوئے ہم اس خوفناک ماحول اور ان دہشت ناک حالات کا صحیح طور پر تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔اس وقت حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اور صابر بیٹے عمار رضی اللہ عنہ نے مجاہدانہ انداز میں آگے بڑھ کر اسلام کی دعوت کو سینے سے لگایا۔خدا اور اس کے سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ پورے خاندان کی زندگی حق وصداقت پر قربان ہونے کے لیے حاضر ہے اور ہم ہر قسم کے ظلم وستم کو خوش آمدید کہتے ہیں۔اس کے بعد وہی ہوا جس کی توقع تھی سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کا ساتواں نمبر تھا۔اور مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت جس ظلم وستم کا نشانہ بن رہی تھی اس میں یہ لوگ بھی شریک ہو گئے۔کفار کو ان غریب اور بے سروسامان لوگوں کا کیا لحاظ ہو سکتا تھا۔اس لیے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور ان کے خاوند کفار کا تر نوالہ بن گئے۔ان کو ایسی ایسی اذیتیں دی گئیں کہ ان کے ذکر سے آج بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

جب ابو جہل کو ان کے مسلمان ہونے کا علم ہوا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔اس نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے گھر کو آگ لگا دی۔انہیں ان کے خاوند یاسر رضی اللہ عنہ اور بیٹے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو زنجیریں پہنا کر بازاروں میں گھسیٹتے ہوئے قید خانے لے چلے۔حضرت یاسر رضی اللہ عنہ نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا سے کہا۔سمیہ! تم نے دیکھا یہ وہی آگ ہے جو میں نے خواب میں دیکھی تھی۔ابو جہل کے یہ قیدی بے بسی کے عالم میں رات بھر قید رہے صبح ان کو باہر نکالا اور جانوروں کی طرح ہنکار کر پھر بازاروں میں لائے ان مظلومین کو اسیری کی حالت میں تیز چلانے کے لیے خنجروں سے کچوکے لگاتے جاتے تھے۔غریب سمیہ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے تھے اور قہقہے لگاتے تھے

بازاروں میں تماشائی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے منہ پر پتھر مارتے تھے اور ان کا چہرہ لہولہان ہو جاتا تھا۔ایک جگہ ابو جہل نے اشارہ کیا تو لوگوں نے ان بے کسوں کو زمین پر گرادیا۔ان کے پہلو اور سینے لوہے کی تپتی ہوئی سلاخوں سے داغ دیئے گئے۔پھر ان کے سینوں پر بھاری پتھر رکھ دیے گئے۔اردگرد لوگ پانی کے مشکیزے بھر بھر کر ان کے اوپر انڈیلتے تھے۔ان عاشقانِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور سنگدل کفار ان کی حالت زار دیکھ دیکھ کر لطف اٹھاتے تھے اور قہقہے لگاتے تھے۔حارث بن ہشام نے اپنے بھائی عکرمہ بن ابو جہل سے کہا۔

"تم نے سمیہ رضی اللہ عنہا کو نہیں دیکھا؟ ان پر کوڑوں کی بارش ہو رہی تھی تو کس طرح اس کا جسم بل پہ بل کھا رہا تھا مگر اس کے منہ سے ایک چیخ بھی نہیں نکلی اور نہ درد وکرب کا اظہار ہوا۔ہمارا خیال تھا کہ ہم اسے معمولی سی تکلیف بھی دیں گے تو وہ اس سے دہشت زدہ ہو جائے گی مگر وہ تو زمین پر کمانی کی طرح گرتی تھی اور کھڑی ہو جاتی تھی اور ہم اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

دنیا کہتی ہے کہ عورت بہت کمزور ہوتی ہے اور اس میں عزم وارادہ کی وہ پختگی نہیں ہوتی جو بہادر مردوں کے حصہ میں آتی ہے۔عورت کسی کٹھن امتحان اور آزمائش کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔اور اس کا نرم ونازک بدن ظلم وجور کا ایک بھی حملہ برداشت نہیں کر سکتا۔جہاں تک عام دنیا کی پرستش کرنے والی عورتوں کا تعلق ہے ممکن ہے کہ یہ مفروضہ کسی حد تک درست ہو مگر ایک سچی مسلمان عورت کا وجود ہمیشہ ان خیالات کی تردید کرتا رہا ہے۔اسلام ایک ایسی حیرت انگیز طاقت ہے کہ جب یہ کسی دل پر حکمران ہو جاتا ہے تو ایک عورت کو بھی سیرت فولاد بخش دیتا ہے اور اس کے قلب ونظر میں ایسی طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتے ہیں مگر مومن عورت اپنے مقام سے ایک انچ ادھر اُدھر نہیں ہو سکتی۔وہ کسی اور ملت کی عورتیں ہونگی جو دوسروں کے دامن پر

چمکنے والے جھوٹے موتی دیکھ کر اپنے ہیرے جواہرات لٹا دیتی ہیں۔ جو ہر وہ راستہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں جس پر چلنے سے دین وایمان کی دولت بے شک لٹ جائے مگر چند دنیوی فوائد اور فنا زندگی کی چند عارضی آسائشیں نصیب ہو جائیں۔ ایک سچی مسلمان عورت تو گنج قارون کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرا کر اپنے دین وایمان کی حفاظت کرنا جانتی ہے وہ غیروں سے جینے کے اسلوب نہیں سیکھتی بلکہ دنیا کو زندگی کے انداز سکھاتی ہے۔ وہ تہذیب و معاشرت کی گداگری کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ وہ جانتی ہے کہ اس کے سر پر اللہ نے اسلام کا تاج رکھا ہے اگر اس کا سر غیر اللہ کی چوکھٹ پر جھکتا ہے یا وہ کسی بھی انداز میں دوسروں کے سامنے سرنگوں ہوتی ہے تو گویا وہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا سر جھکا دیتی ہے اور اس کے جھکنے سے اسلام کا سر جھکتا ہے وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں رحمت اور محبت وشفقت کا سرچشمہ ہوتی ہے ایثار ووفا کی شمع ہوتی ہے جو اپنے گھر کو ہمیشہ اپنے خون جگر سے منور رکھتی ہے مگر جب وہ گھر سے باہر قدم رکھتی ہے تو ہر قدم پر عظمت و وقار کے فرشتے اس کے قدموں کو چومتے ہیں اور غیرت وحمیت کی دیوی ان کے ہر نشان پا پر سجدے کرتی ہے اس کی چال میں شیرنی کا سا وقار ہوتا ہے اس کے ہر انداز میں عظمت ہوتی ہے اور اس کی ہر ادا میں آب کوثر جھلکتا ہے اس کی طرف اٹھنے والی ناپاک نگاہیں کانپ کانپ کر دم توڑ دیتی ہیں اور اس کی طرف اٹھنے والی ملعون انگشت کاٹ دی جاتی ہے۔ تاریخ نے ہمیشہ سچی مسلمان عورت کو اسی روپ میں دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ جہاں اس کے ایمان کے لیے خطرہ پیدا ہوا اس نے کوہ ہمالیہ کی عظمت ورفعت کو بھی شرمسار کر دیا ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی مختصر مگر تابناک حیات طیبہ کے نقوش کو غور سے دیکھئے وہی خاندان ہے جس کی وہ کبھی کنیز تھیں انہیں ترک اسلام پر مجبور کرتا ہے۔ کوئی ایسی سختی نہ تھی جو روا نہ رکھی گئی ہو مگر وہاں سے ایک ہی جواب بنتا ہے کہ اللہ ایک ہے

محمد ﷺ اس کے سچے رسول ہیں اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور یہ سَر صرف اسی کے سامنے جھک سکتا ہے جب کفار کے تمام حربے ناکام ہو گئے تو ان کے لیے یہ معمول بنا دیا گیا کہ جہنم کے شعلوں میں لپٹی ہوئی ریت پر اس بے بس عورت کو لوہے کی زرہ پہنا کر جسم کو پگھلا دینے والی دھوپ میں کھڑا کر دیا جاتا، جب وہ دھوپ کی شدت، آگ کی طرح تپتے ہوئے لوہے کی گرمی اور ریت کی آتش سامانی سے بلبلا اٹھتیں تو ان سے کہا جاتا ہے کہ اسلام ترک کر دو تب ہی اس دردناک عذاب سے رہائی مل سکتی ہے مگر بادۂ توحید کا نشہ اس ترشی سے بھلا کیسے اتر سکتا تھا۔ جو لوگ ریگ زار عرب کی شعلہ زائی اور وہاں کی جلا دینے والی گرمیوں کی دوپہر کو جانتے ہیں کچھ وہی حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا پر روا رکھے جانے والے مظالم کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں اس غریب اور بے بس عورت کے لئے یہ عذاب ایک دو دن کے لیے نہیں تھا روزانہ اسی طرح تختہ مشق بنایا جاتا تھا۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ اس عظیم المرتبت عورت نے بڑے صبر و استقلال کے ساتھ اس مصیبت کو برداشت کیا۔ اور ہمیشہ منہ سے نکلا تو یہی نکلا کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے سچے رسول ہیں۔ ایک روز سرکار دو عالم ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا اور حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو اس دردناک حالت میں دیکھا تو حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے درد و کرب سے لاپرواہ ہو کر بلند آواز میں کہا ''میں گواہی دیتی ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور آپ کا وعدہ سچا ہے'' آنحضرت ﷺ نے جواب فرمایا:

''آلِ یاسر! صبر کرو، اس کے عوض تمہارے لیے جنت ہے''۔

پوری دنیا کی تاریخ کیا ایک بھی ایسی صابر و شاکر اور پیکر عزم استقلال عورت کی مثال پیش کر سکتی ہے؟ جس کے گوشت و پوست کو روزانہ اس ظالمانہ طریقے سے جلایا جاتا ہو۔ اور اس کے پائے استقلال کو کبھی جنبش تک نہ ہوئی ہو۔ سمیہ رضی اللہ عنہا ایک سچی مسلمان خاتون تھیں۔ اور انہوں نے اپنے عمل سے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ جب

عورت حقیقی نصب العین کے نشے میں سرشار ہو جاتی ہے تو اس کا دل اللہ کے نور کا گہوارہ بن جاتا ہے اور وہ اپنے عزم و استقلال کی قوت سے سنگ و آہن کو آب آب کر دیتی ہے اس کے ایمان و ضمیر کو دنیا بھر کے خزانے اور زر و جواہر کے انبار بھی نہیں خرید سکتے۔ اور نہ کسی فرعون و ہامان کی بے پناہ طاقت اس کا سر جھکا سکتی ہے وہ بڑے تمکنت و وقار کے ساتھ دولت کو روندتی ہوئی گزر جاتی ہے پوری ثابت قدمی سے پہاڑوں سے ٹکرا جاتی ہے اور انتہائی صبر و استقلال کے ساتھ ظلم و تشدد کے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتی ہے وہ مٹ سکتی ہے نہ جھک سکتی ہے نہ بک سکتی ہے وہ کنیز ہو کر بھی شاہزادیوں اور رئیس زادیوں کے فخر و تفاخر کو اپنے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے خاک میں ملا سکتی ہے۔ یہی وہ بلند مرتبہ خواتین تھیں جنہیں دنیا کنیزیں سمجھتی تھی مگر ان کے آغوش تربیت سے جلا پا کر نکلنے والوں نے شہنشاہوں کی بساط حکمرانی الٹ کر رکھ دی یہی وہ مسلمان عورت تھی جس کے ہاتھوں نے ایک ایسی قوم کی تعمیر کی جس نے پوری انسانی دنیا کو ایک نئے سانچے میں ڈھال کر اپنے وجود کو تاریخ کا محور بنایا ہے۔

حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے مسلسل عذاب برداشت کیا ایک روز وہ اس مصیبت سے چھوٹ کر نڈھال صورت میں گھر واپس آ رہی تھیں کہ راستے میں انہیں دشمن اسلام ابو جہل مل گیا۔ اس نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو بے محابا گالیاں دینا شروع کر دیں اور انہیں دوبارہ کفر اختیار کرنے پر مجبور کرنے لگا کیونکہ وہ سب عاجز آ چکے تھے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی قوت ایمانی نے ان کے ظلم و جور کے تمام ہتھیار کند کر دیئے تھے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے بڑے پر عزم انداز میں وہی جواب دیا جس کی توقع ایک سچی مسلمان عورت سے ہو سکتی ہے۔ انہوں نے فرمایا: "برا ہو تیرا اور تیرے جھوٹے خداؤں کا"

ابو جہل صاف جواب سن کر غصے سے پاگل ہو گیا اور اس جہنمی نے پورے زور سے ان کے برچھی دے ماری اور سر راہ اس عظیم مجاہدہ اسلام کو شہید کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کے خاوند حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کر دیا۔

اے مسلمان عورتو! اس مومن عورت پر فخر کرو۔ اللہ کی راہ میں یہ پہلی شہادت تھی جس کا شرف ایک عورت کو نصیب ہوا۔ گلشن اسلام کو سب سے پہلے ایک مومن عورت کے پاک خون نے سیراب کیا۔ اور دنیا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اس کی بے مثل قربانی کو ملت اسلامیہ قیامت تک فراموش نہیں کر سکتی۔

جب حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کے لخت جگر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا۔ وہ خود بھی عاشق رسول تھے۔ مگر اپنی بلند فطرت ماں کے اس خون بے گناہ کا انہیں سخت افسوس ہوا۔ افسردگی کی حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یارسول اللہ! اب حد ہوگئی ہے رحمت دو عالم نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ انہیں صبر کی تلقین فرمائی اور ارشاد ہوا۔

”خداوندا! آل یاسر کو جہنم سے بچا۔

اس کے بعد جب غزوہ بدر میں ابوجہل قتل ہوگیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلا کر فرمایا۔

”عمار رضی اللہ عنہ! دیکھو تمہاری ماں کے قاتل کا خدا نے فیصلہ کر دیا۔“

ان کے نور نظر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو وہ درجہ نصیب ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو عمار رضی اللہ عنہ سے دشمنی رکھتا ہے وہ مجھ سے دشمنی رکھتا ہے“۔

اللہ کی ان گنت رحمتیں ہوں اور سلامتی ہو ان پاک نفوس پر جنہوں نے جادۂ حق پر چلنے والوں کے لیے اپنے مقدس خون کے نشانات منزل بنائے۔ آج حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کا خون شہادت ہماری ماؤں اور بہنوں کے لئے انمول اثاثہ حیات ہے وہ جب تک اس امانت کی قدر کریں گی خدا ان کی حفاظت کرے گا اور ان کے بھائیوں اور بیٹوں کے زریں کارناموں سے تاریخ کا دامن مالا مال ہوتا رہے گا اور عظمت ورفعت ہمیشہ ان کی چوکھٹ پر دربان بن کر موجود رہے گی۔

حضرتِ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا

> ”حق گوئی اور بے باکی کے اظہار میں کسی امیر و شاہ کی عظمت و جلالت اور شوکت و سطوت انہیں مرعوب نہ کر سکی۔ وہ جابر سلطان کے سامنے بھی کلمہ حق کہنے سے نہ ڈرتی تھیں۔“

عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں۔ اسماء نام اور ذات النطاقین لقب تھا۔ والدہ کا نام قتیلہ تھا۔ ہجرت سے ستائیس برس قبل مکہ میں پیدا ہوئیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کا حکم ملا تو حضور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اور انہیں حکم ربانی سے آگاہ کیا تو وہ بھی ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فوراً سامان سفر درست کیا ایک برتن میں چند دن کے لیے کھانا رکھ کر اوپر اپنا نطاق پھاڑ کر باندھ دیا۔ نطاق وہ کپڑا تھا جسے عورتیں کمر کے گرد لپیٹتی تھیں۔ اسی شرف کی وجہ سے آپ کا لقب ذات النطاقین مشہور ہوا۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا اور اسلام لانے والوں میں آپ کا اٹھارہواں نمبر ہے۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے بھی دوسری مسلمان خواتین کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی اور قبا میں قیام کیا۔ اسی جگہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے جنہوں نے جوان ہو کر بے پناہ شہرت اور ناموری حاصل کی آپ کی پیدائش پر

مسلمانوں نے بڑی خوشی منائی کیونکہ یہودیوں نے لوگوں کو قبولِ اسلام سے باز رکھنے کے لیے یہ مشہور رکھا تھا کہ مسلمانوں کے ہاں اولاد نہیں ہوگی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا عبداللہ رضی اللہ عنہ کو لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ننھے عبداللہ رضی اللہ عنہما کو گود میں لیا گھٹی میں لعابِ مبارک پلایا اور دعا فرمائی۔ اس لیئے سن بلوغت کو پہنچے تو محامد و محاسن کی ایک دلکش اور زندہ تصویر تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دی تھی۔ اس لیے اپنے بیٹے کے پاس ہی رہتی تھیں۔ انتہائی نیک، صابر و شاکر اور عبادت گزار تھیں۔ حد درجہ فیاض، سخی، متواضع اور خاکسار تھیں حق گوئی ان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی آپ سے چھپن احادیث مروی ہیں۔ بڑے بڑے بزرگ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شمار آپ کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔ لوگ آپ کو بزرگی اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے دعائیں پڑھوایا کرتے تھے۔ آخری عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ ۷۳ھ میں وفات پائی۔ اس وقت عمر سو برس کے قریب تھی۔ حق گوئی بے باکی اور تسلیم رضا میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا مقام بہت بلند ہے آپ نے تاریخ اسلام کے بدنام اور ظالم ترین حاکم حجاج کے مقابلے میں ایسی جرأت ایمانی، بے باکی اور صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے کہ آج ان واقعات کو پڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ایک عورت کی بہادری، جرأت اور صبر و شکر کی ان بلندیوں کو بھی چھو سکتی ہے۔ جہاں تک مردوں کے رہوارِ تخیل کا بھی گزر نہ ہوا ہو۔

بنو امیہ کا دور حکومت تھا۔ اور یزید بن معاویہ ایسا پیکر فسق و فجور شخص سلطنت اسلامیہ کا حکمران تھا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے نورِ نظر جناب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس کی بیعت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور مکہ کو دارالسلطنت قرار دے کر اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی عظمت اور جلالت کسی کی نگاہوں سے مخفی نہ تھی بہت جلد لوگوں کی بہت بڑی اکثریت نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی جب

عبدالملک بن مروان نے بہت سے صوبوں پر بزور شمشیر دوبارہ قبضہ کر لیا تو وہ ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو شکست دینے کے لیے حملہ آور ہوا۔ آپ نے بھی شامی فوج کے مقابلے کے لیے تیاری کی مگر اس وقت تک دشمن خانہ کعبہ کا محاصرہ کر چکا تھا۔ شامی فوجیں حجاج کے زیر کمان قرب و جوار کے تمام علاقوں کو فتح کر چکی تھیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ بیمار تھیں۔ پوچھا کیا حال ہے؟ فرمایا: بیمار ہوں۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انسان کو موت کے بعد ہی آرام ملتا ہے۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے یہ سن کر کہا کہ شاید تمہیں میرے مرنے کی آرزو ہے لیکن جب تک دو باتوں میں سے ایک نہ ہو جائے میں مرنا پسند نہ کروں گی۔ یا تو تم شہید ہو جاؤ اور میں تم پر صبر کر لوں یا فتح و نصرت حاصل کرو کہ میری آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی مومنہ اور بہادر ماں کا یہ حکم سن کر مسکراتے ہوئے واپس تشریف لے گئے۔ جب صورتحال بہت زیادہ نازک ہو گئی اور حضرت بن زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنی شکست کے نمایاں آثار نظر آنے لگے اور دشمن کی طرف سے صلح کی شرائط بھی پیش ہوئیں تو شہادت سے قبل دوبارہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا۔ اس وقت حضرت اسماء رضی اللہ عنہا مسجد میں تشریف فرما تھیں بیٹے کی گفتگو سن کر فرمایا:

> ”بیٹا قتل کے خوف سے ہرگز ایسی کوئی شرط قبول نہ کرنا جس پر تمہیں ذلت برداشت کرنا پڑے۔ خدا کی قسم۔ عزت کے ساتھ تلوار کھا کر مر جانا اس سے بہتر ہے کہ ذلت کے ساتھ کوڑے کی مار برداشت کی جائے۔“

اللہ اللہ یہ جرأت و استقامت کہ ایک عمر رسیدہ اور ضعیف ماں اپنے لخت جگر کو ایسے نازک موقعہ پر یہ نصیحت کر رہی ہے کہ موت کے خوف سے ذلت آمیز شرائط پر صلح

نہ کرنا۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ اپنی بہادر ماں کا یہ آخری فرمان سن کر واپس تشریف لے گئے اور جاتے ہی شرائط صلح کو رد کر کے انتہائی جرات و مردانگی کے ساتھ آخری دم تک لڑتے ہوئے میدان جنگ میں شہید ہو گئے حجاج نے آپ کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا تین دن گزرنے کے بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اپنی ایک کنیز کے ساتھ بیٹے کی لاش دیکھنے آئیں۔ یہ اسی صبر و رضا کے سانچے میں ڈھلی ہوئی مؤمن ماں کا حوصلہ تھا کہ مقتول بیٹے کی لاش کو سولی پر الٹا لٹکتے ہوئے دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا پھر بڑے استقلال کے ساتھ ظالم حجاج کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا "کیا اس سوار کے لئے ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ اپنے گھوڑے سے نیچے اترے"۔ اس کے بعد حجاج نے انہیں آدمی بھیج کر بلایا مگر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اس کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ اس نے پھر پیغام بھیجا کہ آ جائیں ورنہ آئندہ جو آدمی آئے گا وہ بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لائے گا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے گرج کر فرمایا کہ جاؤ کہہ دو کہ میں نہیں آسکتی۔ مجبوراً حجاج کو ان کی خدمت میں خود آنا پڑا۔ اس نے آتے ہی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو طنزاً یہ کہا کہ کہیے میں نے اپنے دشمن کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے بڑی متانت اور جرأت سے جواب دیا کہ تم نے ان کی دنیا بگاڑ دی اور انہوں نے تیری عاقبت خراب کی میں سنا ہے کہ تو ان کو طنزاً ذات النطاقین کا بیٹا کہتا ہے خدا کی قسم ذات النطاقین میں ہوں۔ میں نے نطاق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا باندھا تھا لیکن تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ثقیف میں ایک کذاب اور ایک ظالم پیدا ہوگا چنانچہ کذاب کو میں دیکھ چکی ہوں اور ظالم تو ہے حجاج یہ حدیث سن کر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد عبدالملک کا حکم پہنچا تو حجاج نے لاش اتروا کر یہودیوں کے قبرستان میں پھینکوا دی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنے سعادت مند اور بہادر بیٹے کی نعش گھر منگوا کر غسل دینے اور دفن کرنے کا انتظام کیا۔ تاریخ کی کتابوں میں

لکھا ہے کہ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کا ہر ایک جوڑ علیحدہ ہو چکا تھا جب غسل کے وقت کسی عضو کو ہاتھ لگاتے تو وہ ہاتھ کے ساتھ ہی چلا آتا تھا۔ یہ اندوہناک منظر بوڑھی ماں نے کس دل کے ساتھ دیکھا ہوگا خود حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اللہ سے یہ دعا کی تھی کہ جب تک عبداللہ رضی اللہ عنہ کی نعش نہ دیکھ لوں مجھے موت نہ آئے۔ چنانچہ اس حادثے کے ایک ہفتہ بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فوت ہو گئیں مگر آنے والی نسلوں کے لیے جرأت و ایثار اور اسلام سے محبت کی ایک چونکا دینے والی داستان چھوڑ گئیں جسے پڑھ کر آج بھی انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ اسلام کی تعلیم نے اپنے سائے سے ڈر جانے والی اور اولاد کی محبت میں ہر شئے قربان کر دینے والی کمزور عورت کو زندگی کی کس معراج تک پہنچا دیا تھا۔ دنیا میں ماں کی مامتا ایک ضرب المثل حیثیت رکھتی ہے لیکن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی عملی زندگی نے ایک مومن اور مسلمان ماں کو مامتا کا ایسا تصور بخشا ہے جو قوموں کی عظمت اور بقاء کی بہت بڑی ضمانت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ایسی مومن ماؤں کو اپنی اولاد سے محبت نہ تھی بلکہ اللہ اور رسول کی محبت کے سامنے وہ دنیا کی ہر محبت اور ہر دنیوی تعلق کو ہیچ سمجھتی تھیں حق گوئی اور بے باکی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی زندگی کا ایک نمایاں جوہر تھا۔ ان میں اس درجہ قوت ایمانی موجود تھی کہ وہ ظلم وجور کے سامنے حق بات کہنے سے نہ ڈرتی تھیں۔ انہیں کسی کی دولت، امارت اور شوکت وحشمت مرعوب نہ کر سکی۔ ایک روز حجاج بن یوسف نے ان سے کہا کہ تمہارے بیٹے نے خدا کے گھر میں الحاد پھیلایا تھا اس لئے خدا نے اس کو بڑا دردناک عذاب دیا ہے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فوراً جواب دیا:

"تو جھوٹا ہے وہ ملحد نہ تھا بلکہ صائم، پارسا اور شب زندہ دار تھا۔"

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا خلیفہ اول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے ساتھی اور منہ بولے بھائی کی بیٹی تھیں۔ مگر اپنے گھر کا کام خود کرتی تھیں۔ محنت ومشقت سے کبھی جی نہیں

چرایا۔ جب حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح ہوا تو زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک اونٹ اور ایک گھوڑے کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ گھوڑے کو خود دانہ کھلاتی، پانی بھرتی اور گھر سے تین فرلانگ دور جا کر چھوہاروں کی گٹھلیاں چن کر لاتی تھیں۔ غریبی کی وجہ سے ناپ تول کر خرچ کرتی تھیں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور فرمایا کہ خدا بھی تمہیں ناپ تول کر دے گا۔ اس کے بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے یہ عادت ترک کر دی۔ حد درجہ فیاض اور سخی تھیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے وفات کے وقت وراثت میں ایک جنگل چھوڑا تھا جو ان کے حصے میں آیا لیکن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اسے ایک لاکھ درہم میں فروخت کر دیا اور تمام رقم حاجت مندوں میں تقسیم کر دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معمول تھا کہ وہ مال جمع کرتی رہتی اور جب کافی رقم جمع ہو جاتی تو تقسیم کر دیتی تھیں۔ مگر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کل کے لیے کچھ نہ رکھتی تھیں بلکہ روزانہ جو کچھ ملتا خرچ کر دینے کی عادی تھیں۔ بہت بہادر اور دلیر تھیں۔ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب عام بدامنی کا دور شروع ہو گیا تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا ایک خنجر ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھیں۔ لوگوں نے پوچھا کہ اس کا کیا فائدہ ہے تو فرمایا کہ اگر کسی نے بری نیت سے میرے گھر کا رخ کیا تو اسی خنجر سے اس کا پیٹ چاک کر دوں گی۔

اسلام سے محبت اور شیفتگی کی یہ حالت تھی کہ ان کی حقیقی ماں قتیلہ کافرہ تھیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ انہیں طلاق دے چکے تھے۔ ایک بار قتیلہ اپنی بیٹی اسماء رضی اللہ عنہا کے لیے کچھ چیزیں بطور تحفہ لے کر آئیں لیکن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے یہ کہہ کر تحائف قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ آپ کافرہ ہیں۔ ماں کے اصرار پر آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صدیقہ کی وساطت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت حاصل کی تو آپ نے یہ تحائف قبول کرنے کی اجازت دے دی۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی زندگی میں مسلمان خواتین کے لیے نصیحت کی بیش بہا موتی پوشیدہ ہیں ایک سعادت مند اور توحید پرست بیٹی کی حیثیت سے انہوں نے ہجرت مدینہ کے وقت اپنے قابل فخر باپ کی امداد کی اور ان کے لیے سامان سفر درست کیا ان کا راز اپنے سینے میں چھپائے رکھا۔ بعد میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نابینا والد کو معلوم ہوا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ گھر کی پونجی بھی ساتھ لے گئے ہیں تو بہت برہم ہوئے۔ مگر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے تھیلی میں ٹھیکریاں بھر کر ان کے سامنے کر دیں تا کہ وہ خاموش ہو جائیں اور قبل از وقت ہجرت کا راز افشاں نہ ہو۔

شادی کے بعد انہوں نے ایک نیک، سلیقہ شعار، فرمانبردار اور احساس فرض رکھنے والی بیوی کے طور پر سخت محنت و مشقت میں کبھی بھی عار محسوس نہ کی اور شوہر کی غریبی کے باوجود ان کی ہر ممکن خدمت سرانجام دی انہیں اپنے شوہر کی طبیعت اور مزاج کا اس قدر پاس تھا کہ کبھی ان کو ناراض کرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ایک غریب سوداگر ان کے پاس آیا اور درخواست کی کہ اپنے سایہ دیوار کے نیچے سودا بیچنے کی اجازت بخش دیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سخت کشمکش میں مبتلا ہو گئیں۔ بذات خود بے حد فیاض اور کشادہ دل واقع ہوئیں تھیں۔ لیکن شوہر کی رضا کا بھی بہت خیال تھا۔ فرمایا اگر میں اجازت دے دوں اور زبیر رضی اللہ عنہ انکار کر دیں تو مشکل پڑے گی اس لئے بہتر یہ ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں آؤ اور مجھ سے سوال کرو ان کی اجازت کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ شخص دوبارہ اس وقت حاضر ہوا جب حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی گھر میں موجود تھے۔ اس نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اے ام عبداللہ! میں محتاج آدمی ہوں آپ کی دیوار کے سائے میں سودا سلف بیچنا چاہتا ہوں۔ بولیں کہ تم کو مدینہ بھر میں میرا ہی گھر دکھائی دیا ہے کوئی اور جگہ ڈھونڈ لی ہوتی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارا کیا بگڑتا ہے جو ایک غریب اور محتاج شخص کو

اپنی روزی کمانے سے بلا وجہ روکتی ہو۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا تو پہلے ہی اس کی امداد کرنا چاہتی تھیں چنانچہ اسے اجازت دے دی گئی۔ اگرچہ وہ بہت سخی اور فیاض تھیں لیکن شوہر کے مال کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہ تھا اور شوہر کے مال کو ان کی اجازت کے بغیر خرچ کرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ مجبوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی آمدنی میں سے کچھ صدقہ کردوں گی تو کوئی گناہ کی بات تو نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تو شوہر کی کمائی سے خیرات دینا شروع کی۔

ماں کی حیثیت میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا کردار ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے جب بھی مجاہدین اسلام کی بلند کردار ماؤں کا ذکر کیا جائے گا تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا نام کسی صورت فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

خدا ہماری بہنوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے نقش قدم پر چل کر دنیا کی تاریخ کو نئے عنوانات سے مزین کرنے کا باعث بن سکیں۔ ہمیں اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لیے ایسی ماؤں اور بیٹیوں کی ضرورت ہے جو بدترین حالات میں بھی صبر واستقلال، صدق وصفا، جرات ودلیری اور حق وصداقت کے چراغ روشن رکھ سکیں۔

حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا

> ''میں جنت میں گیا تو مجھ کو آہٹ معلوم ہوئی۔ میں نے کہا کہ کون ہے لوگوں نے بتایا کہ انس رضی اللہ عنہ کی والدہ غمیصاء بنت ملحان ہیں''۔ (حدیث)

آپ کا نام سہلہ تھا اور ام سلیم کنیت تھی۔ لوگوں میں غمیصاء کے لقب سے مشہور تھیں۔ آپ کے والد کا نام ملحان بن خالد اور والدہ کا ملیکتہ بنت مالک تھیں۔ پہلا نکاح مالک بن نضر سے ہوا شروع زمانے میں اسلام لائیں مگر آپ کے خاوند کفر ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ سہلہ نے اصرار کیا کہ وہ اسلام قبول کر لیں مگر وہ مسلسل انکار کرتا رہا۔ اسی وجہ سے میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو گئی تو مالک ناراض ہو کر شام چلا گیا اور وہیں انتقال کیا۔ اس کے کافی عرصہ بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ کو نکاح کا پیغام دیا مگر حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے یہ کہہ کہ نکاح سے انکار کر دیا۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ جس خدا کی تم پوجتے ہو وہ ایک درخت یعنی لکڑی کا بت ہے جو زمین سے اگا ہے اس کو فلاں حبشی نے لگایا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اگر تمہیں علم ہے تو کیا تمہیں اس کی عبادت کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ چند روز بعد ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا

کی موجودگی میں کلمہ توحید پڑھا۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب تم ان کے ساتھ میرا نکاح کردو۔ اس کے بعد یہ کہتے ہوئے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو مہر بھی معاف کردیا کہ میرا مہر اسلام ہے تاریخ اسلام میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور عجیب مہر ہے جو اسلام کی ایک شیدائی خاتون نے باندھا۔

نکاح کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیعت عقبہ میں شریک ہوئے اور مہاجر و انصار میں رشتہ اخوت قائم کرنے کے لئے تاریخی مجلس آپ ہی کے مکان میں منعقد ہوئی حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا غزوات میں جوش وخروش اور شوق کے ساتھ حصہ لیا کرتی تھیں۔ تاریخ کی کتب میں لکھا ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی کچھ خواتین اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو غزوات میں اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ یہ باہمت خواتین لوگوں کو پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کہ شکست یقینی نظر آرہی تھی تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا مشک بھر بھر کر پانی لا رہی تھیں اور زخمیوں کو پلا رہی تھیں۔ بہت دلیر اور بہادر خاتون تھیں۔ غزوۂ حنین میں لوگوں نے دیکھا کہ خنجر ہاتھ میں لئے کھڑی ہیں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ دیکھیے ام سلیم رضی اللہ عنہا خنجر لیے کھڑی ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ام سلیم رضی اللہ عنہا! اس سے کیا کرو گی۔ کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی مشرک قریب آیا تو اسے ہلاک کردوں گی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر مسکرا دیئے۔ علم وفضل میں بھی بہت ممتاز تھیں۔ لوگ ان سے مسائل پوچھا کرتے تھے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہ میں کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ہوگیا تو دونوں نے حضرتِ ام سلیم رضی اللہ عنہا کے فیصلے کو درست تسلیم کرکے قبول کرلیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ان کے مکان پر جا کر آرام فرمایا کرتے تھے بے حد صابر اور پرہیزگار تھیں جب ان کا لاڈلا بیٹا ابوعمیر فوت

ہوا تو انتہائی صبر وسکون سے کام لیا۔ گھر کے دوسرے لوگوں کو منع کر دیا کہ وہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اطلاع نہ دیں۔ جب رات کو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ گھر واپس آئے اور حسب معمول انہیں کھانا وغیرہ کھلایا اور اطمینان سے سو گئیں۔ کافی رات گزرنے کے بعد حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے باتوں باتوں میں اپنے خاوند سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص ادھار کے طور پر ایک چیز دے اور پھر اس کو واپس لینا چاہے تو کیا تم اسے واپس کرنے سے انکار کر دو گے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ اچھا تو پھر اپنے بیٹے ابوعمیر کی طرف سے صبر کیجئے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے کہ انہیں پہلے کیوں خبر نہ دی۔ صبح ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے بیٹے کی وفات کا واقعہ سنایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا نے اس رات تم دونوں کو بڑی برکت دی۔

حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت تھی اور عقیدت کا یہ عالم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک پر سے ٹپکنے والا پسینہ ایک شیشی میں جمع کر لیتی تھیں اور اسے محفوظ رکھتی تھیں اسی طرح ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مکان پر تشریف لائے تو گھر میں ایک مشکیزہ لٹک رہا تھا۔ آپ نے پیاس محسوس کی تو اس کا دہانہ اپنے دہانے مبارک سے لگا کر پانی نوش فرمایا۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے مشکیزے کا دہانہ کاٹ کر اپنے پاس بطور یادگار رکھ لیا۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو اپنی اولاد سے بھی بڑا پیار تھا اور ان کی تربیت و پرورش کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ جب ان کے پہلے شوہر فوت ہوئے اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بچے تھے تو انہوں نے عہد کر لیا کہ جب تک حضرت انس رضی اللہ عنہ اچھی طرح پرورش نہیں پا لیتے دوسرا نکاح نہیں کریں گی۔ چنانچہ انہوں نے طویل عرصہ بیوگی ہونے کے عالم میں بسر کیا۔ خود حضرت انس رضی اللہ عنہ ممنونیت کے انتہائی جذبے کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ اللہ میری ماں کو نیک جزا دے

کہ اس نے میری ماں ہونے کا پورا حق ادا کیا۔

فیاضی اور مہمان نوازی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے لیے دعوتوں کا انتظام کرنے میں بہت خوشی محسوس کرتی تھیں اور اپنے لئے اسے بہت بڑا شرف خیال کرتی تھیں۔

حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جس انداز میں دوسرا نکاح کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شادی بیاہ کے معاملات میں بھی وہ مال و دولت اور مرتبہ و وجاہت کو کوئی وقعت نہ دیتی تھیں بلکہ ان کا ہر قدم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اسلام کو تقویت دینے کے لیے اٹھتا تھا۔ ان کے نزدیک ذاتی اغراض اور آرام و آسائش بے معنی باتیں تھیں۔ عجب انقلاب زمانہ ہے کہ آج اکثر مسلمان خواتین کے نزدیک پابند دین و شریعت شخص محض اس لیے ناپسندیدہ ہوتا ہے کہ وہ ان کی آزاد خیالی کا ساتھ نہ دے سکے گا اور لوگ انہیں طعنہ دیں گے کہ اسے کوئی نئی تہذیب کا پروردہ خاوند نہیں مل سکا تو ایک مولوی سے شادی کر لی ہے۔ خدا کرے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے سے یہ پردے اٹھ جائیں اور ہم اس قابل ہو جائیں کہ اچھے برے نیک و بد میں تمیز سمجھ سکیں۔

حضرت اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا

"میں احد میں ان کو اپنے دائیں اور بائیں برابر لڑتے ہوئے دیکھتا تھا"۔ (حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم)

اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا آپ کی کنیت تھی۔ اصل نام نسیبہ تھا۔ قبیلہ خزرج کے بنو نجار میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام کعب بن عمرو تھا۔ پہلا نکاح زید بن عاصم سے ہوا۔ دوسری مرتبہ عربہ بن عمرو کے نکاح میں آئیں۔

حضرت اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا کو بیعت عقبہ میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہے ایک مرتبہ یہ افواہ پھیلی گئی کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جو مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر کفار کے پاس گئے تھے شہید کر دیئے گئے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام جانثار صحابہ سے یہ بیعت لی کہ وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون ناحق کا بدلہ لینے کے لیے آخر دم تک لڑیں گے اور اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ تاریخ اسلام میں اسے بیعت عقبہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس مبارک بیعت میں تہتر مردوں اور دو عورتوں نے حصہ لیا۔ ان میں ایک حضرت عمارہ رضی اللہ عنہا تھیں جس سے اسلام میں ان کی بزرگی اور عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جب کفار سے ٹکرانے کا نازک مرحلہ سامنے آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی بے سروسامانی اور افلاس کے

باوجود ان سے راہ خدا میں جانیں نچھاور کرنے کا عہد لیا تو اس وقت بہادر مسلمان خواتین نے مردوں سے پیچھے رہنا پسند نہ کیا بلکہ ان کے دوش بدوش آگے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں یہ عہد کیا کہ وہ کفار سے جنگ ہونے کی صورت میں اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کر دیں گی۔ اگرچہ یہ بظاہر بہت معمولی سا واقعہ ہے کیونکہ تاریخ اسلامی جرأت و شجاعت، صبر و استقلال اور عقیدت و محبت کے حیرت انگیز واقعات سے لبریز ہے۔ اور ان کے سامنے اس اہم واقعہ کی حیثیت بہت کم نظر آتی ہے لیکن بیعت عقبہ میں حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا اور ایک دوسری بزرگ خاتون کی شرکت نے اسلام میں عورتوں کو بلند حیثیت سے واضح کرنے کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جب بیعت عقبہ کا واقعہ پیش آیا اس وقت اسلام کا ابتدائی دور تھا مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور ان کی اکثریت غریب الوطنی افلاس و غربت اور بے سروسامانی کی حالت میں تھی مکمل سامان جنگ کی فراہمی تو ایک طرف رہی ان کے پاس روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زیادہ وسائل بھی نہ تھے ان چند نفوس قدسیہ کا وجود پوری دنیائے کفر و جہل کی آنکھ میں خار بن کر کھٹک رہا تھا۔ سرزمین عرب کا چپہ چپہ ان کے خون کا پیاسا تھا اور انہیں اللہ کے سوا کسی کی مدد و اعانت پر بھروسہ نہ تھا۔ ایسے حوصلہ شکن حالات میں معاً شہادت عثمان رضی اللہ عنہ کی افواہ پھیل جاتی ہے ظاہر ہے کہ اگر مسلمان خاموشی کے ساتھ اس ظلم اور بے انصافی کو بھی برداشت کر لیتے تو کافروں کے حوصلے بہت بلند ہو جاتے اور مسلمانوں کے لئے کوئی جائے عافیت باقی نہ رہتی۔ اس کے علاوہ کفار نے ایک مسلمہ بین الاقوامی روایت اور ایک تسلیم شدہ اصول کے خلاف ورزی کی تھی مسلمانوں کے سفیر پر ہاتھ اٹھایا گیا تھا۔ ان حالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قدم اٹھایا وہ ناگزیر تھا اور ایسے نازک موقع پر مسلمان خواتین نے مساوی حیثیت سے بیعت میں شریک ہو کر یہ ثابت کر دیا کہ کسی بھی قومی خطرے کے وقت

مسلمان خواتین کا مردوں سے پیچھے رہنا درست نہیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیعت کو قبول فرمایا اور ان کے مقدس عہد کو مساوی حیثیت دی گئی۔

حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا کو اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو دلی لگاؤ تھا اس کا اندازہ بیعت عقبہ میں ان کی شرکت سے کیا جا سکتا ہے حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی جانثار اور شجاعت و بہادری کا مرقع تھیں۔ غزوۂ احد میں انہوں نے جس بہادری اور پامردی سے دشمنوں کا مقابلہ کیا وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے اس جنگ میں جب تک مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا وہ مجاہدین کو پانی پلانے میں مصروف رہیں۔ لیکن جب اچانک چند مسلمانوں کی غفلت کے باعث جنگ کا نقشہ بدل گیا اور مسلمانوں کی شکست کے آثار صاف نظر آنے لگے تو حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا چشم زدن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلوار کھینچ کر سینہ سپر ہو گئیں۔ کیونکہ دشمن چاروں طرف سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیرے میں لے کر زبردست حملے کر رہے تھے اس وقت حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا کی تلوار بجلی کی طرح چمک چمک کر دشمنوں پر گرتی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پروانہ وار لڑ رہی تھیں اور چاروں طرف سے دشمنوں کے حملوں کو روک رہی تھیں آپ رضی اللہ عنہا نے اس جنگ میں شجاعت کا جو مظاہرہ کیا اس کا اعتراف خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''میں غزوۂ احد میں ان کو اپنے دائیں اور بائیں برابر لڑتے ہوئے دیکھتا تھا''۔

اسی جنگ میں ابن قمیہ جب بڑھتا ہوا سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور اس نے پورے زور کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ کیا تو اس وقت حضرت اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا نے بڑی بہادری سے آگے آ کر اس کے خوفناک وار کو روکا جس سے ان کے کندھے پر بہت گہرہ زخم آیا اور غار پڑ گیا۔ حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا نے یہ حملہ روک کر خود تلوار سے

ایک بھرپور حملہ کیا اور پھر بپھری ہوئی شیرنی کی مانند اس پر جا گریں۔ مگر ابن قمیہ کی دوہری زرہ پر یہ حملہ کارگر نہ ہوا۔ حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا خود یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

"احد کے دن میرے پاس ایک مشک تھی جس میں سے میں مسلمان مجاہدوں اور زخمیوں کو پانی پلا رہی تھی لیکن جب دشمن کی تلواروں کو بہت بلند ہوتے دیکھا تو میں مشک پھینک کر تلوار سنبھالی اور کفار سے جنگ شروع کردی۔ میں نے بہت سے کافروں کو قتل کیا اس لڑائی میں میرے جسم پر تیرہ زخم آئے جن میں سے ایک زخم تو ایسا کاری تھا کہ میں سال بھر اس کی مرہم پٹی کرتی رہی۔"

حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا اس لحاظ سے بہت ممتاز حیثیت رکھتی ہیں کہ بیعت عقبہ کے بعد انہیں ایک دوسری بڑی بیعت میں شرکت کا بھی شرف حاصل ہوا یعنی آپ رضی اللہ عنہا بیعت الرضوان میں شریک تھیں اور آپ کی شرکت نے دوسری بار اس حقیقت کی تصدیق کردی تھی کہ اہم ترین معاملات میں مسلمان عورت مردوں سے کم تر حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اسلام ان کی قوتوں اور صلاحیتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے تاریخ گواہ ہے کہ اسلام کی یہ باعظمت مجاہدہ فتح مکہ اور فتح خیبر کے مواقع پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہی اور اس نے کسی جگہ بھی مسلمان خواتین کی عظمت اور ان کے وقار کو سرنگوں نہیں ہونے دیا بلکہ ہر قدم پر ایسی روایات قائم کیں جو آج بھی شمع راہ بن کر جگمگا رہی ہیں۔

خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ایک شخص مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اور گمراہوں اور مشرکوں کا ایک بہت بڑا لشکر جمع کرلیا گیا۔ جب مسیلمہ کذاب سے جنگ ہوئی تو حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا کے لخت جگر حضرت حبیب رضی اللہ عنہ نے

مسیلمہ کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔ جب حضرت ام عمارہ رضی اللہ عنہا کو اپنے فرزند کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے یہ عہد کر لیا کہ یا تو وہ مسیلمہ کذاب کو قتل کر کے اپنے بیٹے کا قصاص لیں گی یا اس سے لڑتے ہوئے خود بھی شہادت کی سعادت حاصل کریں گی۔ اللہ اکبر! یہ ایک دلیر اور بہادر ماں کا عہد تھا انہوں نے اپنے اس عہد کو پورا کر کے مسلمان عورت کی رفعت و عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ وہ فوراً میدان جنگ میں پہنچ گئیں اور جنگ یمامہ میں اس جوان مردی سے دادِ شجاعت دی کہ دشمن بھی عش عش کرا اٹھے۔ اس جنگ عظیم میں مسیلمہ کذاب قتل ہوا۔ اور حضرت اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا نے بارہ زخم کھائے، جوش جہاد کا یہ عالم تھا کہ لڑتے لڑتے حضرت اُمِ عمارہ رضی اللہ عنہا کا ایک ہاتھ کٹ گیا مگر وہ اس سے بالکل بے پرواہ مسلسل مصروف پیکار رہیں ان کی وفات کے متعلق کوئی واضح روایت موجود نہیں بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ انہوں نے جنگ یمامہ میں زخمی ہو کر وفات پائی مگر اس کی تائید میں کوئی شہادت موجود نہیں ہے اس لئے اس کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

خوش نصیب ہے وہ قوم جن کی خواتین کا جذبہ ایمانی اس درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہو۔ ہماری عورتوں کو ان مبارک ہستیوں سے درس حیات لینا چاہئے کیونکہ یہی وہ قدسی نفوس ہیں جن کی زندگیوں میں عزت و وقار عظمت و شوکت فتح و کامرانی اور حیات جاوید کا راز پوشیدہ ہے۔ کاش ہماری قوم ایک ام عمارہ رضی اللہ عنہا اور پیدا کر سکے۔

حضرتِ اُمِّ عطیہ رضی اللہ عنہا

"عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سات غزوات میں شریک ہوئیں اور ہمیشہ نوحہ وبین کی مخالفت کے حکم پر سختی سے کاربند رہیں۔"

آپ کا نام نسیبہ تھا اور باپ کا نام حارث ہجرت سے قبل مشرف بہ اسلام ہوئیں مدینہ کی رہنے والی تھیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لائے تو تمام انصاری خواتین کو ایک مکان میں جمع کر کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بیعت لینے کی غرض سے بھیجا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق تمام مسلمان عورتوں سے مندرجہ ذیل شرائط پر بیعت لی۔

1. شرک نہ کریں گی یعنی خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی اور ایک خدا کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں گی۔
2. چوری اور بدکاری سے دور رہیں گی۔
3. اولاد کو قتل نہ کریں گی۔
4. کسی پر بہتان نہ باندھیں گی یعنی کسی پر جھوٹے الزامات اور بہتان لگانے سے بچیں گی۔
5. اچھی باتوں سے انکار نہ کریں گی سب مسلمان عورتوں نے نیت کے ساتھ ان

شرائط کو قبول کر لیا تو حضرت اُمِّ عطیہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا کہ اچھی باتوں سے ان کی کیا مراد ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نوحہ و بَین کے حکم کی تعمیل کرنا۔

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے اس حکم کو عمر بھر کے لیے پلے باندھ لیا اور نا صرف خود نوحہ و بین سے دامن بچایا بلکہ ہمیشہ دوسری عورتوں کو بھی سختی سے روک دیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ ان کا ایک لڑکا کسی جنگ میں شریک ہو کر ملک سے باہر گیا مگر وہاں بیمار ہو کر بصرہ میں رہ گیا جب حضرت اُمِّ عطیہ رضی اللہ عنہا کو صاحبزادے کی بیماری کا حال معلوم ہوا تو بڑی تیزی کے ساتھ بصرہ پہنچیں مگر وہ ان کے آنے سے دو روز پہلے فوت ہو چکا تھا۔ تیسرے دن آپ نے خوشبو منگوا کر لگائی اور فرمایا کہ شوہر کے علاوہ کسی کے لیے تین دن تک سوگ منانا درست نہیں۔ اس کے بعد آپ رضی اللہ عنہا نے مستقل طور پر بصرہ میں رہائش اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا اللہ اور اس کے احکام پر سختی سے کاربند رہتی تھیں۔ آپ کو بھی دوسری صحابیات کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کو نوحہ و بَین سے سخت نفرت تھی اور وہ اس کی آواز سننا بھی پسند نہ کرتی تھیں کیونکہ انہوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے دوسری مسلمان خواتین کے ساتھ اس کا امر کا عہد کیا تھا کہ وہ اس حکم پر سختی سے کاربند رہیں گی۔

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں سات لڑائیوں میں شریک ہونے کا شرف حاصل کر چکی تھیں اور اس لحاظ سے صحابیات میں بہت ممتاز حیثیت رکھتی تھیں اور اس کے علاوہ زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں۔

ہماری خواتین میں نوحہ و بَین کی وبا عام ہے اگر گھر میں کوئی فوت ہو جائے تو عجیب و غریب نوحوں سے عورتیں آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں بعض اوقات تو یہ نوحے کفرو

شرک کا پہلو لیے ہوتے ہیں جن سے یقیناً اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اور ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی ہوتی ہے اس میں شک نہیں کہ کسی عزیز یا رشتہ دار کی وفات پر صدمہ پہنچنا فطری امر ہے اور ایسے موقع پر بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہ نکلتے ہیں مگر اکثر عورتیں اس فطری حد کو عبور کر کے طرح طرح کے بین کرتی ہیں جن میں بناوٹ اور تصنع کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بلکہ پاکستان کے اکثر دیہات اور قصبوں میں تو اس انداز میں واویلا کرنا ایک رسم بن چکا ہے اس طرح کے نوحہ و بین سے انسان کے حقیقی جذبات کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ایسا کرنا اسلام کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ صبر و استقلال اور اللہ کی رضا پر سر جھکا دینا ہر مسلمان عورت اور مرد کا اولین وصف ہوتا ہے جیسا کہ حضرت اُمِّ عطیہ رضی اللہ عنہا کی زندگی سے ظاہر ہے کہ غم و اندوہ کے انتہائی مرحلے پر بھی انہیں احکام الٰہی کی تکمیل کا کس قدر خیال رہتا ہے۔ جوان سال بیٹے کی موت کا انتہائی غم بھی انہیں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی تعمیل سے باز نہیں رکھ سکا۔ درحقیقت یہ ہے کہ جو مسلمان عورت صبر و استقلال کے وصف سے محروم ہو وہ صرف نام کی مسلمان ہو سکتی ہے مگر اسے اسلام کی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا

> ''عمر اب جو جی میں آئے کر کے دیکھ لو میں تو اسلام لا چکی اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔''
>
> (فاطمہ بنت خطاب)
>
> ''جن کی ایمان افروز قرأت نے اسلام کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسا بطلِ جلیل دیا اور وہ قیامت تک لے لیے اپنی بہن کے احسان مند ہو گئے۔''

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن تھیں۔ باپ کا نام خطاب تھا کنیت ام جمیل مشہور تھی۔ سعید بن زید سے نکاح ہوا اور ان کے ساتھ ہی مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کو تاریخ اسلام میں یہ شرف حاصل ہے کہ ان کے صبر و استقلال اور ان کی تبلیغ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی اور اسلام کے بطل جلیل کو دائرہ اسلام میں آنے کی ترغیب دی اور ان کی پرسوز قرأۃ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے سخت مزاج اور بارعب انسان کا دل موم کر دیا۔ ہماری ملی تاریخ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ جب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان نہیں ہوئے تھے مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت چاروں طرف سے کفار مکہ کے نرغے میں گھری ہوئی تھی اور ستم رسیدہ حق پرست چھپ چھپ کر نماز ادا کیا کرتے تھے ایک روز مشرکین مکہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس درجہ کا مشتعل کر دیا کہ وہ

آنحضرت ﷺ کا سر مبارک قلم کرنے کی غرض سے انتہائی غصے کی حالت میں ننگی تلوار لے کر چل کھڑے ہوئے راستے میں ایک صحابی حضرت نعیم بن عبداللہ نے ان کے یہ خطرناک تیور دیکھے تو پوچھا اے عمر! کہاں کا قصد ہے؟ کہاں کے میں محمد ﷺ کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ انہوں نے بلا تکلف جواب دیا کہ محمد ﷺ کو بعد میں قتل کرنا پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا اور بہنوئی سعید رضی اللہ عنہ دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ طعنہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خون کھول اٹھا الٹے پاؤں بہن کے گھر پہنچے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس وقت تلاوت قرآن مجید میں مصروف تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قدموں کی چاپ سن کر خاموش ہو گئیں اور قرآن کے اوراق چھپا لیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاتے ہی غیظ و غضب کے عالم میں ڈانٹ کر پوچھا کہ کیا پڑھ رہی تھیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خاموشی اختیار کی۔ یہ حال دیکھ کر انہوں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیا اور انہیں اس قدر مارا کہ وہ لہولہان ہو گئیں۔ اس زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام کے بدترین مخالفین میں سے تھے ان کی دو کنیزیں حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت لبینہ رضی اللہ عنہا بھی مسلمان ہو چکی تھیں۔ انہیں اس قدر زدوکوب کرتے تھے کہ جب مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ میں نے رحم کھا کر نہیں چھوڑا بلکہ اس لئے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں۔ حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت لبینہ رضی اللہ عنہا کے بعد ان کی حقیقی ہمشیرہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ان کے عتاب کا شکار ہوئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصے کی حالت میں انہیں پیٹتے جا رہے تھے اور وہ کہتی جا رہی تھی عمر! اب جو کچھ بھی جی میں آئے کر کے دیکھ لو۔ میں تو اسلام لا چکی اور اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے جادۂ حق سے نہیں ہٹا سکتی۔ انہوں نے جب بہن کا یہ عزم و استقلال دیکھا اور دوسری طرف ان کے لہو سے تر بتر چہرے پر نگاہ پڑی تو دل پسیج گیا۔ کہا: اچھا جو کچھ پڑھ رہی تھیں مجھے بھی سناؤ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اسی وقت بڑے پُرسوز انداز میں قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جوں جوں قرآن سنتے جا رہے تھے ان کی حالت بدلتی جا رہی تھی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تاثیر سے بھرپور قرأۃ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دنیائے قلب ونظر میں ایک انقلاب برپا کر دیا ان کی آنکھوں سے غیظ وغضب کے شعلوں کی جگہ فرط ندامت سے آنسو بہ نکلے۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا: فاطمہ رضی اللہ عنہا! تو سچ کہتی ہے۔ خدا ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے نبی ہیں۔ اسی حالت میں دربار رسالت میں حاضر ہوئے اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا ظلم وتشدد کے حصار میں گھرے ہوئے بے بس ومجبور مسلمانوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام سے اتنی خوشی ہوئی کہ انہوں نے بے اختیار بلند آواز میں نعرہ تکبیر بلند کیا جس سے مکہ کی فضا گونج اٹھی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے پہلی مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار پر باہر نکل کر نماز باجماعت ادا کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام کی جو بے مثال خدمات انجام دیں اور مسلمانوں کو ان کی وجہ سے جو طاقت اور قوت نصیب ہوئی وہ کسی کے بیان کی محتاج نہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف بھی لازمی ہے کہ مسلمانوں کو یہ انمول دولت دینے میں حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کا بہت بڑا حصہ ہے جسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو ابن خطاب سے امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے لقب تک پہنچے جن کی قوت ایمانی اور ذہانت وقابلیت نے قیصر وکسریٰ کی عظمت وسطوت کو خاک میں ملا کر دنیا بھر کی تقدیر کو دگرگوں کر دیا جن کے متعلق آج بھی غیر مسلم مورخین یہ کہتے ہیں کہ اگر اسلام کو ایک عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور مل جاتا تو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلمان ہی نظر آتے۔ اس بطل عظیم کی دنیائے فکر ونظر کو ایک عورت کی استقامت اور صداقت پرستی نے حیرت انگیز انقلاب سے آشنا کر دیا۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ جس کی ہیبت اور جرأت وشجاعت سے بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے تھے ایک عورت کے جذبہ صادق کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔

ہماری بہنوں اور بیٹیوں کے لئے مقام فکر ہے۔انہیں سوچنا چاہیے کہ آخر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس وہ کون سی طاقت تھی جس نے وقت کے ایک سخت مزاج اور پتھر دل انسان کو عفو و حلم اور تسلیم و رضاء کے سانچے میں ڈھل جانے پر مجبور کر دیا آخر اس نیک سیرت خاتون کے الفاظ میں کیا جادو اثر تھا کہ ایک ایسا شخص جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلا اور اس عزم کے ساتھ سب کے سامنے روانہ ہوا کہ وہ پیغمبر اسلام کا سر قلم کر کے لائے گا جب واپس آیا تو اس کا دل نور الٰہی سے منور ہو چکا تھا۔اور وہ مسلمانوں کا سب سے بڑا حمایتی تھا۔اسی کی تلوار، بے بس و مجبور مسلمانوں کے لئے ڈھال بن چکی تھی۔اس حیرت انگیز اور عجیب و غریب انقلاب کے پس پردہ ایک بلند کردار عورت کا ہاتھ کارفرما تھا۔ایک ایسی خاتون جس کے رگ و پے میں اسلام کی محبت سرائیت کر چکی تھی جس کی زندگی اور موت صرف اللہ کے لئے تھی حضرت فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کے پاس ایمان کی دولت تھی یہی وہ طاقت تھی جس نے غیظ و غضب کے پہاڑ کو ذرات ریگ میں تبدیل کر دیا۔یہی وہ جادو تھا جس نے خون آشام آنکھوں سے ندامت کے آنسوؤں کا چشمہ جاری کر دیا اور یہی وہ قوت تھی جس نے ظلم و قساوت اور سنگ دلی کے پیکر کو سراپا محبت اور رحمت بنا کر دنیا کی تاریخ کا رخ بدل دیا آج درومند مسلمانوں کی نگاہیں کروڑوں مسلمان خواتین کی بھیڑ میں ایک فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کو ڈھونڈ رہی ہیں جو اسلام کو ایسے مایۂ ناز بھائی دے سکیں۔ جو ایک بار پھر تاریخ کو مجبور کر دیں کہ وہ اپنے کو اسی انداز میں دہرائے۔

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا

"وہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) تم سے زیادہ مستحق نہیں ہیں۔
عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کی صرف ایک ہجرت ہے اور تم
اہل کشتی کی دو ہجرتیں ہیں۔" (حدیثِ رسول)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا قبیلہ قنانہ سے تھیں۔ باپ کا نام عمیس اور والدہ ہند بنت عوف تھیں۔ آپ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بھائی جعفر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں۔ شروع زمانہ میں اسلام قبول کیا اسلام میں سب سے پہلے کفار کے مسلسل جور وستم سے تنگ آکر مسلمانوں نے جو ہجرت کی وہ ہجرت حبشہ تھی۔ اس ہجرت میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر نامدار حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہما کے ساتھ پہلی ہجرت کی اور فتح خیبر تک وہیں قیام فرمایا۔ جب خیبر فتح ہوا تو سب لوگ ایک ساتھ واپس آئے اور خیبر کے مقام پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو بھی مال غنیمت میں سے حصہ دیا اس قافلے میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں واپسی کے بعد ایک روز آپ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات کرنے گئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی وہیں تشریف لے آئے حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو دیکھ کر پوچھا یہ کون ہیں؟ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ یہ اسماء بنت

عمیس رضی اللہ عنہا ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ خوب یہ حبشیہ ہیں۔ یہ سمندر کی رہنے والی ہیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے جواب دیا ہاں میں وہی ہوں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے آپ سے پہلے ہجرت کی ہے ہم آپ سے زیادہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستحق ہیں یہ سن کر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو بہت رنج ہوا اور کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ! آپ غلط کہتے ہیں۔ خدا کی قسم آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے اور آپ کے جاہل کو نصیحت کرتے تھے اور ہم حبش کی دور افتادہ مبغوض سر زمین پر پڑے تھے ہم کو تکالیف دی جاتی تھیں ہم ہر وقت ڈرے اور سہمے رہتے تھے اور یہ سب کچھ صرف خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لیے تھا۔ خدا کی قسم آپ نے جو کہا ہے میں جب تک اس کا ذکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ کروں گی نہ کھانا کھاؤں گی نہ پانی پیوں گی۔ خدا کی قسم کسی قسم کا جھوٹ نہیں بولوں گی۔ کجروی اختیار نہ کروں گی اور اس بات میں کوئی اضافہ نہ کروں گی۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بیان فرمایا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا وہ تم سے زیادہ میرے مستحق نہیں ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ اور ان اصحاب کی صرف ایک ہجرت ہے اور تم اہل کشتی کی دو ہجرتیں ہیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اور مہاجرین حبشہ جوق در جوق یہ حدیث سننے کے لیے میرے پاس آئے تھے اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ تو بار بار یہ حدیث سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ کیونکہ ان بزرگوں کے نزدیک زمین و آسمان پر اس سے بڑی نعمت کیا ہو سکتی تھی۔ ان کے قلوب عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ اور ان کے لیے انتہائی سعادت تھی کہ شہنشاہ کونین کے قریب انہیں امتیاز حاصل ہو۔ ۸ھ میں جنگ موتہ میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو ماتم سے منع فرمایا اور تیسرے دن بہ نفس نفیس تشریف لا کر ممانعت کر دی۔ چھ ماہ بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا دوسرا نکاح حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہوا جن سے دو برس بعد محمد بن ابوبکر پیدا ہوئے۔ ۱۳ھ میں جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما فوت ہوئے تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ ۴۰ھ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وفات پائی۔

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے ساٹھ کے قریب احادیث مروی ہیں۔ انہیں یہ شرف بھی حاصل تھا کہ انہوں نے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام کی تعلیم حاصل کی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکثر ان سے خوابوں کی تعبیر دریافت کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرض الموت میں انہوں نے بیماری کی تشخیص کی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دوا تیار کر کے پلائی تھی۔ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کی زندگی کا نمایاں وصف یہ ہے کہ انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عقیدت تھی ہجرت حبشہ کے واقعہ کے سلسلہ میں محض اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کی تکرار ہوئی کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھا۔ اپنی اسی فضیلت پر انہیں عمر بھر ناز رہا۔

حضرتِ ام حکیم رضی اللہ عنہا

> ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ام حکیم کی اس خدمت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ ان کی کوشش سے عکرمہ بن ابی جہل مسلمان ہوئے۔'' (موطا امام مالک)
>
> ''جن کی توحید پرستی نے خانہ ابوجہل میں ایمان اور شجاعت کی شمع روشن کی۔''

تاریخ میں اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا کے نام سے مشہور ہیں۔ باپ کا نام حارث بن ہشام تھا اور والدہ فاطمہ بنت الولید تھیں۔ حضرت خالد بن ولید ان کے حقیقی ماموں تھے ابوجہل کے بیٹے عکرمہ سے شادی ہوئی تھی۔

شروع میں اسلام کی سخت دشمن تھیں کیونکہ اسلام دشمنی ان کے گھر کا سب سے بڑا امتیاز بن چکی تھی۔ غزوہ احد میں کفار کے ساتھ شریک تھیں۔ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا مگر ان کے شوہر عکرمہ بن ابی جہل خوف کی وجہ سے یمن کی طرف فرار ہو گئے۔ حضرت اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا نے خود بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر اپنے شوہر کے لیے امان کی درخواست پیش کی۔ رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلے ہی تمام دشمنوں کے لیے معافی کا اعلان کر چکے تھے اُمِ حکیم کی خواہش پر عکرمہ کو بھی امان مل گئی۔ چنانچہ اُمِ

حکیم رضی اللہ عنہا نے خود یمن کا قصد کیا اور عکرمہ کو ساتھ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عکرمہ کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے۔ عکرمہ نے خلوص نیت سے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دامن سے اسلام دشمنی کا داغ مٹانے اور گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی غرض سے تمام غزوات میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور ہر موقع پر بہادری اور شجاعت کا قابل تعریف ثبوت دیا۔ جب خلیفہ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رومیوں سے جنگ چھڑ گئی تو حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا کے ساتھ لشکر اسلامی میں شامل ہو گئے۔ اور اجنادین کے معرکہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا نے عدت پوری کرنے کے بعد خالد بن سعید بن العاص سے نکاح کر لیا۔ آپ کا دوسرا نکاح دمشق کے قریب ہوا تھا جہاں ہر وقت رومیوں کے حملے کا خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر سے کہا کہ رسم عروسی کو سر دست ملتوی کر دیا جائے۔ مگر خالد رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے اس جنگ میں شہادت کا پورا یقین ہے اس لئے میں رسم عروسی کو ملتوی کرنا پسند نہیں کرتا چنانچہ ایک پُل کے قریب یہ رسم ادا ہوئی یہ پل ابھی تک قنطرۂ اُمِ حکیم کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی ابھی لوگ بمشکل دعوتِ ولیمہ سے فارغ ہی ہو پائے تھے کہ رومی فوج نے حملہ کر دیا اور قرب و جوار کی فضا تلواروں کی جھنکار سے گونج اٹھی۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ معاً ہتھیار سجا کر میدان جنگ میں نکلے اور داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ جب حضرت اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا کو اس سانحہ کی اطلاع ملی تو وہ شیر دل دلہن بپھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت تلوار تو نہ مل سکی اپنے خیمے کی چوب اکھاڑ کر جدید طرز کے اسلحہ جنگ سے لیس رومیوں پر ٹوٹ پڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سات رومی سپاہیوں کو موت کی گہری نیند سلا دیا۔

اس بہادر خاتون کی زندگی میں ہمارے لیے یہ درس پوشیدہ ہے کہ ایک مسلمان

عورت جہاں بھی ہو اور جس حالت میں بھی ہو وہ اپنی غیرت اور حمیت کا عملی ثبوت دینا خوب جانتی ہے۔ وہ اگر دلہن کے لباس میں بھی ہو تو اس حالت میں بھی اپنے فرض سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہیں رہتی اور وہ سہاگ کو چوڑیوں کو پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیتی۔ مسلمان زندگی کے میدان میں مجاہد بن کر جیتا ہے اور اس کی شریک حیات کسی صورت میں شرف جہاد سے محروم رہنا گوارہ نہیں کرتی جب اسے فرض پکارتا ہے تو دنیا کی محبت اور تعلقات کی کشش اس کے راستے میں دیوار بن کر حائل نہیں ہو سکتی خدا کرے ہماری خواتین میں یہی جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ زندگی کے چمن زار کو میدان جہاد سمجھ کر جینے کا قرینہ سیکھ جائیں۔

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا

> ”جنہوں نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسلمان خواتین کی نمائندگی کا فرض ادا کر کے ایک اہم معاشرتی مسئلے کی تشریح کرائی۔“

آپ کا نام اسماء اور کنیت ام سلمہ تھی۔ باپ کا نام یزید بن السکن تھا۔ ہجرت کے بعد اسلام لائیں ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جمعیت کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا چند دوسری عورتوں کے ساتھ بیعت کی غرض سے تشریف لائیں اور انتہائی ادب واحترام کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی۔

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں مسلمان عورتوں کی طرف سے ایک پیغام لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اذن پا کر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عورتوں اور مردوں کو صراطِ مستقیم پر چلانے کے لیے مبعوث کیا ہے۔ ہم آپ کے احکام پر دل وجان سے عمل کرتی ہیں۔ اور ہم سب آپ پر سچے دل سے ایمان لائی ہیں۔ لیکن ہماری کیفیت مردوں سے بالکل مختلف ہے ہم عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے نماز باجماعت اور نماز جمعہ میں شریک ہونا مشکل ہوتا ہے۔ مردوں کو

یہ سعادت حاصل ہے کہ وہ مریض کی عیادت کے لیے جاتے ہیں نماز جنازہ میں شریک ہوتے ہیں۔ ہر سال حج کا فریضہ ادا کرنے جاتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت حاصل کرتے ہیں اور ہم ہیں کہ گھروں میں بیٹھ کر اولاد کی پرورش کرتی ہیں مردوں کی غیر حاضری میں گھروں کی حفاظت کرتی ہیں اور کپڑا تیار کرنے کے لیے چرخہ کاتتی ہیں۔ بھلا اس صورت میں ہمارے لئے حصول ثواب اور سعادت کا کیا موقع نکل سکتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی یہ گفتگو سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تم نے کسی عورت سے ایسی باتیں سنی ہیں سب نے جواب دیا کہ نہیں۔ آج اسماء رضی اللہ عنہا سے سننے کا اتفاق ہوا ہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ عورت کے لیے شوہر کی رضا جوئی تمام دوسری باتوں پر مقدم ہے اگر وہ ٹھیک طریقے سے اپنے تمام فرائض زوجیت ادا کرتی ہیں۔ اور اپنے شوہر کی مرضی پر چلتی ہیں تو اس کے شوہر کو جتنا ثواب ملتا ہے عورت کو بھی اسی قدر ملتا ہے۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب خواتین سے زبانی چند اقرار لئے اور بیعت لینے کی رسم ادا فرمائی تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے فرمایا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دست مبارک بڑھایئے ہم بیعت کرتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کو بھی دوسری صحابیات کی مانند سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ ہر وقت آپ کی خدمت اقدس میں حاضر رہ کر خدمت کرنا ان کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس اونٹنی پر سوار تھے اس کی مہار تھامے جا رہی تھیں کہ اسی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی۔ ان سے روایت ہے کہ وحی کا اتنا بوجھ تھا کہ مجھے ڈر محسوس ہونے لگا کہیں اونٹنی کے پاؤں نہ ٹوٹ جائیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بے حد مہمان نواز تھیں اور اللہ کے قہر سے بہت ڈرتی

تھیں بے حد ذہین اور نیک دل تھیں ان کی تیز فہمی کا اندازہ اس گفتگو سے ہو سکتا ہے جو بیعت کے موقع پر آنحضرت ﷺ سے ہوئی تھی۔

بظاہر حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بنت یزید کی یہ گفتگو چنداں اہم معلوم نہیں ہوتی مگر آج کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے سوالات اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر غور کیا جائے تو ہمیں کئی ان الجھنوں کا حل بھی مل جاتا ہے جو آج کل لوگوں کے لئے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ بعض لوگوں کی طرف سے آج بھی اسی قسم کے اعتراضات کئے جاتے ہیں اور قدرے مختلف الفاظ میں اسلام کے معاشرتی نظام کو عدم مساوات پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے نہایت واضح اور فیصلہ کن انداز میں شریعت کا یہاں مقصد اور منشاء یہاں واضح فرمایا ہے کہ پر امن حالات میں ایک مسلمان عورت کے فرائض کیا ہیں کہ ان فرائض کی اہمیت ان امور سے کسی طور کم نہیں جو مرد انجام دیتے ہیں جہاں تک عورت کے معاشرتی فرائض کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ پر اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور اجر ثواب کے معاملے میں عورت مساوی طور پر اس میں شریک ہے اس سے اس کی عظمت وقار اور مرتبے پر کوئی کمی نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک تقسیم کار کا اصول ہے جسے فطرت نے خود وضع کر دیا ہے۔ زمانہ خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس زندہ حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے:

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

شاعرۂ اسلام حضرتِ خنساء رضی اللہ عنہا

> ''خنساء رضی اللہ عنہا کی ہم پلہ کوئی خاتون شاعرہ پیدا نہیں ہوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک ان کے اشعار سنتے رہے اور تعجب کرتے رہے۔''
>
> ''تمام علمائے شعر و ادب نے تسلیم کر لیا ہے کہ خنساء رضی اللہ عنہا کے برابر کوئی شاعرہ پیدا نہیں ہوئی۔'' (اسد الغابہ)

آپ کا اصل نام تماضر تھا مگر خنساء کے لقب سے مشہور تھیں باپ کا نام عمرو بن الشرید تھا۔ وہ قبیلہ قیس کے خاندانِ سُلیم سے تھے پہلا نکاح ایک شخص رواحہ بن عبدالعزیٰ سے ہوا ان کے انتقال کے بعد مرداس بن ابو عامر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تو اس کی صدائے بازگشت چاروں طرف سے سنائی دینے لگی۔ نجد میں بھی بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پہنچی تو حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کی جویائے حق و صداقت طبیعت میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ اس وقت آپ سرزمین عرب کی ممتاز اور بلند مرتبہ شاعرہ تسلیم کی جاتی تھیں اور آپ کے بے مثل فصاحت و بلاغت کا ہر طرف چرچہ تھا اگرچہ لیلائے اخیلیہ کو شعرائے عرب نے شاعر خواتین کی سردار تسلیم کیا ہے مگر حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کو اس سلسلے میں ہمیشہ مستثنیٰ رکھا جاتا تھا۔ ایام جاہلیت میں عکاظ کے مقام پر عرب ایک بہت بڑا قومی میلہ مناتے تھے اور سرزمین عرب کے تمام شعرائے اس میلے میں شرکت کے لئے جمع ہوتے تھے اس لحاظ

سے عکاظ بازار شعرائے عرب کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا اس میلے میں حضرت خنساء رضی اللہ عنہا بھی شرکت کرتی تھیں اور ان کے خیمے کے سامنے ایک جھنڈا لہرایا کرتا تھا جس پر ''ارثی العرب'' یعنی عرب کی عظیم مرثیہ گو کے الفاظ لکھے ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت خنساء رضی اللہ عنہا نے اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر نابغہ کو اپنا کلام سنایا تو وہ بے اختیار بول اٹھا کہ اگر میں نے ابو نصیر اعشیٰ کا کلام نہ سنا ہوتا تو تجھے شاعرۂ عالم تسلیم کرتا اس سے حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کا ادبی اور علمی مرتبہ صاف ظاہر ہے۔ انہیں عرب کے طول و عرض میں قابل رشک احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور شہرت ناموری ان کے گھر کی کنیز تھی۔ قبیلہ قیس بجا طور پر ان کی ذات گرامی پر فخر کرتا تھا۔ اور انہیں اپنے لیے سرمایۂ عزت و عظمت خیال کرتا تھا۔ عرب کی یہ ملکہ شعر و سخن اپنی بلند حیثیت اور فقید المثال شہرت و ناموری کے باوجود بے حد حساس، نرم دل اور حقیقت کی متلاشی تھیں وہ صحیح معنوں میں ایک عظیم فن کار تھیں اس لیے ان کی گہری نگاہ ہر وقت خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی تھی ان کے دل کی پیاس کسی طرح نہ بجھتی تھی جب انہوں نے پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی خبر سنی تو ان کے دل نے بے اختیار شہادت دی کہ جس نورانی صبح کے طلوع کا انتظار تھا وہ ظاہر ہو گئی ہے چنانچہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا مگر قبیلے کے بزرگ افراد کی شدید مخالفت نے انہیں اپنا ارادہ ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے باوجود دعوت حق کی کشش ان کے لیے ہمیشہ قائم رہی اور وہ ہمیشہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں رہنے لگیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لائے تو حضرت خنساء رضی اللہ عنہا بھی اپنے قبیلے کے چند سمجھدار لوگوں کے ساتھ دربارِ رسالت میں حاضر ہوئیں اور خلوص دل کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیر تک ان کے پر تاثیر اشعار سنتے رہے اور حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کی ادبی صلاحیتوں اور فصاحت و بلاغت پر

حیرت کا اظہار فرماتے رہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شعراء اور دیگر اہل قلم لوگ عملی میدان میں دوسروں سے بہت پیچھے ہوتے ہیں لیکن عورت ہونے کے باوجود حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کی زندگی اس خیال کی تردید کرتی ہے حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کو اسلام سے والہانہ عشق تھا اور انہوں نے مسلمان ہوتے ہی اپنی باقاعدہ زندگی دین کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ اپنی تمام دولت اللہ کی راہ میں لٹا دی وہ ایک بلند مرتبہ اور عظیم شاعرہ تھیں مگر اس کے ساتھ ہی دلیری، شجاعت میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب جنگ قادسیہ شروع ہوئی اور مسلمان جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر جوق در جوق اسلامی لشکر میں شامل ہونے لگے تو حضرت خنساء رضی اللہ عنہا اپنی پیرانہ سالی کے باوجود یہ سوچ کر بے تاب ہو گئیں کہ وہ بڑھاپے کے باعث خود شرکت جہاد سے قاصر ہیں مگر انہوں نے اپنی مجبوریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے چاروں جوان سال بیٹوں عبداللہ، زید، معاویہ اور عمرو سمیت اسلامی فوج میں شامل ہو گئیں اور اپنے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پروانہ وار میدان جنگ میں جا پہنچیں۔ جب طبل جنگ کی آواز سنائی دی اور اسلامی فوج دشمن کے مقابلے کی خاطر صف بستہ ہو گئی تو زبان و بیان کی اس شہزادی اور الفاظ کی خوبصورتی سے کھیلنے والی اس ملکہ سخن نے ایک سچی مسلمان ماں کے روپ میں اپنے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

”پیارے بیٹو! تم نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا اور برضا و رغبت ہجرت اختیار کی ہے ورنہ تم اپنے ملک کے لئے بوجھ نہ تھے اور نہ تمہارے وطن میں قحط پڑا تھا۔ اس کے باوجود تم اپنی بوڑھی ماں کو یہاں لائے ہو اور فارس میں ڈال دیا ہے خدا کی قسم! تم ایک ماں اور باپ کی اولاد ہو۔ میں نے تمہارے باپ سے خیانت نہیں کی اور نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا ہے تم

جانتے ہوں کہ دنیا فانی ہے اور کفار سے جہاد کرنے میں بڑا ثواب ہے۔ اب لڑنے کی تیاری کرو اور آخر وقت تک لڑو۔"

اپنی عظیم المرتبت ماں کی یہ نصیحت سن کر چاروں بیٹے ہتھیار سجا کر میدان جنگ میں نکلے انہوں نے اتنی بہادری اور جوانمردی سے دشمنوں کا مقابلہ کیا کہ دیکھنے والے تصویر حیرت بن گئے۔ باری باری یہ چاروں راہ خدا میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ بوڑھی پردیسی ماں نے جب یہ خبر سنی تو سجدہ شکر بجالائی۔ اسلام کے دامانِ رحمت میں آنے کے بعد یہ ایک مسلمان شاعرہ کا کردار تھا جو ایام جہالت میں بھی اپنے بھائی کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکی تھی اور عرصہ دراز تک دیوانہ وار انتہائی دردناک مرثیے پڑھ کر خود بھی روتی رہی اور دوسروں کو بھی رلاتی رہی۔ اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے چاروں حقیقی بیٹے اللہ کو پیارے ہوئے مگر اسلام کی تعلیم اور اس حساس اور نرم دل شاعرہ کو صبر واستقامت کے ایسے سانچے میں ڈھال دیا تھا کہ اس کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہ ٹپکا۔ اس نے نالہ وشیون سے آسمان سر پر نہیں اٹھایا اور غم واندوہ کی انتہائی شدت۔ سے مجبور ہو کر واویلہ نہیں کیا تھا حالانکہ اس کے سینے میں ایک شاعرہ کا دل تھا اس نے وہی کیا جس کی توقع ایک سچی مسلمان ماں سے ہو سکتی ہے۔ رونے پیٹنے اور نوحہ وبین کی جگہ اس صابر خاتون نے اپنے پروردگار کے حضور سجدے میں گر کر شکر ادا کیا اور خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی کہ اللہ اس کی حقیر سی قربانی کو قبول فرمالے۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا نے ۲۴ھ میں وفات پائی۔ مرثیہ گوئی کی صنف میں انہیں ہمیشہ کی خصوصیات حاصل رہی ہے اور دنیا بھر کے سخنوروں نے ہمیشہ اس پر اتفاق کیا ہے کہ حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کے برابر کوئی شاعرہ پیدا نہیں ہوئی۔ آپ نے بہت بڑی تعداد میں مرثیے کہے ہیں اور ان کا ایک ضخیم دیوان آج بھی موجود ہے جس کا ترجمہ

یورپ کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کو یہ شرف حاصل ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے شعر و سخن کی خداداد صلاحیتوں کو دین قیم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان کا کلام سنا اور ان کی فصاحت کی تعریف فرمائی۔ آپ نے حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کو شاعری سے منع نہیں فرمایا بلکہ ان کی قدر فرماتے رہے۔

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کی زندگی ہماری ان بہنوں کے لیے درس موعظت ہے جو اپنی معمولی صلاحیتوں کے اظہار پر قادر ہوتے ہی اعتدال کی راہ سے ہٹ جاتی ہیں۔ ان میں ایک باوقار عجز اور انکسار کی جگہ رعونت پیدا ہو جاتی ہے اور شعائر اسلامی سب سے پہلے ان کی طبع آزمائیوں کا ہدف بنتے ہیں حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کی زندگی کا مطالعہ کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ اپنے دور کی ممتاز ترین اور مشہور و نامور اور بلند پایہ شاعرہ ہونے کے باوجود کتنی جلدی حق و صداقت کی طرف مائل ہوئیں اور کس جوش و خروش کے ساتھ انہوں نے دعوت حق کو قبول کیا۔ اس کے بعد ان کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب پیدا ہو گیا کہ آج ہم اس کے تصور سے حیران ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے تمام شاعرانہ قباحتوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی تمام زندگی اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دی اور اس کے لئے اتنی بڑی قربانی پیش کر دی کہ انسان اس حد سے آگے جا نہیں سکتا۔ انہوں نے اپنی تمام دولت راہ حق میں لٹا دی چاروں بیٹے اللہ کے نام پر قربان کر دیے اور خود عمر بھر اسلام کی خدمت گزار بن کر زندہ رہیں۔

مُبلّغہ اسلام حضرت اُمِّ شریک رضی اللہ عنہا

"اُمِّ شریک رضی اللہ عنہا آغاز اسلام میں مخفی طور پر قریش کی عورتوں کو اسلام کی دعوت دیا کرتی تھیں۔" (اسد الغابہ)

تاریخ میں اپنی کنیت ام شریک رضی اللہ عنہا سے مشہور ہیں۔ شروع زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول فرمایا۔ حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا نے انتہائی خطرناک حالات میں اسلام کی قابل قدر خدمات سر انجام دیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب مکہ کے اندر رہتے ہوئے اسلام کی دعوت پر لبیک کہنا موت کو دعوت دینا تھا۔ کفار مکہ ظلم و ستم کے تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر بے یار و مددگار مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے سامنے آگئے تھے کفار کی نگاہیں ہر مسلمان مرد اور عورت کے تعاقب میں رہتی تھیں اور ان کی حرکات و سکنات کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ ان حالات میں حضرت اُمِّ شریک رضی اللہ عنہا کا معمول یہ تھا کہ وہ خفیہ طور پر کفار کے گھروں میں جاتی تھیں اور ان عورتوں کو اسلام کی دعوت دیتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس وقت یہ انتہائی خطرناک کام تھا۔ مگر تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ یہ شرف بھی ایک مسلمان عورت کو نصیب ہوا کہ انہوں نے سر ہتھیلی پر رکھ کر یہ

خدمت اپنے ذمہ لی اور بڑے صبر واستقلال کے ساتھ اپنا فرض انجام دینا شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گفتگو کا خاص ملکہ عطا کیا تھا اوران کی زبان میں بے پناہ تاثیر تھی وہ ایسے دل نشین پیرائے میں بات کرتی تھیں کہ سننے والے اسے آویزہ گوش بنانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کا انداز بیان اور پھر قرآن حکیم کی زبان میں اللہ کا پیغام سونے پر سہاگہ کا کام دے رہا تھا۔ ان کی جادو بیانی اور سحر کلامی نے ان گھرانوں کے اندر اللہ کا پیغام پہنچا دیا جن کے چاروں طرف جبر واستبداد کے پہرے لگے رہتے تھے اور جہاں اللہ کا نام لینے پر زبان کٹتی تھی مگر اسلام کی یہ مقدس مبلغہ بادۂ توحید کے نشے میں مست نتائج وعواقب سے بے پروا اپنے کام میں مصروف رہی اوران کی سعی وجہد سے کئی گھرانے اسلام کے نور سے جگمگا اٹھے بے شمار جاہل اور مشرک خواتین کا دامن حیات اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ جب کفار کو حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کی مبلغانہ سرگرمیوں کا علم ہوا تو بہت برافروختہ ہوئے اس کے بعد حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کے لیے تمام کفار نے اپنے گھروں کے دروازے بند کر دیے اور انہیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا آخر انہوں نے باہمی صلاح مشورے سے فیصلہ کر کے حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کو مکہ سے باہر نکال دیا۔ کفار نے انہیں سختی کے ساتھ منع کر دیا کہ وہ مکہ کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کریں ورنہ انہیں سخت سزا دی جائے گی۔

تاریخ کی ایک مشہور کتاب اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ تھیں جو آغاز اسلام میں مخفی طور پر قریش کی عورتوں کو اسلام کی دعوت دیا کرتی تھیں قریش کو ان کی مخفی کوششوں کا حال معلوم ہوا تو ان کو مکہ سے نکال دیا گیا۔

حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا نہایت دولت مند اور فیاض خاتون تھیں انہوں نے اپنے گھر کو قومی مہمان خانے کی حیثیت دے رکھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے دوسرے حصوں سے جو مہمان آتے ان کی میزبانی کا فرض بھی حضرت ام

شریک رضی اللہ عنہا ادا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کی فیاضی اور مہمان نوازی اس لحاظ سے اکثر مسلمانوں کے لئے باعث رحمت بنی ہوئی تھی کہ ہجرت کے بعد اکثر لوگ یہاں بے خانماں ہو چکے تھے۔ عارضی طور پر وہ لوگ بھی حضرت اُمِ شریک رضی اللہ عنہا کے پاس پناہ لیتے تھے۔ اس وقت اسلام لانے والے نومسلموں کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اسلام قبول کرتے ہی کئی لوگ اپنے ذرائع آمدنی سے محروم ہو جاتے تھے۔ عزیز واقارب اور رشتے داران سے مال و دولت چھین لیتے تھے اور جائیداد تک کے لئے محروم کر دیتے تھے۔ ان حالات میں نومسلموں کے لئے اپنے بیوی بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی مہیا کرنا بھی ناممکن ہو جاتا تھا۔ دنیا میں صرف حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کا گھر تھا جہاں یہ سب لوگ بطور مہمان پناہ گزیں ہوتے تھے۔ چنانچہ حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کا گھر ان نومسلموں کے لئے گویا مہمان خانہ بن گیا تھا۔ یہ سلسلہ اس حد تک وسیع ہو چکا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت قیس کو حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کے ہاں اس وجہ سے عدت بسر کرنے کی اجازت نہیں دی تھی کہ ان کے گھر میں مہمانوں کا ہجوم رہتا تھا اور وہاں پردے کا انتظام ہونا ناممکن تھا۔

خدا کی ان گنت رحمتیں ہوں اللہ کی ان برگزیدہ خواتین پر جنہوں نے اسلام کی تبلیغ واشاعت اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور اس کے عوض اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے سوا کسی چیز کی تمنا نہ کی۔ حضرت ام شریک رضی اللہ عنہا کی زندگی میں دو باتیں بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں انہوں نے بڑی جرات و بہادری کے ساتھ انتہائی نامساعد حالات میں اسلام کی تبلیغ کا فرض انجام دیا۔ جس کی پاداش میں انہیں اپنے وطن عزیز سے نکلنا پڑا۔ پھر وہ جب تک زندہ رہیں مسلمانوں کی بے لوث خدمت ان کا مقصد حیات رہا۔ انہوں نے اپنی تمام دولت بے سروسامان اور مفلس و نادار مسلمان عوتوں مردوں اور بچوں کی پرورش پر خرچ کر دی۔

آج ہمارے ہاں ان عورتوں کی کمی نہیں جو اپنے معمولی آرام و آسائش میں ذرا سی کمی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ اگر ان کے ہاں مہمان آجائیں تو وہ اہل خانہ کے لئے وبال جان بن جاتے ہیں اور ہماری عورتوں کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان سے جتنی جلدی چھٹکارا مل جائے بہتر ہے۔

سہلہ بنت سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہا

"جن کی دینی غیرت اور حمیت نے حقیقی بھائی کی کفرنوازی کو اسلام کی چوکھٹ پر جھکنے کے لیے مجبور کر دیا۔"

سہلہ رضی اللہ عنہا کے والد کا نام سہیل بن عمرو تھا۔ آپ رضی اللہ عنہا ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ بن عتبہ کی اہلیہ تھیں۔ ایک روز سہلہ رضی اللہ عنہا کا حقیقی بھائی عبداللہ بن سہیل ان سے ملنے کے آیا۔ اس وقت وہ اپنے شوہر ابو حذیفہ بن عتبہ کے گھر میں تھیں عبداللہ جونہی گھر میں داخل ہوئے سہلہ رضی اللہ عنہا نے آگے بڑھ کر تپاک کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور بڑی غیر معمولی گرمجوشی سے ملیں۔ عبداللہ بہن کی محبت اور تپاک سے بہت متاثر ہوئے اور خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے وہ کافی دیر تک اپنی بہن کے پاس بیٹھے رشتہ داروں اور مردوں سے متعلق ہنسنے ہنسانے والی باتیں کرتے رہے اور بیتے ہوئے بچپن کی خوشگوار یادوں کو تازہ کر کے خوش ہوتے رہے۔ سہلہ رضی اللہ عنہا نے کئی دفعہ بھائی کی گفتگو میں شامل ہونے کی کوشش کی مگر وہ ہر بار رک جاتی تھیں عبداللہ نے بھی اس بات کو محسوس کیا کہ ان کی ہمشیر اتنی محبت اور گرمجوشی سے باتوں میں دلچسپی لینے کے باوجود بار بار کھوسی جاتی ہے انہیں بہن کی یہ کیفیت کچھ بھلی نہ لگی مگر انہوں نے ازراہ مروت اس کا اظہار کرنا پسند نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد عبداللہ واپس جانے کے لئے اٹھے اور

سہلہ رضی اللہ عنہا انہیں الوداع کہنے کے لئے دروازے تک آئی۔ عبداللہ نے رخصت ہوتے وقت قدرے افسردگی سے بہن کو گلے لگانا چاہا مگر سہلہ رضی اللہ عنہا فوراً ایک طرف کو ہٹ گئیں اور بھائی کو چھونے تک نہیں دیا عبداللہ اپنی جگہ پر ٹھٹک کر رہ گیے۔ اور سہلہ رضی اللہ عنہا بھی گومگو کے عالم میں ایک طرف کھڑی تھیں۔ عبداللہ نے اپنی حیرت دور کرنے کے لئے دوبارہ سلسلہ کلام شروع کیا اور بہن سے پوچھا کہ سہلہ رضی اللہ عنہا! آج تم بدلی ہوئی دکھائی دیتی ہو اور تمہارا سلوک بھی عجیب سا ہے کیا تم لوگ کل ہجرت کا پختہ ارادہ کر چکے ہو۔ سہلہ رضی اللہ عنہا نے حیرت سے پوچھا کہ کیسی ہجرت؟ عبداللہ نے ہنس کر کہا کہ آج تک میں نے ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی جو اپنے حقیقی بھائی سے صحیح بات چھپاتی ہو۔ سہلہ رضی اللہ عنہا! اب اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کوئی پوشیدہ بات نہیں رہی بلکہ ہر جگہ لوگ اس کا تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔ قریش میں ابھی اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان ہجرت کرنے والوں کا راستہ روک لیں۔ مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب سے تنگ آ چکے ہیں۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں سے خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہیں قریش کی نگاہیں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے چند بڑے بڑے اصحابہ پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ کسی صورت باہر نہیں نکل سکتے صرف ایرے غیرے ہی ہجرت کر سکتے ہیں یا وہ لوگ مکہ سے باہر جا سکتے ہیں جن سے قریش کو کوئی خطرہ نہیں۔ سہلہ رضی اللہ عنہا! تمہارا اور تمہارے شوہر کا شاید خیال ہے کہ قریش تم دونوں کے ارادے سے بے خبر ہیں یہ درست نہیں ہے وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر وہ تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کرینگے کیونکہ ان کا تعلق تمہارے بھائیوں اور باپ سے ہے۔ اگر تمہیں اس ہجرت کے بعد خوف اور تنگی سے نجات مل جائے تو ہمیں اس سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اگر قریش کے طعنے کا خیال نہ ہوتا تو تمہارا باپ بھی اس علیحدگی سے پہلے ضرور ملنے کے لئے آتا۔ سن لی میری بات میں یہی کہنے آیا تھا۔ سہلہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ ہاں میں

نے سن لیا ہے۔ پھر اب کیا کہنا چاہتی ہو؟ عبداللہ نے پوچھا! سہلہ رضی اللہ عنہا نے کہا عبداللہ! تم جب سے یہاں آئے ہو تم خود ہی گفتگو کر رہے ہو اور میں صرف سنتی رہی ہوں اور اس وقت تک کوئی جواب نہیں دیا۔ عبداللہ نے فوراً ٹوک کر کہا کہ میں خود تمہارے اس رویہ سے حیران ہوں میں نے الوداع ہوتے وقت تمہیں گلے لگانا چاہا مگر تم پر خلاف معمول دہشت طاری ہوگئی۔ سہلہ رضی اللہ عنہا نے برجستہ جواب دیا۔ بات یہ ہے کہ تم مشرک ہو اور میں مشرکوں سے اپنا جسم مس کرنا پسند نہیں کرتی۔ عبداللہ نے حیران ہوکر پوچھا کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کے دین کی اہمیت تمہارے نزدیک اتنی ہوگئی ہے کہ اب تم اپنے حقیقی بھائیوں سے بھی کٹ جانا چاہتی ہو۔ سہلہ رضی اللہ عنہا نے بڑے باوقار اور سنجیدہ انداز میں جواب دیا کہ عبداللہ! اگر تمہارے دل میں اسلام کا عشق اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا گزر ہوتو تم کبھی یہ سوال نہ کرتے بلکہ تمہیں خود معلوم ہو جاتا کی اللہ کے راستے پر چلتے ہوئے اپنے بھائیوں اور بزرگوں سے کٹ جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ میرے بھائی کان کھول کر سن لو کہ ہم اپنے والدین اپنے بھائیوں اور دنیا کی ہر بڑی سے بڑی نعمت سے بھی زیادہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے ہیں۔ تم نے ابھی کہا تھا کہ قریش ہماری ہجرت سے خوش ہیں مگر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ان سے خوش نہیں اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا حکم نہ دیا ہوتا تو ہم آزمائشوں اور سزاؤں بلکہ موت کو بھی انتہائی خوشی اور مسرت سے قبول کر لیتے۔ ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرب ہر شئے سے زیادہ عزیز ہے۔ عبداللہ یہ سن کر حیرت سے کہا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اپنے والدین ، بھائیوں اور زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہیں؟ سہلہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ اگر ہماری طرح تم بھی اللہ کے دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتے اور تمہیں اس کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا تو تم خود سمجھ لیتے کہ یہ محبت بہت کچھ دیتی ہے مگر کچھ لیتی نہیں۔

اتنے میں سہلہ رضی اللہ عنہا کے شوہر ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ بھی آ گئے اور وہ بھی گفتگو میں شریک ہو گئے عبداللہ نے ان سے بھی اسی قسم کے سوال کیے حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ رضی اللہ عنہ کے سامنے قرآن مجید کی ایک آیت کی تلاوت کی۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ خاموشی سے سنتے رہے تھوڑی دیر بعد بولے۔

خدا تم دونوں سے سمجھے۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ اب میرا دل قابو میں نہیں رہا۔ مجھے بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو۔

اس کے بعد عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی اسلام لے آئے۔ واپسی پر سہلہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا:

"میرے عزیز از جان بھائی! کیا تم بھی ہمارے ساتھ ہجرت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

تو عبداللہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

"بے شک! اب میں یہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔"

اللہ کی سلامتی ہو ان پاک سرشت بہنوں پر جن کی ایمانی طاقت نے دلوں کی دنیا کو حق و صداقت کی آواز سے تسخیر کر کے اسلام کو تقویت بخشی۔

حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا

"خدا نے اس عورت کی بات سن لی جو تم سے جھگڑتی تھی۔"

(قرآن مجید)

"حق گوئی اور بے باکی کا پاکیزہ نمونہ۔"

حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا ایک بزرگ صحابیہ تھیں۔ یہ حضرت عبادہ بن صامت کی اہلیہ تھیں۔ انہیں یہ شرف حاصل ہے کہ قرآن کریم میں ان سے متعلق مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔

"قد سمع اللہ قول التی تجادلك۔"

"خدا نے اس خاتون کی بات سن لی جو تم سے جھگڑتی تھی۔"

اس آیت کریمہ کے نزول سے حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کا مرتبہ صحابیات میں بہت بلند ہو گیا تھا۔ اور لوگ انہیں رشک بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ حق گوئی اور بیباکی آپ کا بہت بڑا وصف تھا۔ دنیا کی کوئی طاقت انہیں سچی بات کہنے سے نہ روک سکتی تھی۔ وہ اللہ کے سوا نہ کسی سے ڈرتی تھیں اور نہ ہی مرعوب ہونا جانتی تھیں۔ خواہ مقابل کتنی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد سے واپس آرہے تھے اس وقت آپ مسندِ خلافت پر متمکن تھے۔ اور ان کی عظمت و وجاہت کے

سامنے ہر شخص دم بخود تھا۔ اتفاق سے راستے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے ہو گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بڑے ادب سے آپ کو سلام کیا۔ سلام کا جواب دینے کے بعد حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''اے عمر رضی اللہ عنہ! میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جب تم کو لوگ عکاظہ کے بازار میں عمر کہتے تھے اور اب تو تمہارا لقب امیر المومنین ہے۔ پس رعایا کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ اور یقین کرو کہ جو شخص عذابِ الٰہی سے ڈرے گا اس پر بعید قریب ہو جائے گا اور جو موت سے ڈرے گا اس کو مر جانے کا خوف ہر وقت ستاتا رہے گا۔''

اس وقت ایک صاحب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے وہ یہ گفتگو سن کر خاموش نہ رہ سکے۔ کیونکہ ان کے نزدیک حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کا اندازِ گفتگو امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان اور مرتبے کے منافی تھا۔ انہوں نے حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کو ٹوکتے ہوئے کہا کہ بی بی! تم نے امیر المومنین کو بہت کچھ کہہ ڈالا ہے...... اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جانے دو یہ خولہ بنت حکیم ہیں اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے ان کی بات سن لی تھی اور پھر عمر رضی اللہ عنہ کو تو اور بھی سننا چاہیے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایسے عظیم المرتبت خلیفۂ اسلام کو یوں سرِ راہ روک کر ڈانٹ دینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اور ہر شخص کو یہ جرأت بھی نہ ہو سکتی تھی۔ کیونکہ فضیلت، مرتبے، قربِ رسول اور علم و فضل کے لحاظ سے وہ لاکھوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان سے اس بیباکی کے ساتھ وہی گفتگو کر سکتا تھا جو ان کا ہم پلہ ہو۔ مگر یہ حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا کا جذبہ صادق تھا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر شخص کے منہ پر سچی بات کہنے میں انہیں

کبھی تامل نہ ہوتا تھا۔

ذرا اندازہ کیجیے کہ جس قوم کی عورتیں اتنی بہادر، دلیر، صاف گو اور دین کے معاملے میں اتنی بے باک ہوں کہ خلیفہ وقت کو ان کی بات احترام کے ساتھ سننا پڑتی ہو وہ کتنی خوش بخت اور عظیم قوم ہو سکتی ہے۔ ایسی قوم میں کسی ناانصافی اور احکام الٰہی سے کوتاہی کون برداشت کر سکتا ہے۔ یقین جانئے! جس قوم کو ایسی ماؤں کے آغوش نصیب ہوں اس کے جذبہ تسخیر کے سامنے یہ عالم شش جہات بہت تنگ ہوتا ہے اور اس کی عظمت و رفعت ہمیشہ عرشِ اعظم کے پائے پر بوسے دیا کرتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہماری قوم جب سے ایسی بے مثل ماؤں اور بہنوں سے خالی ہوئی ہے ہمارا قدم تنزل اور تباہی کی طرف اٹھا ہے۔ اور ہم ذلت و رسوائی کے قریب تر ہوتے گئے ہیں۔

مجاہدۂ اسلام حضرتِ خولہ رضی اللہ عنہا بنت ازور

جن کی شمشیر جوہردار نے میدانِ جہاد کو نئی روایات سے روشناس کرایا اورا اپنے عمل سے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ ایک مسلمان عورت اپنی عزت وعصمت دین کی عظمت اور ملت کی سربلندی کی حفاظت نوکِ شمشیر سے کرنا بھی جانتی ہے۔
انہوں نے دنیا سے منوالیا کہ عورت میدانِ جنگ کا نقشہ قوتِ بازو سے بدلنے پر بھی قادر ہے۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کے والد کا نام ازور بن سنان تھا اور آپ مشہور صحابی حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کی حقیقی ہمشیر تھیں۔ نہایت خوب رُو حسین وجمیل تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی بلا کی مستقل مزاج، دلیر، جری اور بہادر تھیں۔ فنونِ جنگ میں حیرت انگیز مہارت رکھتی تھیں۔ آپ کو اپنے بھائی حضرت ضرار رضی اللہ عنہ سے بے پناہ محبت تھی اور شروع ہی سے اسلام کی خدمت کا بہت زیادہ شوق تھا۔ جہاد کے دنوں میں مشکیزہ اٹھا کر مجاہدین کو پانی پلایا کرتی تھیں۔ اور زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں۔
حضرت خولہ رضی اللہ عنہا اگرچہ بالکل نوعمر تھیں مگر غیرت وحمیت، جرأت ودلیری اور شجاعت وبہادری میں کوئی عورت ان کی ہمسر نہ تھی۔ انہوں نے اکثر میدانِ جنگ

میں شجاعت کے ایسے جوہر دکھائے کہ دشمن بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلامی لشکر کے تمام فوجی سردار اور سپہ سالاران کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ سیف اللہ حضرت خالد بن ولید اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ تو ان کے بہت زیادہ قدردان تھے۔ ان کی بہادری اور دلیری کے بیشمار واقعات مشہور ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد اسلامی میں فوج نے شام کے شہر دمشق کا محاصرہ کیا۔ ان دنوں حضرت خالد بن ولید اسلامی عساکر کے کمانڈر انچیف تھے۔ ہرقل اعظم نے حمص کے حاکم اور وردان کی زیر قیادت اہل دمشق کی مدد کے لیے بارہ ہزار مسلح سوار روانہ کئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اس دستے کی پیش قدمی روکنے کے لیے حضرت ضرار کی سرکردگی میں پانچ سو مجاہدین کا ایک دستہ روانہ کیا۔ لڑائی ہوئی، مسلمان فوج تعداد میں بہت کم تھی اور دشمن ان سے چوبیس گنا زیادہ تھے۔ نتیجہ کے طور مسلمانوں کو شکست ہوئی اور حضرت ضرار رضی اللہ عنہ گرفتار کر لیے گئے۔ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس واقعہ کی اطلاع موصول ہوئی تو وہ ایک ہزار سوار لے کر مقابلے کی غرض سے روانہ ہوئے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سب سے آگے جا رہے تھے۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان سے بھی آگے ایک سوار سیاہ رنگ کے گھوڑے پر سوار نیزہ ہاتھ میں لئے برق رفتاری سے جا رہا تھا۔ اسے دور سے پہچاننا بہت مشکل تھا کیونکہ اس نے چادر کا فرغل بنا رکھا تھا۔ اور ایک رومال سر پر لپیٹے ہوئے تھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اسے پہچاننے کی بہت کوشش کی یہ کون شخص منہ پر ڈھاٹا باندھے ہوا سے باتیں کرتا ہوا جا رہا ہے۔ انہیں کچھ شک ہوا تو اسے پکڑنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اس پُراسرار سوار نے جاتے ہی عیسائی فوج پر حملہ کر دیا اور حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ کئی دشمنوں کو مار گرایا۔ اتنے میں مسلمان فوج بھی پہنچ گئی مگر وہ سوار انتہائی جوش وخروش کے ساتھ دیوانہ وار لڑ رہا تھا اس کی تلوار بجلی طرح

کوندتی ہوئی جس کے سر پر جا گرتی اس کے دو ٹکڑے کر دیتی۔ وہ انتہائی اضطراب اور غصے کی حالت میں چاروں طرف تابڑ توڑ حملے کر رہا تھا۔ اور دشمن اس کی یہ حالت دیکھ کر سراسیمہ ہو رہے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ سوار کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم سب اس غلط فہمی میں تھے کہ آپ لڑ رہے ہیں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم میں خود اس سے واقف نہیں ہوں۔ اس کی بے مثل شجاعت نے مجھے محو حیرت بنا دیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد رومی ذلت آمیز شکست کھا کر بھاگ نکلے تو سب مسلمان فوجی ایک مقام پر جمع ہوئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اس سوار کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ اے بھائی! تیرے معاملہ نے ہمیں حیران کر رکھا ہے ہم ابھی تک نہیں پہچان سکے تو کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اے سردار! میں نے نافرمانی کی نیت سے یہ کام نہیں کیا بلکہ میں اس لیے علیحدہ رہی کہ میں پردہ نشین ہوں۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی حیرت اور بھی بڑھی۔ انہوں نے پوچھا کہ آخر تم ہو کون؟ میں خولہ رضی اللہ عنہا ہوں، ازور کی بیٹی اور ضرار رضی اللہ عنہ کی ہمشیر۔ اس غیر متوقع جواب نے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بہت زیادہ مسرور ہوئے۔ اس کے بعد مسلمان فوج نے عیسائیوں کا تعاقب کیا۔ رومی بھاگتے وقت مسلمان قیدیوں کو بھی حمص کی جانب اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ضرار کو آزاد کرانے کے لیے رافع کی قیادت میں سو سواروں کا ایک دستہ روانہ کیا۔ مگر حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کو اس وقت تک چین کیسے نصیب ہو سکتا تھا۔ جب تک وہ اپنے پیارے بھائی کو آزاد نہ کرا لیتیں۔ چنانچہ بضد ہو کر اس دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں اور حضرت ضرار رضی اللہ عنہ کو آزاد کرا کے لائیں۔

شام کی اسی جنگ میں ایک دفعہ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا مسلمان عورتوں کے ساتھ جا رہی تھیں انکی معیت میں تھوڑی سی فوج تھی کہ اچانک ایک مقام پر دشمنوں نے کمین

گاہ سے نکل کر حملہ کر دیا۔ مسلمان مردوں اور عورتوں نے مل کر بڑی جانبازی سے دشمن کا مقابلہ کیا مگر اتنی قلیل سی تعداد کب تک ہزاروں مسلح سپاہیوں کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ سب گرفتار کر لیے گئے۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کو اس ناکامی کا بہت زیادہ رنج ہوا۔ انہوں نے تمام عورتوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور انہیں کہا کہ قیدی بن کر جینے سے عزت کی موت زیادہ بہتر ہے۔ عورتوں نے جواب دیا کہ ہم موت سے نہیں ڈرتیں بلکہ اس وقت ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ خالی ہاتھ لڑنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ ہمارے پاس تلواریں نہیں ہیں تو کوئی پروا نہیں۔ ''مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی'' اسی خیمے کی چوبیں نکال کر حملہ کر دو۔ سب نے حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کے حکم کی تعمیل کی اور دشمنوں پر ٹوٹ پڑیں۔ عیسائیوں کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ تھا کہ خیمے میں قید، نہتی اور بے بس و مجبور عورتیں خیمے کی چوبیں نکال کر ان کی مسلح اور جرار فوج کو للکار رہی تھیں۔ عیسائی فوج کے سردار نے جب سپاہیوں کے بے طرح قتل ہوتے دیکھا تو گھبرا کر حملے کا حکم دے دیا۔ ابھی عیسائی فوج سنبھل کر حملہ کرنے ہی والی تھی کہ دور سے اللہ اکبر کی آواز سنائی دی۔ چشم زدن میں مسلمان فوج وہاں پہنچ گئی اور عیسائی لشکر بدحواس ہو کر بھاگ نکلا۔ مسلمان تمام خواتین کو واپس لے کر اپنے فوجی صدر مقام پر پہنچ گئے۔

جنگِ یرموک میں ایک مرتبہ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا دوسری عورتوں کے ساتھ ایک جگہ کھڑی لڑائی کا تماشا دیکھ رہی تھیں کہ اچانک دشمن بڑھتے ہوئے عورتوں کے کیمپ تک پہنچ گئے حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے اسی وقت ان پر حملہ کر دیا اور دوسری عورتوں کے ساتھ لڑنے لگیں۔ چند عورتوں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بری طرح سے ڈانٹا۔ اس لڑائی میں بھی حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کے خوب جوہر کھلے۔ وہ بڑی بہادری کے ساتھ لڑتی جا رہی تھیں۔ اور اپنی ساتھی خواتین کے حوصلے

بھی بلند کر رہی تھیں اور پر جوش اشعار سے ان کی ہمت بڑھا رہی تھیں۔ اچانک ایک کافر کی تلوار لگی اور وہ سخت مجروح ہو گئیں۔ تمام جسم خون سے شرابور ہو گیا۔ مگر وہ کافر ان کے ہاتھ سے زندہ بچ کر نہ جا سکا۔ انہیں وہاں سے اٹھا کر خیمے میں لایا گیا۔ شام کو جب مسلمان لڑائی سے فارغ ہو کر واپس آئے تو حضرت خولہ رضی اللہ عنہا مشک لے کر سب کو پانی پلا رہی تھیں۔ اور انہیں اپنے زخم کی ذرا پروا نہ تھی۔ مورخین نے لکھا ہے کہ جنگ یرموک میں حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کی شرکت سے لڑائی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس لڑائی میں جب فوج کے بائیں حصے کے قدم اکھڑے اور مسلمانوں نے تیزی سے پیچھے ہٹنا شروع کیا تو حضرت خولہ رضی اللہ عنہا یہ شعر پڑھ کر مردوں کو غیرت دلا رہی تھیں:

"اے پاکدامن عورتوں کو چھوڑ کر بھاگنے والو موت اور تیروں کا نشانہ نہ بنو۔"

محاصرہ دمشق کے موقعہ پر انہوں نے عورتوں کے مجمع میں جو تقریر کی تھی وہ آبِ زر سے لکھی جانے کے قابل ہے۔ اس کے ہر لفظ سے جوش ایمانی ٹپک رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا! بہنو! کیا تمہاری غیرت عرب کی شجاعت اور حمیت کے دامن پر داغ لگانا چاہتی ہو۔ میرے نزدیک تو یہ ذلت برداشت کرنے سے مر جانا بہتر ہے...... حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کے ان چند فقروں نے آگ لگا دی تھی اور عورتوں نے چوبوں سے حملہ کر کے تیس آدمیوں کو قتل کر دیا تھا۔

حضرت خولہ رضی اللہ عنہا کا نام آج بھی تاریخ اسلام کے صفحات میں قندیل کی طرح جگمگا رہا ہے جس کی روشنی میں ہم مسلمان عورت کی عظمت، بلند کرداری اور غیرت و حمیت کے زندۂ جاوید نقوش آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ انہیں اپنے بھائی ضرار رضی اللہ عنہ سے بہت انس تھا چنانچہ شام اور مصر کی جنگوں میں وہ عموماً اپنے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اور دونوں بہن بھائی گھوڑے ملا کر لڑتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ہم دونوں میں سے اگر کوئی شہید ہوا تو پھر قیامت کے دن ملاقات ہوگی۔ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی کی

معمولی سی تکلیف بھی برداشت نہ کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ جب وہ دشمنوں کے پاس قید ہوگئے تو حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لیا جب تک اپنی قوتِ بازو سے انہیں رہا نہیں کرالیا۔ اگر کبھی حضرت ضرار رضی اللہ عنہ زخمی ہو جاتے تو ان کی تیمارداری میں دن رات مصروف رہتی تھیں اور رو رو کر خدا سے دعا مانگا کرتی تھیں کہ میرے پروردگار! ضرار رضی اللہ عنہ کو اسلام کی خدمت کے لیے زندگی عطا فرما بلکہ میری زندگی بھی اسے بخش دے۔ کیونکہ وہ مجھ سے کہیں بہتر اسلام کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی زندگی میری جان سے زیادہ قیمتی ہے۔

آج بھی ہماری بہو بیٹیوں اور بہنوں میں خولہ رضی اللہ عنہا نام کی کمی نہیں ہے۔ مگر سیرت و کردار کی عظمت کہیں نظر نہیں آتی۔ ان اوصاف کی شمع کہیں بھی روشن دکھائی نہیں دیتی۔ خدا کرے کہ ہماری بہنیں ناموں کی خوبصورتی کے گلستان سے نکل کر سیرت کی وادی میں قدم رکھیں۔ اور ایک بار پھر دنیا پر ثابت کر دیں کہ مسلمان عورت ان کے کھوکھلے افکار کی کبھی محتاج نہیں رہ سکتی۔ بلکہ وہ خود نوکِ شمشیر سے وقت کا دھارا بدل دینے کی طاقت رکھتی ہیں۔

قرۃ العین المرتضیٰ حضرت زینب رضی اللہ عنہا
بنت علی کرم اللہ وجہہ

"جو شخص اس بات کی تمنا رکھتا ہو کہ وہ قیامت تک دنیا میں کسی دوسرے شخص کا محتاج نہ ہو تو اسے چاہئے کہ ہمیشہ اللہ کی حمد و ثنا میں مصروف رہے۔" (حضرت زینب رضی اللہ عنہا بنت علی رضی اللہ عنہ)

"میری پھوپھی نے سفر (کربلا) کی بے پناہ صعوبتوں اور مصائب میں بھی نوافل ترک نہیں کیے۔"

(حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ)

"آپ رضی اللہ عنہا وہ ہیں جن کی گردنیں باطل کے آگے جھکنا نہیں جانتیں اور آپ وہ ہیں، صدق و صفا اور حق گوئی جن کی فطرت ہے۔" (مکارم ابن کثیر)

"خدا کی قسم میں نے کسی پردہ نشین خاتون کو ان (حضرت زینب رضی اللہ عنہا) سے زیادہ فصیح البیان نہیں دیکھا۔"

(خزیمہ ابن اسدی)

صدق و صفا، خوبی و کمال، صبر و رضا، زہد و اتقا، مہر و وفا، ایثار و قربانی کے بلند

اوصاف کو اگر کسی ایک زندۂ جاوید شخصیت میں اپنے انتہائی عروج پر یک جا دیکھنے کی تمنا ہو تو ہزاروں مقدس پردوں کے اندر جلنے والی خاندان اہل بیت کی اس شمع کی تابانی میں دیکھیے جس تاریخ زینب بنت علی رضی اللہ عنہ بن ابن طالب کے نام سے یاد کرتی ہے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا جن کی حیات طیبہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیا، سیدۃ النساء حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی عفت وعصمت، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فصاحت و بلاغت حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی درویشی وسادگی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی حق پرستی اور صداقت شعاری سے عبارت تھی۔ پانچویں یا چھٹے ہجری سال میں پیدا ہوئیں۔ بعض مؤرخین نے تاریخ ولادت ۹ھ بیان کی ہے۔ حیدر کرار حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ آپ کے والد ماجد تھے، خاتونِ جنت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی بیٹی اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔

اس ہستی کی عظمت ورفعت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جن کے نانا سرور کائنات شہنشاہ کونین، سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ اور میلاد سعید کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لعابِ دہن سے ان کے حلق کو تر کیا ہو۔ جن کی نانی حضرت خدیجۃ الکبریٰ ہوں جنہیں جبرائیل امین اللہ کا سلام پہنچانے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ جنہیں سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا ایسی ماں کا آغوش شفقت نصیب رہا ہو۔ جن کی نانی محترمہ اور والدہ محترمہ کو یہ شرف نصیب ہو کہ ان کے اسوۂ حسنہ کو قیامت تک کے لیے نمونہ قرار دے کر یہ ہدایت کی گئی ہو کہ دنیا بھر کی مسلمان خواتین کے لیے ان کی تقلید کافی ہے جنہیں پیکر فقر واستغناء، علم کے بحر بے کراں اور شجاعت و بسالت کے روح رواں حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ ایسے باپ کی محبت وشفقت نصیب ہوئی ہو۔ ان کی خوبیوں اور بلندیوں کو کون شمار کر سکتا ہے۔ جس مبارک ہستی نے ایسے پاک اور مقدس ماحول میں آنکھ کھولی ہو اور اس روحانی گرد وپیش میں بچپن کی منزلیں

ملے کی ہوں ان کا دامنِ حیات بلند اوصاف کے کیسے کیسے موتیوں اور جواہرات سے جگمگا رہا ہوگا۔ ذرا اس پاک گھرانے کا تصور کیجئے جس کی چار دیواری صبح و شام تلاوت قرآن پاک کی قدسی آواز سے گونج رہی ہو اور آواز بھی حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی جورات کی خاموشی اور تنہائی میں چکی پیسنے کی آواز کے زیرو بم کے ساتھ لپٹ کر عرش اعظم تک پہنچ رہی ہو۔ جس گھر کو صبر و رضاء اور توکل و استغناء کے چراغوں نے بقعۂ نور بنا رکھا ہو۔ جہاں کئی کئی دن تک چولہے میں آگ روشن کرنے کی نوبت نہ آتی ہو۔ جس گھر کے دروازے کے باہر زرو جواہر کے ڈھیر پڑے ہوں مگر اندر کئی روز کا فاقہ ہو۔ اس کے باوجود جس گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے والا حاجت مند کبھی مایوس و نامراد واپس نہ گیا ہو۔ جس اسبابِ دنیا سے خالی سادہ اور فقیرانہ گھر پر کبھی عیش و عشرت اور فارغ البال کا سایہ تک نہ پڑا ہو۔ مگر پھر بھی ایک عالم ہدایت و معرفت کی دولت سمیٹنے کے لیے اس گھر کے دروازے کے سامنے جھولی پھیلائے کھڑا ہو۔ جس گھر کے رہنے والوں نے اللہ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تحمید کے علاوہ کبھی اور کوئی آواز نہ سنی ہو۔ جس گھر میں سرکارِ دو عالم محبوب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پہروں بیٹھ کر انوار کا مینہ برساتے ہوں اور جس کے ہر ذرے نے آفتاب نبوت کی کرنوں سے ہم آغوش ہونے کا شرف حاصل کیا۔ دنیا کا وہ مبارک اور مثالی گھر جہاں دینا کی ایک مثالی بیٹی، ایک فقید المثال بیوی اور بے نظیر ماں رہتی تھی جس کے پَرتوِ انوار سے آج بھی نسائیت کے تقدس کا چراغ روشن ہے وہ صاحب کردار اور مخزن عظمت و جلالت ماں جس کا مقدس آغوش صداقت پر مر مٹنے، اللہ کے نام پر کٹ مرنے اور اسلام کی بلندی کے لیے ہر فرعون و ہامان کے سامنے جرأت و استقلال سے سینہ سپر ہو جانے کا درس دینے کے لیے ایک عظیم الشان مکتب کا کام دے رہا تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اسی مکتب میں فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے فیضان نظر اور حضرت علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کی بسالت نگاہی کے سائے

میں تربیت حاصل کی اور عظیم المرتبت بھائی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ میدان کربلا کو اہل بیت کے مقدس خون سے لالہ زار بنتے دیکھا۔ اپنے بچوں کو قدسیت اور خدا پرستی کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے حضرت سیدۃ النساء کا انداز تربیت کیا تھا؟ اس کا اندازہ اسی ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی بچپن میں کسی بات پر تکرار ہو گئی جیسا کہ عام طور پر چھوٹے اور بڑے بھائیوں میں ہو جاتی ہے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے انہیں اس حال میں دیکھا تو اپنے پاس بلا کر قرآنی آیات سنائیں اور فرمایا کہ اس طرح آپس میں جھگڑ کر تم اللہ تعالیٰ کو ناراض کر رہے ہو۔ دونوں بچے قرآن سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے آئندہ کے لیے عہد کیا کہ کبھی ان سے ایسی کوئی بات سرزد نہ ہو گی جس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے موقع پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی عمر سات برس سے کچھ کم تھی۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے محبوب حقیقی سے ہم آغوش ہونے کے لیے دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی اپنی والدہ مکرمہ کے ساتھ وہاں موجود تھیں۔ حضرت خاتون جنت نے بیٹی کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”بیٹی! میں اپنے بابا کو ایسی حالت میں رخصت کر رہی ہوں جب کہ ہمارے گھر میں جلانے کے لیے تیل بھی نہیں ہے۔“ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی عمر ابھی سات سال سے کم ہی تھی کہ وہ اپنی بلند مرتبت ماں کے آغوش شفقت سے بھی محروم ہو گئیں۔ وفات سے پہلے سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا ”زینب! میرے بعد اپنے بھائیوں کی ماں بھی تو ہے اور بہن بھی۔ اپنی ماں کی زندگی میں تو ہمیشہ بھائیوں سے بے پناہ محبت کرتی رہی ہے۔ میرے بعد بھی تمہاری محبت کا سلسلہ قائم رہنا چاہیے اور تم سب ہمیشہ اسی طرح سلوک اور محبت کے ساتھ رہنا۔“

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے دوسری شادیاں کیں۔ مگر ان کے گھر میں ایسا ماحول پیدا نہ ہوا جو عموماً سوتیلی ماؤں کے آنے سے ہو جاتا ہے بلکہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنی یتیمی کو رضائے الٰہی سمجھ کر ہمیشہ اسی راستے پر گامزن رہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ تھا۔ ان کی بلند کرداری اور اعلیٰ اوصاف میں کوئی بات رکاوٹ کا موجب نہ بن سکی، اور ہمیشہ ایک سعادت مند، نیک اطوار اور دیندار بیٹی کی طرح انہوں نے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری ازواج نے بھی پورے خلوص اور محبت کے ساتھ انہیں اپنے دامن شفقت میں اس طرح جگہ دی کہ جیسے لفظ ''سوتیلی'' ان کے نزدیک کفر کا ہم معنی اور عورتوں کے ایام جاہلیت کی مکروہ یادگار تھا جسے اسلام کی پاک تعلیم نے دوسرے مفاسد کی مانند مٹا دیا تھا۔

جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا جوان ہوئیں تو خاندان نبوت کا عکس جمیل تھیں۔ زندگی سر سے پاؤں تک سادگی کی تصویر، اخلاق، کریمانہ کا حسین مجسمہ، بڑوں کے ساتھ عزت و احترام اور بچوں کے ساتھ بے حد پیار و محبت سے پیش آنے کی عادی، شرم و حیا کا پیکر، گفتار و کردار میں وہی اسلامی عظمت، وقار اور متانت اور ہر بات میں قدسیت کا جمال پنہاں تھا۔ بے حد مہمان نواز، خدا ترس اور حلیم و رحمدل تھیں۔ فیاضی اور سخاوت گویا خاندانی وصف تھا۔ بے حد عبادت گزار اور ہر لحظہ خدا کے خوف سے ڈرنے والی تھیں۔ شرم و حیا کا یہ عالم تھا کہ کبھی حقیقی بھائیوں سے بھی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کی۔ تقویٰ اور ریاضت میں اپنی مثال آپ۔ حق گوئی اور بے باکی میں مجاہدانہ سطوت و عظمت تھی۔ آپ کی شادی اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہوئی جو ہر لحاظ سے ان کے لیے موزوں اور مناسب تھے مؤرخین کہتے ہیں کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی شباہت حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے قدرے ملتی تھی۔ اللہ

نے حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت کی دولت بھی دل کھول کر دی تھی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے والد ماجد حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنے دوسرے بیشمار اوصاف کے علاوہ عرب کے بہترین اور فصیح و بلیغ مقرر خیال کیے جاتے تھے اور ان کے کلام میں سحر بھرا ہوتا تھا ان کی بے نظیر اور عالمانہ تقریر ایک دفعہ تو سننے والوں کو مبہوت و مسحور کر دیتی تھی۔ یہی وصف حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نصیب ہوا تھا۔ ان کی یہ خصوصیت جہاں انہیں دوسری کئی مقدس خواتین اسلام سے ممتاز کرتی ہے۔ وہاں سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہم وصف بھی بناتی ہے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے میدان کربلا، کوفہ و دمشق اور یزید کے دربار میں جو خطبات ارشاد فرمائے تھے وہ آج بھی ہماری ملی تاریخ کا گراں قدر سرمایہ ہیں جن سے ان کی بے پناہ فصاحت و بلاغت، کلام کی روانی اور الفاظ کی نشست و برخاست پر قادر ہونے کا اندازہ ہوتا ہے۔

۳۷ھ میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ ہو کر کوفہ میں اقامت گزیں ہوئے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے شوہر حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے ساتھ وہاں مقیم تھیں۔ عام عورتوں کی طرح بے کار وقت ضائع کرنا تو ان کی عادت کے خلاف تھا۔ ان کا تمام وقت کن مشاغل میں صرف ہوتا تھا؟ بناؤ سنگار، طرح طرح کے ملبوسات بنانے اور پہننے، سیر و تفریح، دوسروں کی چغلیوں اور غیبتوں، نکتہ چینیوں اور عیب جوئی میں یا ذاتی آرام و آسائش کے اسباب جمع کرنے میں۔ ہرگز نہیں۔ یہ باتیں تو ان پاک ہستیوں سے کوسوں دور تھیں۔ وہ تو خیر حضرت زینب بنت زہراء رضی اللہ عنہا تھیں۔ ایک عام اور اوسط درجے کی مسلمان عورت بھی ان باتوں کو گناہ سمجھتی تھی۔ اور اسے جاہلیت سے تعبیر کرتی تھی۔ چہ جائیکہ سیدۃ النساء کی لخت جگر پر ایسی فضول باتوں کا سایہ تک پڑ سکتا۔ ان کے مشاغل کیا تھے؟ غور سے سنیئے اور یاد رکھیئے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جن کا جینا اور مرنا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھا۔ جن کی زندگیوں کا

مقصد وحید یہ تھا کہ تمام دنیا میں اللہ کا نام بلند کیا جائے حق وصداقت کا بول بالا ہو۔ جہالت اور پستی کے اندھیرے دور ہوں۔ اور لوگ اسلام کو اپنا اوڑھنا بچھونا سمجھیں۔ وہ خود قرآنی تعلیمات کی چلتی پھرتی تصویریں تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ دنیا میں ان کے آنے کا یہ مقصد نہیں کہ بہترین اور لذیز ترین کھانے کھائیں، قیمتی سے قیمتی کپڑے پہنیں، گراں قیمت زیورات سے آراستہ ہوں اور دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ بلکہ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ ایک بلند ترین نصب العین کی امانت سنبھالے ہوئے ہیں جس کے متعلق ان سے سوال کیا جائے گا۔ یہ نصب العین اسلام تھا۔ جس کی بدولت دنیا میں مسلمانوں کو عزت و عظمت نصیب ہوئی تھی اور وہ مسلمان کہلائے تھے جس کے طفیل وہ قیصر و کسریٰ کی عظمت و شوکت کے وارث قرار پائے اور دنیا بھر کی دولت ان کے قدموں تلے پائمال ہو رہی تھی۔ وہ اللہ کے اس احسان عظیم کو خوب سمجھتی تھیں۔ اور اس کا حق ادا کرنا اپنا فرض خیال کرتی تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے خطابت اور تقریر کا ملکہ عطا فرمایا تھا اور ان کے کلام میں بے پناہ تاثیر پیدا کی تھی انہوں نے کوفہ کی مسلمان عورتوں کو جن میں نومسلم خواتین کی بہت بڑی تعداد شامل تھی قرآن کی تعلیم دینے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ وہ نماز فجر سے نماز ظہر تک گھر کے فرائض ادا کرتی تھیں اور ظہر کی نماز کے بعد انتہائی فصیح و بلیغ زبان میں درس قرآن مجید دیتی تھیں۔ یہ ان کے علم کی وسعت اور تقریر کی دلکشی تھی کہ ان کے درس میں روزانہ ہزاروں عورتیں شامل ہوتی تھیں۔ اور دین سے واقفیت حاصل کرتی تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے درس میں بعض اوقات بہت گہرے دینی اسرار بھی بیان کر جاتی تھیں۔ ایک دفعہ آپ حسب معمول درس دینے میں مصروف تھی کہ اتفاق سے خلیفۃ المسلمین حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے اور انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی چند باتیں سن لیں۔ اسی وقت اپنی قابل فخر بیٹی کو بلا کر فرمایا کہ بیٹی! اسرار دین سے

متعلق ایسے گہرے مسائل بیان نہ کیا کرو کیونکہ انہیں سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے بہت بڑی علمی استعداد اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شرم وحیا کا یہ عالم تھا کہ عورتوں کے سامنے درس دیتے وقت بھی نگاہیں جھکی رہتی تھیں تقویٰ کی یہ حالت تھی کہ فرماتیں دنیا کی زندگی اس سایہ دار درخت کی سی ہے جس کے سائے میں مسافر کچھ دیر کے لیے ستا لیتے ہیں۔ آپ کو تن آسانی اور آرام پسندی سے سخت نفرت تھی۔ وقت کا بیشتر حصہ عبادت میں بسر کرتی تھیں اور دن رات کثرت سے نوافل ادا کرنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ اکثر روزے سے رہتی تھیں۔ اسی وجہ سے عابدہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

''میری پھوپی نے سفر کی مصیبتوں اور صعوبتوں میں بھی کبھی نوافل ترک نہیں کیے'' ان کی اسی خصوصیت کی وجہ سے میدان کربلا میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا تھا۔ ''بہن! پچھلے پہر کے نوافل میں مجھے بھول نہ جانا۔'' ان کی زبان پر ہر وقت اللہ کی حمد وثنا جاری رہتی تھی۔ وہ گھر میں ہوں یا سفر میں۔ کسی بھی حالت میں ہوں ہر وقت تسبیح وتحمید میں مصروف رہنا ان کا شیوہ تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا یہ قول بہت مشہور ہے۔

''جو شخص اس بات کی تمنا رکھتا ہو کہ وہ قیامت تک دنیا میں کسی دوسرے شخص کا محتاج نہ ہو تو اسے چاہیئے کہ ہمیشہ اللہ کی حمد وثنا میں مصروف رہے۔''

۶۱ھ میں جب سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے جان نثاروں اور اہل بیت کے ساتھ کربلا تشریف لے گئے تو ان پر جان فدا کرنے والی وفادار بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا بھی اپنے بیٹوں سمیت ان کے ساتھ تھیں۔ شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ سے متعلق تمام واقعات ان کے سامنے رونما ہوئے۔ یزیدی افواج نے اہل بیت کے اس نہتے اور مختصر سے قافلے کو جس وحشت ودرندگی اور شقاوت قلبی کا نشانہ بنایا اس کی تفصیلات

ہر مسلمان کو معلوم ہیں۔ سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے خاندان کے ایک ایک فرد کو ذبح کرا دیا۔ اپنے جان نثاروں کے لاشے انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی ریت پر تڑپتے دیکھے، ننھے ننھے معصوم جگر پاروں کو تیروں سے چھلنی ہوتے دیکھا اور آخر میں اپنا سر مبارک بھی کٹوا دیا مگر یہ برداشت نہ کیا کہ ایک ظالم اور فاسق و فاجر بادشاہ کی اطاعت قبول کریں۔ یزید اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی نافرمانی کرتا تھا اس لیے شہید نینوا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے اسے مسلمانوں کا خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یزید کی فوجوں نے امام حسین رضی اللہ عنہ کے قافلے کو میدان کربلا میں گھیر لیا اور یزید کی اطاعت قبول کرنے کے لیے مجبور کیا مگر آپ نے صاف انکار کر دیا تو یزیدی فوج کے افسروں نے دریائے فرات پر پہرے بٹھا دیئے۔ کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو پانی کا ایک قطرہ نہ مل سکے۔ دوزخ کی طرح دہکتا ہوا ریگستان اور چلچلاتی ہوئی دھوپ۔ ایسی حالت میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حرم کی خواتین اور ننھے ننھے بچے شدت پیاس سے بلکتے رہے۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو گئے مگر آپ نے کسی قیمت پر بھی دین کی عزت و عظمت کو فروخت کرنا گوارا نہ کیا بلکہ مجاہدانہ عزم و استقلال کے ساتھ اپنی بات پر قائم رہے۔ آخر جنگ شروع ہوئی تو چند دنوں میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے تمام جان نثار ساتھی ایک ایک کر کے ان پر فدا ہو گئے۔ اور اس نازک موقع پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے دونوں نوجوان بیٹوں حضرت عون اور حضرت محمد کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے اللہ کی راہ میں شہید ہونے کے لیے بھیجا اور انہیں آخر دم تک داد شجاعت دینے کی تاکید فرمائی۔ دونوں ہونہار بیٹے اپنی عظیم المرتبت ماں کے ارشاد کے مطابق لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ آخر میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی باری تھی۔ حضرت امام علی بن حسین رضی اللہ عنہ جو امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور ہیں خیمے میں بیمار پڑے تھے وہ

فرماتے ہیں کہ جس رات کی صبح کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ میدان شہادت میں جانے والے تھے اس رات میں بیمار پڑا تھا اور میری پھوپی حضرت زینب رضی اللہ عنہا میری تیمار داری کر رہی تھیں۔ اس اثناء میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ خیمے میں داخل ہوئے اور انہوں نے چند اشعار پڑھے جنہیں سن کر میں نے آپ کا ارادہ سمجھ لیا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے کیونکہ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ ہم پر مصیبت پوری طرح نازل ہو چکی ہے مگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا ضبط نہ کر سکیں اور چلا اٹھیں۔ جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے بہن کی یہ حالت دیکھی تو ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ "اے بہن! یہ کیا بے صبری ہے اور کیسا رونا پیٹنا ہے؟ اللہ سے ڈرو کہ موت یقیناً آنے والی چیز ہے اور اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔" لیکن حضرت زینب شدت غم سے نڈھال ہو رہی تھیں۔ کیونکہ ان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ کل طلوع ہونے والی صبح کتنے خوفناک مظالم اپنے ساتھ لے کر آ رہی ہے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ان کی یہ حالت دیکھ کر خود آگے بڑھے اور ہوش میں لائے پھر فرمایا۔

"اے بہن! یہ کیا غم و حزن ہے جس کا اظہار تم کر رہی ہو؟ تمہیں چاہیے کہ اللہ کے حکم کے مطابق جو طریق غم و حزن ہے اسے اختیار کرو کیونکہ میرے لیے اور ہر ایک مسلمان کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور ان کے اعمال وافعال کی پیروی ایک بہترین نمونہ ہیں۔

مقام غور ہے کہ جس صابر شاکر خاتون نے بڑے استقلال کے ساتھ یزیدی فوج کے بے پناہ جور و ستم کو برداشت کیا اور خود اپنے دونوں نوعمر بیٹوں کو اسلام کی عظمت اور صداقت پر قربان کر دیا اس کے ہاتھوں سے یک لخت صبر و شکیب کا دامن کیسے چھوٹ گیا؟ اگر ہم ایک لمحہ کے لیے چشم تصور سے کربلا میں اہل بیت اور ان کے جان نثاروں پر ہونے والے مظالم کے خوفناک مناظر سامنے لائیں تو دل خون ہو جاتا

ہے۔ایسے حالات میں ایک خاتون کا درجہ صبر واستقلال صرف ان ہی بزرگ ہستیوں کا حصہ ہوسکتا ہے جو دنیا میں دوسروں کے لیے نمونہ بن کر آتی ہیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ان اضطرابی کیفیات کا تعلق جہاں ایک طرف حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ایسے عظیم اور پیارے بھائی کی فطری محبت سے تھا تو دوسری طرف ان کے بے پایاں غم و اندوہ کا باعث یہ بھی تھا کہ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عاقبت نا اندیش طبقہ اپنے ہاتھوں خاندان نبوت کا آخری چراغ گل کردینے پر کمر بستہ ہو چکا تھا۔انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا کہ صبح رشد وہدایت کا یہ روشن چراغ ہمیشہ کے لیے گل کردیا جائے گا اور اس کے بعد دنیائے حق وصداقت کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ایسا کارواں سالار پھر میسر نہ آسکے گا۔ایک ایسے دور میں جب دنیائے اسلام پر یزید ایسے فاسق و فاجر خودساختہ بادشاہ کا پرچم لہرا رہا تھا اور وہ ظالم اللہ اور رسول کے نام پر اسلام کی بیخ کنی میں مصروف تھا۔خزانوں اور دولت پر اس کا قبضہ تھا۔ان گنت فوج ہر وقت اس کے اشارۂ ابرو کی منتظر رہتی تھی اور کچھ نامی لوگ چند روزہ عیش وآرام کی خاطر اپنا ایمان اور ضمیر یزید کے پاس گروی رکھ چکے تھے۔اسلام نے انسان کی عزت وعظمت اور شرف و آزادی کے لیے جو مسند بچھائی تھی اس پر چند ظالم اور جابر قبضہ جما چکے تھے۔اور اسے باپ دادا کی میراث سمجھ کر مسلمانوں کے حقوق پائمال کر رہے تھے۔جو لوگ آزادی کے ساتھ یزید کی مخالفت نہ کرسکتے تھے وہ گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر چکے تھے اور ہر طرف فتنہ وفساد کا دور دورہ تھا۔یوں معلوم ہوتا تھا کہ ساری خدائی ایک دفعہ پھر حق و انصاف کے خلاف صف آرا ہوگئی ہے۔ایسے حالات میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے مٹھی بھر جان نثاروں اور اصحاب کے ساتھ جو دنیائے اسلام کے لیے امید کی آخری کرن تھے اور یزید کے ظلم وستم سے سہمی ہوئی ہزاروں آنکھیں امید بھری نگاہوں سے سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ رہی تھیں کیونکہ اس شر وفساد سے بھر

پورے ماحول میں صرف وہی حق وصداقت کی آواز بلند کر سکتے تھے اور اپنے نانا کے دین کی عظمت کو دنیا دار بھیڑیوں سے بچانے کے لیے ملت اسلامیہ کو ایک جھنڈے تلے جمع کر سکتے تھے مگر اس وقت تک حالات جو صورت اختیار کر چکے تھے اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ دنیائے اسلام کی یہ آخری امید اور آرزو بھی یاس و حرماں کے اندھیرے میں بہت جلد بدلنے والی ہے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا حد سے بڑھا ہوا اضطراب کسی مزید تشریح کا محتاج نہیں۔

شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے مختلف مواقع پر جو خطبات ارشاد فرمائے ہیں ان کا ایک ایک لفظ ان کے خون جگر میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے اور اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ انہیں اسلام سے کس قدر والہانہ محبت تھی اور انہیں صورت حال کا کتنا شدید احساس تھا۔ ان کے زخمی دل کی ٹیسوں کو کچھ وہی محسوس کر سکتا ہے جسے سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ایسے عظیم بھائی کی روحانی اور اخلاقی بلندیوں کا پورا احساس ہو۔ جس کا دل ملت کی زبوں حالی سے مجروح ہو چکا ہو۔

اگلے دن وہ منحوس صبح نمودار ہوئی جب اسلام کے بطل جلیل اور حریت و شجاعت کے شہنشاہ، شانۂ رسول ﷺ پر سوار ہونے والے کربلا کے غازی حق و آزادی کے ایک درخشندہ ترین باب کو اپنے پاک خون سے لوح عالم پر لکھنے کے لیے میدان وفا میں نکلے تو تاریخ عالم حیرت کے ساتھ یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ ایک طرف ایک جابر و قاہر خود ساختہ شہنشاہ کا لشکر عظیم تھا اور مقابلے میں پیغمبر خدا ﷺ کا بھوکا پیاسا، پریشان حال اور غریب الوطن نواسا تھا جو تن تنہا اس سیلاب ظلم و عدوان سے ٹکرانے کے لیے کھڑا تھا۔ تاریخ کی آنکھوں نے یہ منظر پہلی اور آخری بار دیکھا کہ ہزاروں تلواریں حق وصداقت کی اس ایک تلوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ہو رہی تھیں۔ اس وقت بھی وہ ظلم وستم اور اللہ کی نافرمانی کے سامنے سر جھکا کر نہ صرف اپنی زندگی بچا سکتا تھا بلکہ

ایک اشارۂ ابرو سے دنیا بھر کے عیش و آرام حاصل کر سکتا تھا۔ دنیاوی شوکت و حشمت کے حصول کے لیے اس کی ہر آرزو پوری ہو سکتی تھی۔ مطالبہ صرف اتنا تھا کہ وہ یزید کو خلیفہ تسلیم کرے۔ اس کے بعد خاندان نبوت کے لیے ہر بڑے سے بڑا اعزاز حاضر تھا۔ وہی ان گنت تلواریں جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا مقدس خون چاٹنے کے لیے بجلی بن کر چاروں طرف لہرا رہی تھیں وہی ان کی حفاظت کے لیے سایہ بن جاتیں مگر وہ دل تو توحید الٰہی کا پرستار تھا اور اس سر میں محبوب حقیقی کے عشق کا سودا سما چکا تھا۔ وہاں تو صداقت کی لاج کا سوال پیدا ہو چکا تھا اور اسلام کی عظمت ترازو کے ایک پلڑے میں تھی اور دوسرے میں دنیا اپنی تمام دل کشیوں اور رعنائیوں کے ساتھ خاتم النبیین رحمۃ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے اور سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے لخت جگر کے فیصلے کی منتظر تھی۔ وہ اس شاہِ دوسرا (فداہٗ ابی وامی) کا نواسہ تھا جس نے اپنے مشفق و مہربان چچا کو فرمایا تھا کہ اگر میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے پر سورج بھی رکھ دیا جائے تو میں حق و صداقت کی آواز بلند کرنے سے باز نہیں رہوں گا۔ دنیا کی دلکشی اور رعنائی ان کے پائے استقلال کو کیسے متزلزل کر سکتی تھی؟ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے تن تنہا پورے یزیدی لشکر اور ظالم فرمانروا کی حشمت و صولت کو میدان کربلا میں للکار کر اپنے اٹل فیصلے کا اعلان کر دیا کہ وہ دنیا کے نہیں دین کے شیدائی ہیں۔ وہ شجاعت و دلیری سے لڑتے ہوئے کئی زخم کھا کر جام شہادت نوش فرما گئے۔ ایک ظالم کوفی نے آگے بڑھ کر ان کا سر تن سے جدا کر دیا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی درد واندوہ میں ڈوبی ہوئی آواز نے فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر دیا۔ فرمایا۔

"اگر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم سے پوچھ لیا کہ تم نے میرے وصال کے بعد آخری امت ہونے کے باوجود میرے اہل بیت سے کیا سلوک کیا؟ تو کیا جواب دو گے۔ تم نے ان میں سے بعض کو قیدی بنا رکھا ہے اور بعض کا

خون بہایا ہے۔ کیا میری ہدایت کا تم نے یہ بدلہ دیا ہے کہ میرے بعد میرے اہل بیت کے ساتھ بدسلوکیاں کیں؟"

مگر ظالموں نے حضرت امام مظلوم رضی اللہ عنہ کا سر مبارک تن سے جدا کرنے کے بعد ان کی زخموں سے چور نعش مبارک کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روند ڈالا۔ ذرا اندازہ کیجئے اس وقت اپنے محبوب بھائی سے بے پناہ محبت کرنے والی بہن نے کن آنکھوں سے یہ اندوہناک منظر دیکھا ہوگا۔ ابن اثیر کی روایت ہے کہ اس وقت فرط غم سے بے تاب ہو کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے مدینہ منورہ کی طرف منہ کر کے اپنے نانا سے ان الفاظ میں فریاد کی۔

"یا رسول اللہ! دیکھ لیجئے، یہ تڑپتی ہوئی، خاک وخون میں لتھڑی ہوئی لاش آپ کے پیارے حسین رضی اللہ عنہ کی ہے۔ دشمنوں نے اس کا وہ جسم جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوش مبارک کی زینت بنا کرتا تھا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ دیکھئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں طوق وسلاسل میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اے سرور دو عالم! آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین رضی اللہ عنہ کی جی بھر کر رسوائی کی گئی ہے۔ اے غلام زادوں نے بے رحمی سے شہید کر دیا ہے۔ حسین رضی اللہ عنہ کی اولاد کو قیدیو ں کی طرح ہنکایا جا رہا ہے۔ آپ کے حسین رضی اللہ عنہ کا سر قلم کر لیا گیا ہے۔ سر سے عمامہ اور جسم سے چادر بھی اتار لی گئی ہے۔ چاشت کے وقت حسین رضی اللہ عنہ خیمے میں تھے۔ اب نہ خیمہ ہے اور نہ کچھ اور طنابیں تک کاٹ دی گئی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسین رضی اللہ عنہ نے زخم پر زخم کھائے ہیں۔ وہ نڈھال ہو کر بھوکا پیاسا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہی وہ حسین رضی اللہ عنہ ہے جس کا نانا امام الانبیاء اور حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔"

اسی فریاد کے پس منظر میں سانحہ کربلا کی تفصیلات پڑھیں تو دل خون ہو جاتا

ہے۔ دشمنوں نے خیموں کو آگ لگا دی تھی اور سامان بھی لوٹ لیا تھا۔ ایک سفاک نے بیمار زین العابدین کو بھی قتل کرنا چاہا۔ مگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان سے لپٹ گئیں اور ان کو شہید ہونے سے بچا لیا۔ اہل بیت کی تمام محترم اور مقدس خواتین کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اور ان کو قیدیوں کی طرح ہنکایا جا رہا تھا۔ شہادت امام حسین رضی اللہ عنہ کے بعد اس غریب الوطن اور مظلوم قافلے کو گرفتار کر کے کوفے کی طرف چلنے کا حکم دیا گیا۔ زینب رضی اللہ عنہا بے اختیار اپنے بھائی کی سر بریدہ لاش سے چمٹ گئیں۔ اور زار و قطار روتے ہوئے فرمایا۔ "اے میرے عزیز بھائی! میں نے تجھے خدا کے سپرد کیا۔ میں غم واندوہ کی وجہ سے جدا نہیں ہو رہی بلکہ تیرے قاتل مجھے تیری لاش سے زبردستی ہٹا رہے ہیں۔"

ابن قیس کی روایت ہے کہ جب عمر بن سعد میدان جنگ سے خواتین اور بچوں کو ساتھ لے کر روانہ ہوا تو عورتوں نے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، ان کے لڑکوں اور عزیزوں کی پامال لاشیں دیکھیں تو ضبط نہ کر سکیں اور آہ و فریاد کی دلدوز صدائیں بلند ہو گئیں۔ عمر بن سعد کہتا ہے کہ میں گھوڑا لے کر قریب پہنچا میں نے آج سے پہلے اس قدر حسین عورتیں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ مجھے زینب بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا یہ بین کسی طرح نہیں بھولتا۔

> "اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! تجھ پر آسمان کے فرشتوں کا درود و سلام" یہ دیکھ حسین ریگستان میں پڑا ہے، خاک وخون سے آلودہ ہے۔ تمام بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ تیری بیٹیاں قیدی ہیں، تیری اولاد مقتول ہے۔ ہوا ان پر خاک ڈال رہی ہے۔"

دو روز بعد مظلومین اہل بیت کا یہ جلوس اس طرح کوفے کی طرف روانہ ہوا کہ قیدی خواتین حرم کے آگے سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک تھا جسے ظالموں نے نیزے پر چڑھا رکھا تھا۔ جب کوفہ میں داخل ہوئے تو شہر کے تمام لوگ،

عورتیں، مرد اور بچے گھروں سے باہر نکل آئے اور اہل بیت کی یہ حالت دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ اور لوگوں کی آہ بکا سے فضا معمور ہوگئی تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے گرجدار آواز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اے کوفہ والو۔ بدعہدو! تم وہی ہو جنہوں نے وعدہ خلافی کی اور اب تم بلک بلک کر رو رہے ہو۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے۔ جو سوت کاتتی ہے اور جب کات چکتی ہے تو اپنے ہاتھوں سے دھاگے توڑ ڈالتی ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم میں سے ایک شخص بھی ایسا ہے جو جھوٹا۔ وعدہ خلاف اور بڑھانکنے والا نہ ہو۔ جس کے دل میں فتور اور نظروں میں کھوٹ نہ ہو۔ جس کی عادت میں فریب نہ ہو جو دشمنوں کی طرح دل میں بغض نہ رکھتا ہو اور جو راہ حق سے منہ موڑ کر بے دینی پر تلا ہوا نہ ہو۔ تم سے تمہارا خدا ناراض ہے اور تم پر اس کا قہر نازل ہو کر رہے گا۔ جھوٹے اور فریب کار کوفیو! تم میرے بھائی کی شہادت پر مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہو۔ ہاں خدا کی قسم! خوب آہ و زاری کرو۔ خوب آنسو بہاؤ۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔ ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔ یہ بدنما داغ جو تمہارے دامن پر لگ چکے ہیں ان آنسوؤں کے پانی سے نہیں دھل سکتے۔ تم نے جس برے کردار کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے تمہیں جنت سے محروم کر دیا ہے تمہاری یہ حرکت تمہیں سانپ بن کر ڈستی رہے گی۔ کیا تم ذلت و خواری کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہو تمہیں اس کا احساس نہیں۔ قدرت نے اب نیکی کی صلاحیتیں تم سے سلب کر لی ہیں۔ تم بے دست و پا ہو۔ تمہاری صورتیں مسخ ہو چکی ہیں۔ کوفیو! تم نے اللہ کے رسول کی بیٹیوں کی تحقیر و تذلیل کی ہے۔ تمہارا جرم اتنا بڑا ہے کہ اس کی پاداش میں تمہاری صورتیں مسخ ہوں گی اور تم ہمیشہ مصائب و آلام میں مبتلا ہو

گے کیا عجب ہے کہ تم پر خون کی بارش ہو۔"

ابن کثیر جو اسی عہد کا ایک بہت بڑا ادیب اور مقرر تھا اس وقت مجمع میں موجود تھا۔اس نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی تقریر سے متاثر ہو کر کہا۔

"میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں! اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے عمر رسیدہ بزرگ، آپ کی عورتیں، آپ کے جوان، غرضیکہ آپ کا پوار خاندان دوسروں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔آپ وہ ہیں جن کی گردنیں باطل کے سامنے جھکنے کی عادی نہیں ہیں۔اور آپ وہ ہیں۔صدق گوئی اور حق پرستی جن کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔"

اس کے بعد اہل بیت کی ستم رسیدہ خواتین کو عبیداللہ بن زیاد کے سامنے پیش کیا گیا۔اس وقت حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بے حد معمولی لباس پہن رکھا تھا اور وہ پہچانی نہ جاتی تھیں۔ابن زیاد نے پوچھا۔یہ کون بیٹھی ہے"؟ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے کوئی جواب نہ دیا۔ابن زیاد نے تین مرتبہ یہی سوال دہرایا مگر آپ خاموش رہیں۔تب ان کی کنیز نے جواب دیا۔یہ زینب بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں"۔ابن زیاد نے طنزیہ انداز میں کہا۔اس خدا کی پرستش جس نے تم لوگوں کو رسوا اور ہلاک کیا ہے اور تمہارے نام کو بٹہ لگایا۔" یہ سنتے ہی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے گرج کر جواب دیا۔

"ہزار ستائش اس خدا کے لیے جس نے ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عزت بخشی اور ہمیں پاک کیا۔نہ کہ جیسا تو کہتا ہے۔فاسق رسوا ہوتے ہیں اور فاجروں کے نام کو بٹہ لگتا ہے۔"

ابن زیاد نے پھر کہا:

"تو نے دیکھا کہ خدا نے تیرے خاندان کے ساتھ کیا سلوک کیا۔"

حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''ان کی قسمت میں شہادت لکھی تھی اس لیے وہ مقتل میں پہنچ گئے۔ عنقریب خدا انہیں اور تجھے ایک جگہ جمع کر دے گا اور تم باہم اس کے حضور سوال و جواب کر لو گے۔''

ابن زیاد یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا تو عمرو بن حریث نے کہا۔ ''خدا امیر کو سنوارے۔ یہ تو محض ایک عورت ہے عورتوں کی بات کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔'' ابن زیاد نے پھر جھنجلا کر کہا۔ ''خدا نے تیرے سرکش سردار اور تیرے اہل بیت کے نافرمان باغیوں کی طرف سے میرا دل ٹھنڈا کر دیا۔''

اس پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آبدیدہ ہو کر فرمایا:

''خدا کی قسم تو نے میرے سردار کو قتل کر ڈالا۔ میرا خاندان مٹا دیا۔ میری شاخیں کاٹ دیں۔ میری جڑ اکھاڑ دی۔ اگر اس سے تیرا دل ٹھنڈا ہو سکتا ہے تو ہو جائے۔''

ابن زیاد نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ شجاعت ہے تیرا باپ بھی شاعر اور شجاع تھا۔'' حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے جواب دیا۔ ''عورت کو شجاعت سے کیا سروکار۔ میری مصیبت نے مجھے شجاعت سے غافل کر دیا ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں یہ تو دل کی آگ ہے۔''

اس کے بعد ملعون ابن زیاد نے حضرت زین العابدین کے ایک جواب سے برافروختہ ہو کر انہیں قتل کرنے کا حکم جاری کر دیا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا بے قرار ہو کر چیخ اٹھیں اور کہا۔ ''میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ اگر تو اس لڑکے کو ضرور ہی قتل کرنا چاہتا ہے تو مجھے بھی اس کے ساتھ مار ڈال۔'' ابن زیاد دیر تک حیرت کے ساتھ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ رشتہ بھی کیا عجب چیز ہے۔ اللہ کی قسم مجھے یقین ہے کہ یہ سچے دل سے اس لڑکے کے ساتھ قتل ہونا

چاہتی ہے۔ اچھا اس لڑکے کو رہا کر دو اور اسے بھی دوسری عورتوں کے ساتھ جانے دو۔

(ابن جریر کامل)

ابن زیاد نے اس بے سروسامان قافلے کو سیدنا حضرت امام شہید کے سر مبارک کے ساتھ یزید کے پاس روانہ کر دیا۔ الانوار میں لکھا ہے کہ جب یہ قافلہ دمشق پہنچا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا دردناک اشعار پڑھ رہی تھیں۔ ان کا مطلب یہ تھا۔

"اے اہل بیت! کیا تمہیں اس حادثے نے غم زدہ نہیں کیا۔ کہ امام حسین رضی اللہ عنہ بھوکے پیاسے شہید ہوئے جب کہ ان کے علاوہ ہر شخص سیراب تھا۔ حسین رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے ہر چند کہا کہ میرے باپ علی المرتضٰے ہیں جو متقی اور پرہیز گار تھے۔ میری ماں سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا ہیں۔ جو زہد و اتقا میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ لیکن لوگوں نے کہا تو یہی کہا کہ تمہارے لیے آب تیغ تو ہے آب فرات نہیں۔"

جب یہ لوگ یزید کے دربار میں پیش کئے گئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق ایک سرخ رنگ کا شامی شخص کھڑا ہوا اور یزید سے کہنے لگا۔ اے امیر! یہ لڑکی مجھے عنایت کر دیجئے اور میری طرف اشارہ کیا۔ اس وقت میں کم عمر اور خوب صورت تھی۔ یہ سن کر خوف سے کانپنے لگی اور اپنی بہن زینب رضی اللہ عنہا کی چادر مضبوطی سے پکڑ لی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے پکار کر کہا۔ "تو کمینہ ہے۔ نہ تجھے اس کا اختیار ہے اور نہ یزید کو اس کا حق ہے۔" یزید کو یہ سن کر سخت غصہ آیا۔ اور اس نے غضب ناک آواز میں کہا۔ "تو جھوٹ بکتی ہے خدا کی قسم مجھے یہ حق حاصل ہے اگر چاہوں تو ابھی کر سکتا ہوں۔" حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اسی طرح سخت لہجے میں جواب دیا۔ "ہرگز نہیں۔ خدا نے تمہیں یہ حق نہیں دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تم ہماری ملت سے نکل جاؤ اور ہمارا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کر لو' یہ سخت جواب سن کر یزید اور

بھی برہم ہوا اور کہنے لگا کہ دین سے تیرا باپ اور بھائی نکل چکے ہیں۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ کے دین سے، میرے باپ کے دین سے، میرے بھائی کے دین سے، میرے نانا کے دین دے، تو نے، تیرے باپ نے ہدایت پائی ہے۔ یزید نے چلا کر کہا۔ ''اے دشمن خدا تو جھوٹی ہے۔'' اس موقع پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ظالم و جابر یزید کے سامنے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اس خطبے کے ہر ایک لفظ سے جرأت و بسالت حق گوئی دبے باکی، خود اعتمادی اور اسلام کی محبت ٹپکتی ہے۔ وہ ایک بے بس و مجبور اور بے دست و پا قیدی کی حیثیت سے یزید کے سامنے کھڑی تھیں۔ مگر ان کی تقریر میں بادل کی کڑک، بجلی کی چمک اور طوفان کا ساز ورتھا۔ دیکھئے ایک جابر ترین حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی روایات کو حضرت امام شہید رضی اللہ عنہ کی بہن نے کس طرح زندہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان عورت بدترین حالات اور خوفناک ترین مصائب میں بھی ظلم و تشدد اور جبر و عدوان سے مرعوب ہونا نہیں جانتی۔ آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

''اے یزید! اگر تو نے اللہ کی زمین کو اس کی وسعتوں کے باوجود ہم لوگوں پر تنگ کر دیا ہے۔ اور ہم تیرے قبضے میں آگئے ہیں۔ ہمیں زنجیروں میں جکڑ کر کشاں کشاں تیرے پاس لایا گیا ہے۔ تو کیا تو نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اللہ نے ہمیں ذلت میں مبتلا کر دیا ہے اور تجھے عزت عطا کی ہے۔ تیرے سر پر غرور اور تکبر کا نشہ سوار ہے۔ تجھے اس بات پر فخر ہے کہ تیرے ارد گرد ہاں میں ہاں ملانے والے لوگ جمع ہیں۔

تجھے اس بات پر ناز ہے کہ تو اپنی خواہش کے مطابق حکومت کر رہا ہے اس وقت جب کہ پورے ملک پر تیرا قبضہ ہو چکا ہے۔ اور تیرے لیے راستہ ہموار ہو چکا ہے۔ شاید تو یہ سمجھتا ہے کہ یہ حکومت ہمیشہ کے لیے تیرے حصے

میں آ گئی ہے۔ چند دن انتظار کر۔ ابھی سے اتنا مغرور نہ بن۔ کیا تو اللہ کا یہ فرمان بھول گیا ہے کہ منکرین یہ نہ سمجھیں کہ ہم انہیں مہلت دیتے ہیں اس میں ان کے لیے بہتری ہے مہلت تو ہم اس لیے دیتے ہیں تا کہ وہ اور زیادہ گنہگار ہو جائیں۔ آخر کار ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اے یزید! کیا یہ انصاف ہے کہ تیری عورتیں تو پردے میں رہیں اور رسول ﷺ کی بیٹیاں بے حجاب پھرائی جائیں۔ انہیں قیدی بنایا جائے دشمن انہیں شہر بہ شہر لیے پھریں۔ تیرے سر پھرے سپاہی نہایت گستاخی کے ساتھ انہیں گھور گھور کر دیکھیں۔ ان کے ساتھ نہ تو مردوں میں کوئی سرپرست ہے۔ اور نہ کوئی حمایت کرنے والا۔

اے یزید! تیرا یہ فعل خدا سے بغاوت نہیں ہے تو کیا ہے۔ اگر اسے خدا کے رسول سے انکار نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ بھلا اس شخص سے کیا امید کی جا سکتی ہے جس کی تیغ زبان نے شہداء کے قلوب مجروح کئے۔ جس نے پاکیزہ اور برگزیدہ ہستیوں کے جگر چبائے عرب میں جو خدا کی منکر جماعت ہے تم اس سے بھی زیادہ سخت، خدا اور اس کے رسول کے منکر ہو۔ خدا کے رسول سے تم کو بَیر ہے۔

اے یزید! تو نے اولاد نبی کو بے دردی سے ذبح کر کے پرانی عداوت کا بدلہ لیا ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ تیری خواہش یہ ہو گی کہ دنیا میں نہ تیرے ہاتھ ہوتے اور نہ زبان تا کہ جو کچھ تو کرتا اور کہتا رہا ہے نہ ہوتا۔

یزید! عنقریب تو اور شہداء ایک جگہ جمع ہوں گے۔ تیری ماں اس وقت یہ خواہش کرے گی کہ کاش! تو اس کے پیٹ سے پیدا نہ ہوتا۔ اور تیرے باپ کی خواہش یہ ہو گی کہ کاش! تو اس کا بیٹا نہ ہوتا۔ اس دن ہم تجھے اللہ

کے قہر وغضب کا نشانہ بنتے ہوئے پائیں گے۔ہم کہیں گے کہ اے خدا! اس پر اپنا قہر نازل کر۔رسول خدا ﷺ بھی سخت افسردہ ہوں گے اے یزید! یہ وقت کا انقلاب ہے کہ آج مجھے تیرے سامنے لب کشائی پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ورنہ یقین جان کہ میں تجھ سے سخت نفرت کرتی ہوں اور میں تجھے ذلیل سمجھتی ہوں۔تیری سخت گیری اور دشمنی کا میرے دل پر بڑا اثر ہے۔ میرے دل سے ہوک اور میرے سینے سے آہیں نکلتی ہیں۔اگر تو نے یہ سمجھا ہے کہ ہم بکریوں کا ریوڑ ہیں تو عنقریب تجھ پر یہ بات روشن ہو جائے گی کہ ہم قہر وغضب کے عالم میں بپھرے ہوئے شیروں سے بھی زیادہ غضب ناک ہیں اور اس بات کا علم تجھے اس وقت ہوگا جب تیرے اردگرد نوکروں، چاکروں، غلاموں اور کنیزوں کا ہجوم نہ ہوگا۔یزید! تو اپنی دھن میں مست رہ کر جو جی میں آئے کرتا جا مگر قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمارے خاندان کو وحی والہام کے شرف سے نوازا۔ہم کو زیادہ دیر تک اس حال میں نہیں رکھے گا۔دنیا سے ہمارے نقوش نہیں مٹیں گے۔تو نے ہم پر جو مظالم کیے ہیں تجھے ان کا بدلہ ضرور ملے گا۔تو مکر وفریب کی ایک پوٹ ہے اور تیرا یہ اقتدار چند روزہ ہے۔تیری حکومت تباہ و برباد ہونے والی چیز ہے۔''

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی یہ پیش گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔تین سال سات ماہ بعد یزید درد قولنج میں مبتلا ہوا اور تڑپ تڑپ کر ۶۴ھ میں مر گیا۔مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے معاویہ کو وصیت کے لیے بلایا مگر وہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ مجھے ایسی سلطنت نہیں چاہیے جس کی بنیاد اولاد رسول کے خون پر رکھی گئی ہو۔۶۶ھ میں ایک شخص مختار بن عبید ثقفی عذاب الٰہی بن کر ظاہر ہوا اور اس نے اقتدار حاصل کرتے ہی تمام قاتلان حسین کو سخت اذیتیں دے کر قتل کیا۔

حضرت فاطمہ بنت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جب یزید نے حضرت زینب کو کہا کہ اے دشمن خدا تو جھوٹی ہے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تو زبردستی حاکم بن بیٹھا ہے ظلم سے گالیاں دیتا ہے۔ اپنی طاقت سے مخلوق کو دباتا ہے۔'' حضرت فاطمہ کہتی ہیں کہ یہ سن کر یزید شاید شرمندہ ہوگیا کیونکہ پھر وہ خاموش رہا۔ مگر وہ شامی جس نے حضرت فاطمہ بنت علی رضی اللہ عنہ کا مطالبہ کیا تھا پھر کھڑا ہوا اور وہی بات دہرائی۔ اس پر یزید نے اس کو غضب ناک آواز میں ڈانٹ کر کہا۔ ''دور ہو کمبخت۔ خدا تجھے موت کا تحفہ بخشے۔''

اس کے بعد یزید نے انہیں عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور چند روز بعد نہایت اچھے طریقے سے اپنے ایک معتبر آدمی کے ساتھ مدینہ روانہ کر دیا۔ راستے میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھائی کی قبر دیکھی تو دل بھر آیا اور فرمایا۔ ''اے میرے شفیق بھائی! اے میری ماں کے نور عین، کس منہ اور کس زبان سے وہ مصائب اور سختیاں بیان کروں جو آپ کی جدائی کے بعد ہم پر ہوئیں۔ اس قوم نے ہمیں رسوا کیا۔ ہماری تشہیر کی۔ ہمیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں۔ ہم سے سخت کلامی کی گئی۔ میں کن کن سختیوں کا حال بیان کروں۔''

مدینہ کے قریب پہنچ کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی چوڑیاں اور کنگن اتار کر اس شخص کو بھیجے جو ان کے ساتھ آیا تھا۔ اور راستے میں اچھا سلوک کرتا رہا تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہلا بھیجا کہ یہ تمہاری نیکی کا بدلہ ہے۔ اس وقت ہمارے پاس کچھ نہیں ہے جو تمہیں دیں مگر اس شخص نے یہ زیورات واپس کر دیئے۔ اللہ اکبر! اس حالت میں بھی فیاضی اور مروت کا یہ عالم تھا کہ اس شخص کا خالی ہاتھ جانا گوارا نہ ہوا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب یہ قافلہ خستہ و خراب حالت میں گنبد خضرا کے سامنے پہنچا تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے لپٹ کر فریاد کی۔

"اے اللہ کے رسول ﷺ! میں یہ خبر لے کر آئی ہوں کہ آپ ﷺ کی اولاد کربلا میں بے دردی کے ساتھ بھوکی پیاسی شہید کر دی گئی ہے۔ آپ ﷺ کی بیٹیاں رسوائی اور بے سروسامانی کے عالم میں قید و بند کی مصیبتیں جھیل کر آئی ہیں۔"

اس کے بعد مدینہ میں ہر وقت عورتوں کی بھیڑ آپ کے گرد جمع رہتی اور عام اہل مدینہ کا اجتماع رہتا تھا۔ یزید کے خلاف حجاز میں سخت نفرت پھیل چکی تھی۔ اور لوگ بے حد مشتعل ہو رہے تھے۔ والی مدینہ نے یزید کو حالات سے باخبر کیا تو اس نے حکم دیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کہا جائے کہ کسی دوسری جگہ جو انہیں پسند ہو تشریف لے جائیں۔ پہلے حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے انکار کر دیا مگر پھر لوگوں کے سمجھانے پر مصر جانے کے لیے رضامندی ظاہر کی اور والی مصر کے محل دار الحمراء میں قیام فرمایا۔ بعض کہتے ہیں کہ ۶۲ھ میں طاعون یا قحط پھیلنے کی وجہ سے شام چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد اہل مدینہ نے یزید کے خلاف بغاوت کر دی جو حادثۂ حرہ کے نام سے مشہور ہے۔ یزیدی افواج نے یزید افواج نے مدینہ پہنچ کر گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور تین دن تک قتل و غارت کا بازار گرم رکھا۔ اس واقعہ کے بعد یزید نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو کافی وظیفہ دینے کی کوشش کی۔ مگر آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ۶۲ھ میں شام میں وفات پائی اور ان کا مزار دمشق کے ایک قصبے زینبیہ میں ہے۔

حضرت زینب بنت زہرا رضی اللہ عنہا کی پاک زندگی جن حیرت انگیز اوصاف کا مجموعہ ہے ان کی ایک معمولی سی جھلک آپ نے گذشتہ صفحات میں دیکھ لی ہے۔ یہ ان کے سیرت و کردار کی وہ روشنی ہے جو ماضی کے کئی دبیز پردوں سے چھن چھن کر آ رہی

ہے اگرچہ ماضی کے گہرے دھندلکوں نے اس کی حقیقی تابانی ہم تک نہیں پہنچنے دی۔ اس کے باوجود حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی سیرت کا نور آج بھی ہمارے قلب و ذہن کو منور کر رہا ہے ہمارے ہاں ان لوگوں کی کمی نہیں جو رسمی باتوں پر مر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور روایات پر جانیں نچھاور کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے ہیں۔ ان پاک ہستیوں کی محبت اور عقیدت کے نشے میں سرشار رہنے والے بھی بہت ہیں جو اپنی بیٹیوں کو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاک نام سے منسوب کر کے سمجھتے ہیں کہ عقیدت کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بے پناہ مصائب پر آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے رواں رکھ کر ثواب حاصل کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ آیئے ایک لمحہ کے لیے ایمانداری سے غور کریں کہ ہماری ملت نے کتنی ایسی خواتین کو جنم دیا ہے جن کے تصور و تخیل نے بھی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی رفعتوں اور اخلاقی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کی ہے؟

صرف زینب نام رکھ لینے اور ان کو پیش آنے والے دردناک مصائب کو قصے کہانیوں کی طرح بیان کر دینے سے ہم انہیں خراج عقیدت ادا نہیں کر سکتے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی پوری زندگی اس حقیقت کی ترجمان ہے کہ مسلمان عورت تقویٰ و طہارت کا پیکر ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی آزمائش اور بدترین مصیبت بھی انہیں جادۂ حق سے نہیں ہٹا سکتی اور نہ اسے یاد الٰہی سے غافل کر سکتی ہے۔ وہ حق و صداقت کی حفاظت کے لیے اپنے خون سے سینچے ہوئے گلستان حیات کو خاکستر ہوتا دیکھ سکتی ہے مگر باطل کے سامنے نہیں جھک سکتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کمزور ہوتی ہے مگر مسلمان عورت عزم و ارادے کی آہنی چٹان ہوتی ہے۔ طوفان اس سے ٹکرا کر رخ بدل سکتے ہیں۔ مگر اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو سیدنا امام حسین علیہ السلام سے جو بے پناہ محبت تھی کیا اس کے پیش نظر وہ بھائی کو یزید کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کا مشورہ نہ دے سکتی تھیں۔ جب انہیں موت سامنے دکھائی دے رہی تھی وہ اپنے بچوں کو

لے کر بھائی سے علیحدہ ہونے پر قادر نہ تھیں جبکہ عام عورتیں معمولی اغراض کے لیے بھائیوں سے ہمیشہ کے لیے تعلقات منقطع کر لیتی ہیں۔ وہ کہہ سکتی تھیں کہ بھائی آپ میرا مشورہ تسلیم نہیں کرتے اور جان بوجھ کر موت کے گڑھے کی طرف جا رہے ہیں۔ میں اپنے بیٹوں کو موت کا لقمہ کیوں بننے دوں؟ کون نہیں جانتا کہ ماں کی ممتا اکثر و بیشتر بھائی کی محبت پر غالب آ جاتی ہے۔ ایک عورت اپنے حقیقی بھائی کو چھوڑ سکتی ہے مگر اپنی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہلاک ہوتے دیکھنا تو کیا کچھ عرصے کے لیے چھوڑنا بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ ان معاملات کو ہماری عورتیں خوب سمجھتی ہیں کہ وہ کس طرح اپنے بھائیوں کی بیویوں اور بچوں تک سے حاسدانہ رویہ اختیار کر کے یہ خون کا رشتہ بھی توڑ سکتی ہیں۔ مگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے جس فقید المثال کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک مسلمان عورت کے لیے نسوانی روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی بدولت حالات کی نزاکت کا پورا احساس تھا مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنی صاحب شرف و فضیلت ماں کی وصیت پر لخت ہائے قلب و جگر کے پھول نچھاور کیے۔ میدان کربلا میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیز و اقارب کو خاک و خون میں لوٹتے دیکھا۔ ننھے ننھے معصوم بچوں کے دلوں میں زہریلے تیر پیوست ہوتے دیکھے پورے خاندان کو ریگ زار کربلا میں شدت پیاس سے تڑپتے دیکھا۔ اپنے دو نوعمر بیٹوں کی المناک شہادت کا دل ہلا دینے والا نظارہ دیکھا۔ بھوک اور پیاس کی ناقابل بیان سختیاں سہیں۔ مگر کبھی شکوہ و شکایت کا ایک حرف بھی ان کے منہ سے نکلا؟ کبھی انہوں نے بھائی سے کہا کہ ہم سب کو کس مصیبت میں مبتلا کر دیا آپ رضی اللہ عنہا نے کہا ہو کہ بھائی جایئے یزید کی بیعت کر لیجیے۔ ایک عورت کے لیے اس سے زیادہ ڈگمگا دینے والا مرحلہ اور کونسا ہو سکتا ہے کہ اس کے سامنے پورے خاندان کی لاشیں پڑی ہیں اور ایک آخری سہارا بھی بہت جلد چھن جانے والا ہے؟ پورے

خاندان فرات خون میں ڈوب چکا ہے اور اب ظلم و ستم کی آگ کے شعلے اس کے بے یارو مددگار بھائی کی طرف لپک رہے ہیں؟ زندگی کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی ہیں، اور اس ویران و سنسان صحراء کے اندھیرے میں صرف خون آشام تلواروں کی چمک نظر آرہی ہے پھر یہ بھی معلوم ہے کہ چشم زدن میں ان تمام مصائب و آلام کا نہ صرف خاتمہ ہو سکتا ہے بلکہ دنیا کا بڑے سے بڑا اعزازان کے قدموں میں سجدہ ریز ہو سکتا ہے۔ صرف یزید کی اطاعت قبول کر لینے سے عیش و عشرت کے خزانے ان کے راستوں میں بچھ سکتے ہیں۔ اور یزید ہر شہید کے ایک ایک قطرۂ خون کے لیے لاکھوں دینار بطور خوں بہادے سکتا ہے۔ ایسے پر آشوب اور پر آزمائش ماحول میں صرف ایک سچی مسلمان عورت ہی ثابت قدم رہ سکتی ہے کیا دنیا کی کوئی مریم صفات بہن بھی اس صبر و استقلال، عزم و ثبات اور ایثار و قربانی کی ادنیٰ سی مثال پیش کر سکتی ہے؟ کیا تاریخ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مقابلے میں ایک بھی ایسی عورت پیش کر سکتی ہے جس نے بہن کا اتنا بلند اور ارفع کردار ادا کیا۔ پوری تاریخ پڑھ جایئے۔ بدترین دشمن بھی شہادت دیں گے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی کو جادۂ حق سے سرمو انحراف کرنے کا اشارہ تک نہیں کیا بلکہ اپنے جان سے عزیز بھائی کو تن تنہا لڑتے اور زخموں سے چھلنی ہو کر شہید ہوتے دیکھا۔ سب کے ساتھ ان کا بھی سر قلم ہوتے دیکھا۔ ان کے جسد اطہر کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پائمال ہوتے دیکھا۔ خیموں کو جلتے اور لٹتے ہوئے دیکھا مگر کہا تو یہی کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تجھ پر درود و سلام، اپنے نواسے کی حالت دیکھ لیجئے۔ ابن زیاد ایسے جابر و ظالم کے غرور و نخوت کو اپنے حیا پرور قدموں سے کچل کر رکھ دیا اور یزید کے بھرے دربار میں اس تباہ حال اور بے یارو مددگار خاتون معظمہ نے بڑی جرأت و بسالت کے ساتھ کلمۂ حق بلند کیا۔ اسے برملا وہ سب کچھ کہا جسے ایک خود مختار اور ظالم حکمران ایک لمحہ کے لیے برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا یہ صرف بھائی کی محبت

تھی بھائی کی محبت کا جذبہ فطری حد تک درست مگر جس قوت اور طاقت نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے سامنے اوج ثریا کو سرنگوں کر دیا وہ ان کی روحانی طاقت تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھیں کہ ان کا بھائی کسی دنیاوی غرض کے لیے سینہ سپر نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کے دین کی حفاظت و بقا کے لیے موت سے ٹکرا رہا ہے۔ ان کی تمام قربانیاں اسلام کے لیے تھیں۔ وہ اپنے نانا کے دین کی لاج رکھنے کے لیے بھائی کا ساتھ دے رہی تھیں۔ انہیں دنیا سے کیا غرض جاہ پرستی اور دنیا کی محبت کیسے ان کے قدموں کو متزلزل کر سکتی تھی؟ ورنہ دنیا تو اپنے حسن و جمال اور آسائشوں کے ساتھ آغوش وا کیے سامنے کھڑی تھی صرف چند قدم آگے بڑھ کر سر جھکانے کی دیر تھی۔ مگر وہ سر کٹ گئے۔ اللہ کی چوکھٹ کے سوا کسی کے دربار میں جھکے نہیں۔ ورنہ آج مسلمان کسی سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل نہ ہوتے اور اسلام کی آبرو لٹ جاتی اور میدان کربلا حسین علیہ السلام کا نہیں ناموس اسلام کا مدفن بنتا۔

کیا حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے عقیدت رکھنے والی بہنیں یہ سوچنا گوارا کریں گی کہ مصیبت زدہ زینب رضی اللہ عنہا کی انگشت شہادت انہیں کس منزل کا راستہ دکھا رہی ہے۔

حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا

(زوجہ حضرت امام حسین علیہ السلام)

شہنشاہ ایران یزدگرد کی سطوت وشوکت کے آغوش میں پل کر جوان ہونے والی، سلیم الفطرت خاتون، جس کا اشارۂ ابرو قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کے پاؤں صرف زربفت وکمخواب کے فرش سے آشنا تھے۔ جو کھلونوں کی جگہ ہیروں اور جواہرات سے کھیلتی رہی۔ جس کی خدمت کے لئے ہزاروں غلام اوران گنت کنیزیں موجود تھیں۔ جس کے کان عیش وعشرت کے رسیلے نغموں سے واقف تھے۔ جس کی آنکھوں نے ہمیشہ شاہانہ عظمت وجلالت کے مناظر دیکھے تھے جس کے منہ سے نکلا ہوا ہر جملہ فرمان شاہی تھا...... وہ اس عظیم الشان سلطنت کی شہزادی تھی جسے کئی ممالک خراج دیتے تھے۔ وہ اس باپ کی بیٹی تھی جسے کسریٰ کا لقب حاصل تھا اور دنیا اس کا نام سن کر کانپ اٹھتی تھی...... امام حسین رضی اللہ عنہ کے خانہ فقر میں آئی تو ایک سادہ منش اور درویش عورت تھی۔ شاہی نے فقر وغنا کی خلعت پہن کر تاریخ میں ایک نئی روایت قائم کی جسے شہر بانو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایران کے آخری شہنشاہ یزدگرد کی بیٹی تھیں۔ جو کسریٰ کے لقب سے مشہور تھا

ایک روایت کے مطابق آپ ایران کے مشہور اور زندۂ جاوید انصاف دوست بادشاہ نوشیرواں عادل کی اولاد سے تھیں۔ آپ کی ابتدائی زندگی سے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ ایران میں پیدا ہوئیں اور کسریٰ کے عظیم الشان محلات میں پرورش پائی۔ دنیا کی کوئی نعمت ایسی نہ تھی جو انہیں بچپن سے حاصل نہ رہی ہو۔ اس زمانے میں کسریٰ کی سلطنت دنیا کی بے حد طاقتور اور بہت بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی۔ سینکڑوں چھوٹے بڑے صوبے کسریٰ کے زیر حکومت تھے اور کئی بادشاہ اسے خراج ادا کرتے تھے۔ وسیع و عریض سلطنت کے علاوہ وہ بے شمار خزانوں کا مالک تھا۔ اور اس کے پاس فنونِ حرب سے واقف جدید ترین ہتھیاروں سے لیس بہت بڑی فوج موجود تھی بڑے رعب اور دبدبے کے ساتھ حکومت کرتا تھا۔ اسں کی بیٹی شاہران نے اسی شہنشاہ کی شوکت خسروانہ کے سائے میں پرورش پائی۔ ظاہر ہے کہ جس کا باپ اتنی رفیع الشان اور عظیم سلطنت کا حکمران ہو اس کے نازونعم کے لیے کیا کچھ فراہم نہ کیا گیا ہوگا۔ زربفت و دیبا کے فرش پر چلنا اس کے پاؤں کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی تھی جاہ وحشم کے لاتعداد مناظر دکھائی دیتے۔ خدام پرے جمائے سر جھکائے ہردم اشارے کے منتظر رہتے۔ خواہش کا اظہار کئے بغیر دینا کی ہر نعمت حاضر ہو جاتی زیورات اور گراں قیمت ملبوسات کا کون اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کے قدموں میں ہر وقت زر و جواہر بچھے رہتے تھے۔ بچپن سے جوانی تک آنکھوں نے صرف حسن و طرب کے مناظر سے ٹھنڈک حاصل کرنا سیکھا تھا۔ کانوں نے صرف خوشی اور مسرت کے نغمات سنے تھے۔ غم واندوہ اور فکر و تردد وہ الفاظ تھے جو ایوان کسریٰ کی چاردیواری کے اندر بالکل بے معنی تھے۔ شاہزادی شاہران نے اس ماحول میں پرورش پائی جہاں ہر قدم پر سینکڑوں نگاہیں تصدق ہوتی تھیں۔ جہاں اس کے ہونٹ ذرا سی جنبش کرتے تو ہزاروں کان کھڑے ہو جاتے۔ معمولی سا اشارہ ہوتا تو پلک جھپکتے میں تعمیل ہوتی۔ اس کی ایک نگاہ

غلط انداز گداؤں کو تونگر کر دیتی۔

ان کے مشرف بہ اسلام ہونے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حبالۂ عقد میں آنے سے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جب ماہ صفر ۱۶ھ میں مسلمانوں نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت ایران کے آخری شہنشاہ یزدگرد کو شکست دے کر اس کے پایۂ تخت مدائن پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں کو وہاں سے بے شمار خزانے، ہیرے جواہرات اور حیرت انگیز قسم کی نادر اور گراں قیمت اشیا ملیں جن میں کسریٰ کا زرنگار تاج شاہی، قیمتی ملبوسات اور دوسری بے شمار چیزوں کے علاوہ ایک بیحد قیمتی فرش بھی تھا جس پر بادشاہ بیٹھ کر شراب پیا کرتا تھا۔ اسی موقع پر اسلامی لشکر نے کسریٰ کی بیٹی شاہران کو بھی گرفتار کر لیا۔ جو لاتعداد ہیرے اور جواہرات وغیرہ سمیٹ کر فرار ہونے کی فکر میں تھی۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو اتنی دولت ملی کہ ہر سوار کے حصے میں بارہ ہزار دینار آئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مال غنیمت کا خمس شاہزادی شاہران کے ساتھ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے تمام مال غنیمت صحابہ میں حسب مراتب تقسیم کر دیا اور کسریٰ کے ملبوسات شاہانہ اور تاج شاہی ایک بدّو محلّم بن رواحہ کو پہنائے تا کہ لوگ کسریٰ ایسے صاحب جلالت و شوکت شہنشاہ کی تباہی اور زوال سے عبرت حاصل کریں۔ اس کے علاوہ مسلمان اللہ کا شکر ادا کریں۔ کہ اسلام کی بدولت انہیں اللہ نے کتنی عظمت عطا فرمائی ہے کہ ایک معمولی بدو دنیا کے بہت بڑے شہنشاہ کے لباس میں ملبوس سب کے سامنے کھڑا ہے۔ مال غنیمت کی تقسیم کے بعد شہزادی شہران بنت کسریٰ دربار خلافت میں پیش کی گئی۔ جس کے ملبوسات قیمتی زر و جواہر سے جگمگا رہے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کے زر و جواہر اتار نے کا حکم دیا لیکن شہران نے سخت مزاحمت کی اور زیورات وغیرہ اتارنے سے انکار کر

دیا۔اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ طیش میں آ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اگر کسی قوم کا رئیس ذلیل ہو جائے یا کوئی مالدار فقیر ہو جائے تو تم اس پر رحم کرو۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ختم ہو گیا۔ آپ نے دیکھا کہ شہزادی شہران حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی طرف پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھ رہی تھی چنانچہ آپ نے حکم دیا کہ شہزادی شہران حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دی جائے۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے انہیں آزاد کر دیا اور وہ برضا و رغبت مسلمان ہو کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ اور آپ کا اسلامی نام شہر بانو رکھا گیا۔

علامہ شبلی نعمانی نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''عام طور پر مشہور ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو یزدگرد شہنشاہ فارس کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں عام لونڈیوں کی طرح بازار میں بیچنے کا حکم دیا لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منع کیا کہ خاندان شاہی کے ساتھ ایسا سلوک جائز نہیں۔ ان لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ کرا لیا جائے پھر یہ لڑکیاں کسی کے اہتمام اور سپردگی میں دی جائیں اور اس سے ان کی قیمت اعلیٰ سے اعلیٰ شرح پر لی جائے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود ان کو اپنے اہتمام میں لے لیا۔ اور ایک حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو ایک محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو اور ایک عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو دے دی۔ زمخشری نے جس کو فن تاریخ سے کچھ واسطہ نہیں ربیع الابرار میں اس کو لکھا اور ابن خلکان نے حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے حال میں یہ روایت درج کر دی لیکن یہ محض غلط ہے۔ زمخشری کے علاوہ کسی نے اس کو نہیں لکھا۔ تاریخی قرائن اس کے خلاف ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں یزدگرد اور خاندان شاہی پر مسلمانوں کو مطلق قابو حاصل نہیں ہوا۔ مدائن کے معرکے میں یزدگرد مع تمام اہل و عیال کے دارالسلطنت سے نکلا اور حلوان پہنچا۔

جب مسلمان حلوان کی طرف بڑھے تو وہ اصفہان بھاگ گیا اور پھر کرمان وغیرہ میں ٹکراتا پھرا۔ مرو پہنچ کر ۳۰ھ میں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ ہے مارا گیا۔ اس کی آل اولاد اگر گرفتار ہوئے ہوں گے تو اسی وقت ہوئے ہوں گے علاوہ ازیں جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے اس وقت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی عمر بارہ برس تھی کیونکہ آپ ہجرت سے پانچ سال بعد پیدا ہوئے (ایک روایت کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش ۵ شعبان ۴ھ ہے) اور فارس ۱۷ھ میں فتح ہوا۔"

اگر علامہ شبلی نعمانی کے دلائل کو پیش نظر رکھا جائے تو حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا کا یہ واقعہ محض من گھڑت افسانہ معلوم ہوتا ہے مگر دوسری طرف اس سلسلے میں تاریخی شواہد موجود ہیں کہ یزدگرد کی بیٹی شاہران حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں اور آخر تک زندہ رہیں۔ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ جن سے خاندان اہل بیت کا سلسلہ نسب شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے بعد شروع ہوا ہے وہ حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا بنت یزدگرد شہنشاہ ایران کے بطن سے تھے۔ جیسا کہ پروفیسر براؤن نے بھی تاریخ ادبیات ایران میں لکھا ہے۔

اس سلسلے میں طبری کی ایک روایت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ تاریخ الامم و الملوک میں طبری نے لکھا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں طبرستان کے خلاف جہاد میں حصہ لیا۔ یہ ۳۰ھ کا واقعہ ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے کہا ہے کہ یزدگرد ۳۰ھ میں مرو پہنچ کر قتل ہوا اور اس کے بعد فارس کے اس آخری شہنشاہ کی جدوجہد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ قرین قیاس یہ ہے کہ شہزادی شہر بانو ۳۰ھ میں باپ کی موت کے بعد بے یارومددگار ہو کر گرفتار ہوئیں اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ طبرستان پر لشکرکشی کے وقت شہزادی شہر بانو رضی اللہ عنہا مسلمان ہو کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے عقد میں آئی ہوں۔

ہمیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کہ شہزادی شہر بانو رضی اللہ عنہا کب اور کن حالات میں مسلمان ہو کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حرم میں آئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ برضا و رغبت مشرف بہ اسلام ہوئیں اور انہوں نے اپنی مرضی سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ عقد کیا۔ اس کے بعد شہزادی شہر بانو رضی اللہ عنہا کی زندگی میں ایک فقید المثال انقلاب رونما ہوا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو عمدہ اور قیمتی ملبوسات، طرح طرح کے زیورات اور آرام و آسائش کے لوازمات سے بڑی محبت ہوتی ہے۔

ایک عام عورت شاید ہی اپنے زیورات اور قیمتی سامان سے محروم ہونا پسند کرتی ہو۔ مگر دنیا کے ایک بہت بڑے شہنشاہ کی بیٹی نے اپنے عمل سے اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔ اسلام کی دولت سمیٹنے کے بعد جب وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے گھر میں آئیں تو ان کا سراپا بدل چکا تھا۔ ان میں شہزادگی، فخر و غرور نخوت و تکبر اور شوق آرائش و زیبائش کا نام تک نہ تھا بلکہ کوئی پہچان بھی نہ سکتا تھا کہ یہ وہ عورت ہے جس کے قدموں تلے پورے ایران کی آنکھیں بچھی رہتی تھیں جس کی سواری مملکت فارس کے دارالسلطنت میں نکلتی تھی تو لوگ مؤدب ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے اور نگاہیں شوکت و حشمت کے بار سے دب کر جھک جایا کرتی تھیں۔ دولت اور عشرت جن کے گھر کی کنیز تھی اور شاہانہ نخوت و تکبر جنہیں وراثت میں ملا تھا جن کا ایک اشارہ کبھی وقت کی رفتار بدل دینے پر قادر تھا۔

اگرچہ یہ سب کچھ خواب و خیال ہو کر فارس کی عظمت خسروی کے ساتھ دفن ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود برسوں کی تربیت کا اثر نہیں جاتا۔ عادات و خصائل میں اتنی آسانی سے تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ پیدائشی عقائد و خیالات اور آبائی تعصبات کسی جبر اور سخت گیری کے خوف سے فنا نہیں ہو سکتے۔ جس خاتون نے اس شان و شوکت اور کروفر کے ساتھ زندگی بسر کی ہو اس کے انداز اور شاہانہ ادائیں یک لخت کیسے تبدیل ہو سکتی ہیں؟ مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سب کچھ ہوا۔ حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا نے اس گھر

میں قدم رکھا تھا جس کی فضا ہر وقت اللہ کی حمد و تقدیس سے معمور رہتی تھی۔ جہاں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا تقویٰ ہر وقت غبارِ رحمت بن کر چھایا رہتا تھا۔ یہ کاشانہ نبوت تھا جس کا ہر ذرہ عرفان و معرفت کے انوار میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جس کی مقدس روشنی سے دنیا کا ہر کونہ جگمگا اٹھا تھا جس پر حیدر کرار حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی درویشانہ زندگی کا تسلط تھا۔ یہ وہ کان تھی جس میں پتھر بھی چلا جائے تو پارس بن کر نکلتا تھا۔ اس گھر میں وہ لوگ رہتے تھے جو دلوں کی دنیا میں ایک نگاہ غلط انداز سے انقلاب برپا کر دیتے تھے۔ اس گھر کی روحانی فضا نے فارس کی اس لاڈلی شہزادی کو فقر و استغناء کے پیکر میں اس طرح ڈھال دیا کہ دنیا اپنی تمام خوبصورتی اور حسن و کشش کے ساتھ ہیچ نظر آنے لگی۔ اسلام کی تعلیم نے ان کا ظاہر و باطن بدل ڈالا۔ جبر کی طاقت سے صرف ظاہر کو بدلا جا سکتا ہے مگر دل و روح پر حکومت نہیں کی جا سکتی۔ اہل بیت کے فیضانِ نظر نے اس شہزادی کے دل کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کیا۔ ہمیں حضرت شہربانو رضی اللہ عنہا میں جو حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے وہ قلب و نظر کی تبدیلی تھی جس نے ان کی پوری زندگی کا رخ بدل ڈالا۔ اور وہ جاہ و حشم کی پروردہ شہزادی اک درویش منش اور سخت کوش مومنہ دکھائی دینے لگی۔ حضرت شہربانو رضی اللہ عنہا نے اس کے بعد بے مثل سادگی اور انکسار کے ساتھ زندگی بسر کی اور وہ ہمہ وقت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں۔ انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے عظیم المرتبت خاوند سے جدا ہونا گوارا نہ تھا۔ خدا کی قسم! دل کی دنیا میں یہ انقلاب آ جانے کے بعد اگر کوئی ان کے سامنے ملک فارس کی فرماں روائی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی رفاقت میں سے کوئی ایک چیز پیش کرتا تو ان کی طرف سے یہی جواب ملتا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ایک نقش پا پر روم و فارس کی ہزاروں سلطنتیں قربان کرنے کو تیار ہوں۔

۶۳ھ میں جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے مقتل یعنی میدان کربلا کی طرف

ہمیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کہ شہزادی شہر بانو رضی اللہ عنہا کب اور کن حالات میں مسلمان ہر کو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حرم میں آئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ برضا و رغبت مشرف بہ اسلام ہوئیں اور انہوں نے اپنی مرضی سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ عقد کیا۔ اس کے بعد شہزادی شہر بانو رضی اللہ عنہا کی زندگی میں ایک فقید المثال انقلاب رونما ہوا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ عورتوں کو عمدہ اور قیمتی ملبوسات، طرح طرح کے زیورات اور آرام و آسائش کے لوازمات سے بڑی محبت ہوتی ہے۔

ایک عام عورت شاید ہی اپنے زیورات اور قیمتی سامان سے محروم ہونا پسند کرتی ہو۔ مگر دنیا کے ایک بہت بڑے شہنشاہ کی بیٹی نے اپنے عمل سے اس بات کو غلط ثابت کر دیا۔

اسلام کی دولت سمیٹنے کے بعد جب وہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے گھر میں آئیں تو ان کا سراپا بدل چکا تھا۔ ان میں شہزادگی، فخر و غرور نخوت و تکبر اور شوق آرائش و زیبائش کا نام تک نہ تھا بلکہ کوئی پہچان بھی نہ سکتا تھا کہ یہ وہ عورت ہے جس کے قدموں تلے پورے ایران کی آنکھیں بچھی رہتی تھیں جس کی سواری مملکت فارس کے دارالسلطنت میں نکلتی تھی تو لوگ مؤدب ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے اور نگاہیں شوکت و حشمت کے بار سے دب کر جھک جایا کرتی تھیں۔ دولت اور عشرت جن کے گھر کی کنیز تھی اور شاہانہ نخوت و تکبر جنہیں وراثت میں ملا تھا جن کا ایک اشارہ کبھی وقت کی رفتار بدل دینے پر قادر تھا۔

اگرچہ یہ سب کچھ خواب و خیال ہو کر فارس کی عظمت خسروی کے ساتھ دفن ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود برسوں کی تربیت کا اثر نہیں جاتا۔ عادات و خصائل میں اتنی آسانی سے تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ پیدائشی عقائد و خیالات اور آبائی تعصبات کسی جبر اور سخت گیری کے خوف سے فنا نہیں ہو سکتے۔ جس خاتون نے اس شان و شوکت اور کروفر کے ساتھ زندگی بسر کی ہو اس کے انداز اور شاہانہ ادائیں یک لخت کیسے تبدیل ہو سکتی ہیں؟ مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سب کچھ ہوا۔ حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا نے اس گھر

میں قدم رکھا تھا جس کی فضا ہر وقت اللہ کی حمد وتقدیس سے معمور رہتی تھی۔ جہاں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا تقویٰ ہر وقت غبارِ رحمت بن کر چھایا رہتا تھا۔ یہ کاشانۂ نبوت تھا جس کا ہر ذرہ عرفان ومعرفت کے انوار میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جس کی مقدس روشنی سے دنیا کا ہر کونہ جگمگا اٹھا تھا جس پر حیدر کرار حضرت علی المرتضےٰ رضی اللہ عنہ کی دور بیشانہ زندگی کا تسلط تھا۔ یہ وہ کان تھی جس میں پتھر بھی چلا جائے تو پارس بن کر نکلتا تھا۔ اس گھر میں وہ لوگ رہتے تھے جو دلوں کی دنیا میں ایک نگاہ غلط انداز سے انقلاب برپا کر دیتے تھے۔ اس گھر کی روحانی فضا نے فارس کی اس لاڈلی شہزادی کو فقر واستغناء کے پیکر میں اس طرح ڈھال دیا کہ دنیا اپنی تمام خوبصورتی اور حسن وکشش کے ساتھ ہیچ نظر آنے لگی۔ اسلام کی تعلیم نے ان کا ظاہر وباطن بدل ڈالا۔ جبر کی طاقت سے صرف ظاہر کو بدلا جا سکتا ہے مگر دل وروح پر حکومت نہیں کی جا سکتی۔ اہل بیت کے فیضانِ نظر نے اس شہزادی کے دل کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کیا۔ ہمیں حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا میں جو حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے وہ قلب ونظر کی تبدیلی تھی جس نے ان کی پوری زندگی کا رخ بدل ڈالا۔ اور وہ جاہ وحشم کی پروردہ شہزادی! ایک درویش منش اور سخت کوش مومنہ دکھائی دینے لگی۔ حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا نے اس کے بعد بے مثل سادگی اور انکسار کے ساتھ زندگی بسر کی اور وہ ہمہ وقت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں۔ انہیں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے عظیم المرتبت خاوند سے جدا ہونا گوارا نہ تھا۔ خدا کی قسم! دل کی دنیا میں یہ انقلاب آجانے کے بعد اگر کوئی ان کے سامنے ملک فارس کی فرماں روائی اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی رفاقت میں سے کوئی ایک چیز پیش کرتا تو ان کی طرف سے یہی جواب ملتا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے ایک نقش پا پر روم وفارس کی ہزاروں سلطنتیں قربان کرنے کو تیار ہوں۔

۶۳ھ میں جب حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے مقتل یعنی میدان کربلا کی طرف

روانہ ہوئے تو حضرت شہر بانو رضی اللہ عنہا بھی ساتھ تھیں۔ اور وہیں انہوں نے خاندان اہل بیت کے ساتھ وہ تمام سختیاں برداشت کیں اور وہ تمام مصائب سہے جن کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں۔ ایران کی اس نازک اندام اور ناز پروردہ شہزادی نے اپنے جلیل القدر خاوند کے ساتھ بھوک اور پیاس کا عذاب برداشت کیا۔ معصوم علی اکبر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا منظر دیکھا اور اپنے سرتاج کو بے کسی اور غریب الوطنی کی حالت میں شہید ہوتے دیکھا۔ ان کے نیزے پر چڑھے ہوئے سر کا قیامت خیز منظر دیکھا۔ اُن کے گھوڑوں کے ٹاپوں سے روندی ہوئی نعش کو کلیجہ تھام کر دیکھا۔ کوفہ اور دمشق کے بازاروں میں مخدارت اہل بیت کے ساتھ برہنہ سر، انہیں بھی ظلم وعدوان کے دربار کی روایات کا نشانہ بننا پڑا۔ انہوں نے اپنے بیمار اور نڈھال لخت جگر امام زین العابدین کو پابند سلاسل دیکھ کر کئی بار نیلگوں آسمان کی طرف پرنم آنکھیں اٹھائیں۔ مگر راہ صدق وصفا سے انحراف گوارا نہ کیا۔ آخر وقت تک اپنے بیٹے حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں رہیں۔

کہاں کسریٰ کا وہ رشک جناں محل جسے دیکھ کر غازیان اسلام بھی حیران و ششدر رہ گئے تھے اور کہاں یہ ریگ زار کربلا۔ کہاں وہ عیش وعشرت کی رنگین زندگی کہ بہاریں بھی رشک کریں اور کہاں یہ غریب الوطنی اور آبلہ پائی۔ کہاں وہ عظمت و شوکت کہ ایک عالم سر جھکائے کھڑا ہے اور کہاں یہ کوفہ ودمشق کے بازاروں میں شکستہ حال بدنصیبوں کا جلوس وہ کیسے لوگ تھے، کیسی سعید روحیں تھیں جنہوں نے تاریخ عالم کو حیات جاوید عطا کی اور کہاں یہ ہماری بدنصیب خواتین جن کے لیے اسلام ایک بھولا بسرا افسانہ ہے۔ جنہیں اپنے بزرگوں، اپنی تہذیب اپنے تمدن اور اپنے آباواجداد کی درخشندہ روایات سے نفرت ہے۔ خدا کی قسم ہماری یہ لاکھوں دنیا پرست نام نہاد مسلمان عورتیں اس فارس کی شہزادی کے قدموں پر نثار کر دینے کے قابل ہیں۔ ان کے لیے گھر کی ایک معمولی سی تکلیف عذاب الٰہی بن جاتی ہے روزمرہ کی ضروریات

میں ذرا سی کمی انہیں ناشکری کی حد سے بھی آگے لے جاتی ہے۔ کسی عزیز کی موت پر وہ نعوذ باللہ خدا کو کوسنے لگتی ہیں۔ سوچ لیجئے! اگر دنیا میں مسلمان بن کر جینا ہے تو دنیا یا دین ان دو میں سے ایک کو منتخب کرنا ہوگا۔ مسلمان عورت دنیا کی نہیں خدا کی پرستش کرتی ہے اور دنیا اس کے دین کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ ورنہ خدا کا قانونِ مکافات کسی قوم سے رعایت نہیں کرتا جب قیصر و کسریٰ نے حدود سے تجاوز کیا تو ان کی شوکت و حشمت اور قوت و طاقت ان کے گلے کا پھندا بن گئی۔ وہ جوئے آب کبھی زندہ نہیں رہ سکتی جو اپنے سرچشمہ سے کٹ جائے۔ ان دریاؤں کا دامن روانی کی دولت سے خالی ہو جاتا ہے جو اپنے مخزن سے بیگانہ ہو جائیں۔ وہ درخت کبھی سرسبز و شاداب نہیں رہ سکتا جو اپنی جڑوں سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ کہانی ہمیشہ پریشان خیالی کا مجموعہ بن جاتی ہے جو اپنے مرکزی خیال سے آزاد ہو جائے قدرت اس چشمے کو ترنم سے محروم کر دیتی ہے جو اپنی بنیاد سے بے تعلق ہو جائے۔

سورج کی شعاعیں اور چاند کی کرنیں اسی وقت تک حیات آفرین ہیں جب تک انکا تعلق چاند اور سورج سے قائم ہے آج ہم اپنے منبع حیات سے کٹ جانے کی فکر میں ہیں، ہم اپنے گھر کے جگمگاتے ہوئے چراغوں کو چھوڑ کر اڑتے ہوئے جگنوؤں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ہم اس مینار نور کی طرف لوٹ آئیں جس کی روشنی حسرت سے ہمارا انتظار کر رہی ہے۔

یاد رکھو! اس ملت کے مقدر کا ستارہ صرف اس بہن کے نہاں خانۂ قلب میں جگمگا سکتا ہے جو سیرت زینب رضی اللہ عنہا سے روشنی حاصل کرے اور اس بیٹی کی عظمت اسے تابندگی دے سکتی ہے جس کا تعلق فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہو اور اس بیوی کا آغوش اسے رشک ماہتاب بنا سکتا ہے جس نے خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دیگر امہات المومنین کے اوصاف کو وراثت میں پایا ہو۔

بکارہ رحمۃ اللہ علیہا

بکارہ فصیح و بلیغ شاعرہ تھیں جن کے اشعار میں حق و صداقت کی روح شعریت بن کر رچی ہوئی تھی ان کی صاف گوئی اور بے باکی نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہما سے بھی خراج تحسین حاصل کیا۔ افلاس کے دور میں بھی انہوں نے اپنے کردار کی عظمت کو کسی قیمت پر بیچنا گوارا نہیں کیا۔

بکارہ رحمۃ اللہ علیہا کا تعلق عرب کے قبیلہ ہلال سے تھا۔ فہم و تدبر میں بے مثل، صاف گوئی اور بے باکی کی دلکش تصویر اور عرب کی خوش بیان شاعرہ تھیں۔ ابتدائی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں آپ کا ذکر ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے آپ کو بے پناہ عقیدت تھی۔ انہوں نے اپنے اشعار میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہت زیادہ مدح و ستائش کی ہے۔ حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جب ایک مفسد گروہ نے فتنہ پردازی کا سلسلہ شروع کیا اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے اور باہمی اختلافات کو ہوا دینے کے لیے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانا شروع کیں تو بعض لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی گستاخی سے پیش آئے اور انہوں نے دوران گفتگو ادب و احترام کو ملحوظ نہ رکھا تو

بکارہ رحمۃ اللہ علیہا کو بہت رنج ہوا۔انہوں نے نہایت مؤثر انداز میں اشعار کے ذریعہ لوگوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مرتبہ اور شرف واضح کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی۔ کئی لوگوں نے ان کے اشعار سے متاثر ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت ترک کر دی۔

بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے باہمی جھگڑے کا افسوناک سلسلہ شروع ہوا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کھل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ شروع کر دیا اور بکارہ رحمۃ اللہ علیہا نے اپنے اشعار کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت اور رفاقت کی آگ سی بھڑکا دی۔ چونکہ انہیں خود حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بے حد عقیدت تھی اور وہ اس جھگڑے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہایت خلوص اور دیانت داری سے راستی پر سمجھتی تھیں۔ اس لیے ان کی دلی خواہش تھی کہ تمام مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیں۔ ہمیں واقعات کی نوعیت اور اختلافات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف یہ دیکھنا ہے کہ عرب کی ایک راست گو۔ مخلص اور اسلام کی شیدائی خاتون نے بنیادی طور پر کس جذبے کے ساتھ اس موقع پر ایک واضح کردار ادا کیا اور اس سلسلے میں کہاں تک صبر و استقلال کا ثبوت دیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کی کوئی دنیوی غرض وابستہ نہ تھی۔ اور نہ ہی کوئی لالچ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کامیاب ہو جائیں۔ تو وہ کسی قسم کا فائدہ اٹھائیں۔ ذاتی طور پر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ درویش منش انسان تھے اور بالکل سادہ سی زندگی بسر کرتے ہیں وہ اس شاعرہ کو کیا مالی اور دنیوی فائدہ پہنچا سکتے تھے عورت ہونے کی حیثیت سے انہیں کوئی بڑا اعزاز نہ مل سکتا تھا۔ ویسے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ غیر منصفانہ نوازشات کے عادی نہ تھے۔ اس کے علاوہ بکارہ کی کوئی سیاسی مصلحت نہ تھی اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خاندان سے ان کی قرابتداری ہی تھی کہ وہ ان کی حمایت کے لیے مجبور ہوتیں۔ البتہ دوسری طرف انعامات و اکرامات کی اندھا دھند بارش ہو رہی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فیاضی اور

دریا دلی ان کے تمام ساتھیوں کو سیراب کر رہی تھی اس وقت بھی ان کے دربار سے کوئی شخص خالی ہاتھ واپس نہ آتا تھا۔ اگر حضرت بکارہ رضی اللہ عنہا امیر معاوہ کا ساتھ دیتیں اس حالت میں کہ عرب کے تمام حصوں میں ان کے اشعار بجلی کی سی تیزی سے زبان زدِ عام ہو جاتے تھے، اور وہ عوام کے دلوں اور ذہنوں کو متاثر کرتی تھیں۔ ان کے کلام میں طوفان کا سا زور، سمندر کی سی روانی اور بجلی کی سی کاٹ تھی۔ وہ جہاں اشعار پڑھتی تھیں لوگوں کو مسحور کر دیتی تھیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایسے زیرک اور معاملہ فہم سیاست دان کے لیے بکارہ رضی اللہ عنہا کا وجود بہت قیمتی تھا اور وہاں ان کے ہر شعر کو موتیوں سے تول کر قبول کیا جاتا یہ سب کچھ دیکھتے اور سمجھتے ہوئے حضرت بکارہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا کھلے بندوں ساتھ دیا کیونکہ ان کے ضمیر کا فیصلہ یہی تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ راستی پر ہیں۔ اور ہر لحاظ سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ پر بھاری ہیں۔ ایک دفعہ جب انہوں نے فیصلہ کر لیا تو پھر کسی منفعت اور مصلحت کو زنجیرِ پا بننے کی اجازت نہیں دی بلکہ ہر جگہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی شدید مخالفت کی۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر انہوں نے حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ کے محاسن انتہائی دل نشین پیرائے میں بیان کئے اور لوگوں کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف بھڑکانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انہوں نے ہر موقع پر اپنے اشعار میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جی بھر کے مذمت کی اور اس بات پر سخت رنج اور برہمی کا اظہار کیا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنی حدود سے تجاوز کر کے خلیفۃ المسلمین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف تلوار اٹھائی اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مقابل لا کھڑا کیا۔ حالات کچھ بھی ہوں۔ اور آج کسی بھی فریق کو راستی پر قرار دیا جائے مگر بکارہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہ صورت حال نہایت تکلیف دہ تھی کہ ایک مسلمان کے ہاتھ دوسرے مسلمان کے خون سے رنگین ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کے اپنے خون سے ایک ایسے فتنے کی پرورش ہو رہی ہے جو ملت اسلامیہ کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے والا ہے۔ ان کے

نزدیک امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا فرض تھا کہ وہ خلیفۂ وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے احکام کی بسرو چشم تعمیل کرتے اور ان کے مقابل کسی صورت دشمن فریق بن کر کھڑے نہ ہوتے۔ درحقیقت اسی آویزش نے آگے چل کر حادثۂ کربلا کی المناک صورت اختیار کی۔

بکارہ رحمۃ اللہ علیہا نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے خلاف جتنے اشعار کہے تھے وہ عوام میں بے حد مقبول ہو چکے تھے اور بے شمار لوگوں کو یاد تھے۔ حالات نے فیصلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف دیا۔ اور طویل کشمکش کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے تدبر اور ان کی سیاست نے بازی جیت لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انہوں نے برملا اپنی خلافت کا اعلان کر دیا کیونکہ اب ان کا کوئی بھی مضبوط حریف باقی نہ رہا تھا۔ جہاں ان کی سیاست ناکام ہوئی انہوں نے زروسیم اور چرب زبانی کا جال پھیلا کر لوگوں کو اسیر کر لیا جہاں یہ دونوں چیزیں بیکار ثابت ہوئیں انہوں نے بلا دریغ طاقت استعمال کی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں کا زور بالکل ٹوٹ چکا تھا اور جہاں تھوڑی بہت بے چینی تھی اس کی حیثیت بھی مقامی رہ گئی تھی۔

اپنی خلافت کا اعلان کرنے کے بعد جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اطمینان وسکون سے بلادِ اسلامیہ پر حکومت کرنے لگے تو انہیں معلوم ہوا کہ بکارہ رحمۃ اللہ علیہا جو عرب کی ایک نامور اور ممتاز شاعرہ ہیں نہایت تنگ دستی اور مفلوک الحالی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ انہوں نے فی الفور حجاز کے گورنر کو لکھا کہ بکارہ رحمۃ اللہ علیہا کو ان کے دربار میں حاضر کیا جائے۔ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دربار میں حاضر ہوئیں تو انہوں نے پوچھا۔

"کیا تم وہی بکارہ ہو جو میرے متعلق توہین آمیز اشعار کہتی تھی؟" آپ نے جواب دیا "ہاں میں وہی بکارہ ہوں۔"

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک معزز درباری مروان بن حکم نے امیر کو مشتعل کرنے کے لیے بکارہ کے کچھ ایسے اشعار سنائے جن میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خوب مذمت کی

گئی تھی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک منجھے ہوئے مدبر کے انداز میں پوچھا کہ کیا یہ تمہارے اشعار ہیں؟ ان کا خیال تھا کہ میری صولت و حشمت سے مرعوب ہو کر اب یہ یقیناً انکار کر دیں گی۔ مگر بکارہ رحمۃ اللہ علیہا نے انہیں یہ جواب دے کر حیران و ششدر کر دیا۔

"اے معاویہ! انکار کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں اور مجھے جھوٹی خوشامد کی عادت نہیں۔ یہ سب اشعار میرے ہیں لیکن جو کلام اس سنانے والے کو ابھی تک معلوم نہیں وہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔"

یہ جواب سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ہنسے اور کہا کہ لیکن یہ بات مجھے تمہاری امداد و اعانت سے نہیں روک سکتی۔ بکارہ رحمۃ اللہ علیہا نے جواب دیا۔ میں کوئی حاجت لے کر تمہارے پاس نہیں آئی۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ تا ہم تم بیان کرو میں تمہاری حاجت پوری کروں گا۔ یہ بڑھتا ہوا اصرار دیکھ کر بکارہ رحمۃ اللہ علیہا اٹھ کھڑی ہوئیں اور یہ کہہ کر چل دیں کہ اس بے لطفی کے بعد حاجت کا اظہار مناسب نہیں ہے۔

اس سے قبل امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب ان سے اپنی خلافت کے بارے میں چند چبھتے ہوئے سوالات کیے تو بکارہ رحمۃ اللہ علیہا نے بے خوف ہو کر کہا۔

"اے معاویہ رضی اللہ عنہ! کیا ہم ابن ہند کو خلافت کا مالک سمجھیں۔ یہ دور از قیاس ہے اور اگر تو ایسا چاہتا ہے تو یہ تیرے مرتبے سے بہت بالاتر بات ہے۔ تیرے نفس نے گمراہی سے یہ آرزو تیرے دل میں ڈال دی ہے اور لوگوں نے تجھے بدبختی کے لیے ورغلایا ہے۔"

یہ سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حاشیہ نشینوں نے رائے دی کہ اس گستاخ عورت کو عبرتناک سزا دینی چاہیے تاکہ دوسروں کو سبق حاصل ہو۔ مگر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

"نہیں، ہرگز نہیں، ایک صاف گو عورت کو سزا دینا قرینِ انصاف نہیں بلکہ

وہ عزت واحترام کی مستحق ہے کہ وہ مرعوب نہیں ہوئی۔ اب بھی اس کی یہ حالت ہے کہ جو اس کے دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر آتا ہے۔"

یہ چند جملے جہاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی بلند حوصلگی اور عالی ظرفی ظاہر کرتے ہیں وہاں بکارہ علیہا کے شاندار کردار کو بہت زیادہ نمایاں کرتے ہیں۔

آج ہماری جو بہنیں شعر وسخن کے میدان میں طبع آزمائی بھی کرتی ہیں تو ان کی جولانگاہ سفلی جذبات اور حسن وعشق کے عامیانہ مضامین سے آگے نہیں بڑھتی کیا انہیں تقلید کے لیے خنساء رضی اللہ عنہا اور بکارہ علیہا کی جرأت و بے باکی، اسلام دوستی، ملت پروری اور بلند کرداری پسند نہیں؟ کیا یہ انکا جذبۂ ایمان، خلوص اور صدق وصفا کے مظاہرے نہ تھے جنہوں نے ان ہستیوں کو زندۂ جاوید بنادیا اور آج ہم ان پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔

زرقاء رحمۃ اللہ علیہا

ایمان واستقامت، جرأت وشجاعت اور بے خوفی کا وہ نقش جمیل ہے جو انسانی آزادی، حریت، مساوات اور شرف وامتیاز کے سر پر لافانی تاج بن کر جگمگاتا رہے گا۔ زرقا اوران ایسی بلند کردار مسلمان خواتین، اس حقیقت کا مجسم ثبوت ہیں کہ اسلام کے بعد دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا فلسفہ حیات اور عظیم سے عظیم نظریہ زندگی بھی انسانی عظمت کی ان بلندیوں کو نہیں چھو سکے گا جو مسلمانوں کے لئے نشان منزل کی حیثیت رکھتی تھیں۔

زرقاء عدی بن قیس کی بیٹی تھیں، عرب کی ممتاز شاعرات میں شمار ہوتی تھیں اور شعلہ بیان خطیبہ تھیں۔ علم وفن میں انہیں قابل فخر امتیاز حاصل تھا۔ اور نہایت شیریں بیان تھیں۔ شخصی دور حکومت کے بعض خوشامدی داستان نویسوں نے ان کے کردار کی عظمت کو چھپانے کے لیے کئی قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں اور انہیں ایک مغنیہ کے روپ میں پیش کرنے کے لیے طرح طرح کی افسانہ طرازیاں کی ہیں۔ حالانکہ وہ ایک صاحب طرز شاعرہ تھیں۔ اوران کا دل اسلام کی والہانہ محبت سے ہر

وقت سرشار رہتا تھا۔ ان کے اشعار اور تقاریر میں ملت اسلامیہ کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اور وہ اپنے وقت کی ایک ایسی خدا پرست، صداقت شعار اور خلوص کیش خاتون تھیں جن کی خودداری اور دیانت کا بدترین دشمن بھی اعتراف کرتے تھے۔

حضرت علی المرتضیٰ کے دور خلافت میں حضرت زرقاء رضی اللہ عنہا اپنے قبیلے کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حلیفوں میں شامل تھیں۔ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ خلیفہ سوم کی دردناک شہادت کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت کا مستحق سمجھتی تھیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جنگ صفین کے موقع پر یہ آتش بیاں شاعرہ اور مقررہ میدان جنگ میں غضب کے پر جوش اشعار پڑھ کر اپنے قبیلے کے لوگوں کے حوصلے بڑھا رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت زرقاء رضی اللہ عنہا کے اشعار اتنے پر درد اور اثر انگیز تھے کہ ان کا قبیلہ امیر معاویہ کے خلاف جوش وخروش کے عالم میں دیوانہ وار لڑ رہا تھا۔

جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ تخت خلافت پر قبضہ کر چکے اور اطمینان وسکون سے بلاد اسلامیہ پر حکومت کرنے لگے تو ایک روز ان کی مجلس میں عمرو بن سعید، عتبہ اور ولید وغیرہ نے امیر معاویہ کو زرقاء کے کئی اشعار سنائے اور بتایا کہ زرقاء کی جادو بیانی نے کئی دفعہ لڑائی کا رخ بدل دیا۔ صرف ان کے اشعار کی وجہ سے عدی بن قیس کا قبیلہ بے پناہ جوش کے ساتھ آخر دم تک لڑتا رہا۔ یہ تفصیل سن کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ان مصاحبین سے پوچھا کہ تمہاری رائے میں ایسی عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ سب نے اتفاق رائے سے مشورہ دیا کہ ایسی باغی عورت کو قتل کر دینا بہت ضروری ہے تاکہ دوسرے لوگ اس کے انجام سے عبرت حاصل کریں۔ اور آئندہ کسی کو امیر کے خلاف اس قسم کی باتیں کہنے کی جرأت نہ ہو۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس مشورے کو سخت ناپسند کیا اور بڑی ترشروئی کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا تم مجھے ایک ایسی عورت کا قاتل مشہور کر کے دنیا میں بدنام کرنا چاہتے

ہو جو اس وقت میرے ملک کی حدود میں رہتی ہے اور میرے قابو میں ہے۔"

بہادری اور شجاعت کے قدر دان اور عاقبت اندیش امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سن کر خوشامدی امراء بہت شرمندہ ہوئے اور ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ کیونکہ انہوں نے تو امیر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایسا مشورہ دیا تھا۔

حضرت زرقاء اتفاق سے اس وقت کوفہ میں تھیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے گورنر کو فوراً خط لکھا کہ حضرت زرقاء کو انتہائی عزت و احترام کے ساتھ اپنے چند معتمد آدمیوں اور اس کے قبیلہ کے ذمہ دار سرداروں کے ہمراہ میرے پاس بھیجو۔ کوفہ کے گورنر نے یہ حکم پڑھتے ہی زرقاء کو طلب کیا اور امیر معاویہ کا یہ پیغام سنایا۔ زرقاء نے بڑے اطمینان سے یہ پیغام سن کر کہا کہ اگر امیر نے میرا وہاں جانا میری مرضی پر چھوڑا ہے تو میں جانے سے صاف انکار کرتی ہوں اگر یہ ان کا قطعی حکم ہے تو مجبوری کے عالم میں جانے کو تیار ہوں مگر گورنر کوفہ نے انہیں سمجھا بجھا کر بڑے تزک و احتشام سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس روانہ کر دیا۔ جب وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دربار میں پیش ہوئیں تو امیر نے پوچھا۔ کہو زرقاء سفر کیسے طے ہوا۔

زرقاء: جس طرح لڑکی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہے یا بچہ گہوارے میں سوتا ہے۔

امیر معاویہ: ہم نے اپنے گورنر کو یہی ہدایت کی تھی مگر تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کیوں طلب کیا ہے؟

زرقاء: جو راز مجھ پر پوشیدہ ہے اس سے میں کیسے آگاہ ہو سکتی ہوں۔

امیر معاویہ: زرقاء! تم یہ بتاؤ کہ کیا جنگ صفین کے موقع پر تم سرخ اونٹ پر سوار تھیں؟

زرقاء: ہو سکتا ہے۔

امیر معاویہ: کیا تو اپنے آتشیں اشعار اور تند و تیز تقریروں سے جنگ کی آگ

بھڑکانے میں مصروف نہ تھی؟ اور کیا تو لوگوں کو قتل و خون کے لیے نہیں بھڑکا رہی تھی؟

زرقاء: آپ جانتے ہیں کہ زمانہ انقلاب انگیز ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔

امیر معاویہ: کیا تجھے اپنی وہ تقریر یاد ہے جو تم نے جنگ صفین کے موقع پر کی تھی۔

زرقاء: واللہ! مجھے یاد نہیں۔

امیر معاویہ: مگر مجھے تو یاد ہے۔ سنو! تم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج اور اپنے قبیلے کے نوجوانوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ تم اس فتنے سے بچو جو تم پر ظلمت کے پردے ڈال رہا ہے۔ اور لوگوں کو راہ راست سے گمراہ کر رہا ہے یہ کیسا اندھا بہرا اور گونگا فتنہ ہے۔ اے مجاہدین! یاد رکھو! عورتوں کی آرائش وزیبائش مہندی سے ہے مگر مردوں کا حسن خون سے دوبالا ہوتا ہے۔ تقریر کا مختصر سا حصہ سنا کر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بڑی رعب دار آواز میں پوچھا۔ کیا تو علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریک تھی۔

زرقاء: اے معاویہ! خدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے بھولے بسرے واقعات دہرا کر میرے دل کو پھر جوش اور ولولے سے معمور کر دیا ہے اور میری مردہ روح کو نئی تازگی بخش دی ہے میری رگوں میں تازہ خون دوڑا دیا ہے۔

امیر معاویہ: کیا تو علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے پر اب بھی خوش ہے؟

زرقاء: خوش ہی نہیں مجھے اس پر فخر ہے۔

یہ سن کر امیر معاویہ جھینپ سے گئے۔ اور توقف کے بعد کہا:

''اے زرقاء! علی رضی اللہ عنہ سے تیری یہ وفاداری اور وفات کے بعد اس میں یہ استواری ہر لحاظ سے قابل عزت اور باعث رشک ہے۔ تمہارے اس

جواب سے میرے دل میں تمہاری قدر و منزلت بہت بڑھ گئی ہے۔ آج تمہیں جس چیز کی خواہش ہے مانگو، تیرے جیسی علم دوست، لائق، ذہین، وفادار اور حق گو عورت کی ضروریات کو پورا کرنا میرا فرض ہے۔"

زرقاء: جس شخص کے خلاف میں نفرت انگیز خیالات کا اظہار کرتی رہی، فوجوں کو بھڑکاتی رہی اور اس کے خلاف لوگوں کو آمادۂ پیکار کرتی رہی کیا آج اس کے سامنے دست سوال دراز کروں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ مگر زرقاء کے انکار کے باوجود امیر معاویہ نے اسے بے شمار تحائف اور انعامات دے کر انتہائی عزت و توقیر کے ساتھ رخصت کیا نہ صرف زرقاء رضی اللہ عنہا کو بلکہ اس کے قبیلہ والوں کو بھی امیر معاویہ نے بڑی فراخدلی سے نوازا۔

اپنے گھر میں بیٹھ کر دوسروں کو برا بھلا کہہ لینا اور کوس کر جی ٹھنڈا کر لینا بہت آسان کام ہے ویسے بھی عام عورتوں کا یہ محبوب مشغلہ ہوتا ہے مگر ایک صاحب اختیار فرماں رواں کے دربار میں کھڑے ہو کر اعلان حق کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ پھر ایسا حکمران جس کے متعلق صاف طور پر معلوم ہو کہ وہ دشمن ہے اور اس کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے کسی نے امکانی کوشش بھی کی ہو جو ہر دوست اور دشمن پر عیاں ہو۔ ایسے موقع پر سچائی کا دامن تھامے رکھنا اور پوری جرأت و بے باکی کے ساتھ اپنے دلی خیالات کا اظہار کرنا بہت کٹھن کام ہے۔ ایسے مواقع پر بڑے بڑے دلیر اور جنگجو مردوں کے پاؤں بھی ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ اپنی آنکھوں کے سامنے موت کا رقص دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتے ہیں مگر اسلامی تعلیم کے سرچشمۂ صداقت سے سیراب ہونے والی اس بہادر اور حق پرست خاتون کو دیکھئے کہ وہ حاکم وقت کی جلالت اور سطوت سے ذرہ برابر مرعوب نہیں ہوئی اور اس کے پائے ثبات کو بالکل لغزش نہیں ہوئی حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ امیر معاویہ ان کے کسی بھی جملے کو گستاخی پر محمول کر کے

ایک اشارۂ ابرو کے ساتھ ان کی زندگی کا خاتمہ کر سکتے تھے مگر جہاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی دانش مندی، بردباری اور شجاعت نے ایک وفادار اور راست گفتار عورت کے خون سے اپنا دامن آلودہ کرنا گوارانہ کیا وہاں زرقاء نے بھی اس کے عفو و کرم کے جذبات کو بیدار کرنے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔ اور نہ ان سے رحم و کرم کی بھیک مانگنا گوارا کیا۔ بلکہ بڑی دیانتداری کے ساتھ اپنے جذبات واحساسات کو بلیغ انداز میں پیش کر دیا۔ کتنی بلند تھیں وہ عورتیں اور کیسی کیسی بلندیاں ان کے جگمگاتے ہوئے کردار کے سامنے سرنگوں ہو جاتی تھیں سچائی اور صداقت کسی صفائی کی محتاج نہیں ہوتی۔ ایک باضمیر مسلمان عورت کی رائے کوئی شہنشاہ وقت قارون کے خزانے دے کر بھی نہیں خرید سکتا۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھی سچی بات کہتی ہے اور تلواروں کے سائے مین بھی حق کا اعلان کرنے سے اسے کوئی خوف روک نہیں سکتا۔

کہاں آج کی حق ناآشنا عورت کہ چھوٹی چھوٹی اغراض اور معمولی مصلحتوں پر ایمان وضمیر بیچ دیتی ہے۔ معمولی سا لالچ اسے سچائی کے راستے سے منحرف کر دیتا ہے دور دراز کی رشتہ داری اور تعلقات کو بچانے اور جھوٹے وقار کو قائم رکھنے کے لیے وہ بڑے سے بڑا جھوٹ بولنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ دوسروں پر خوفناک الزامات لگانے اور بے سروپا بہتان تراشنے میں بھی اپنی بڑائی سمجھتی ہے۔

اگر ہماری بہنوں کو اللہ نے ذرا بھی عقل سلیم دی ہے تو وہ زرقاء کی طرف دیکھ کر سبق حاصل کریں کہ اسلام کے بنیادی تقاضے کیا ہیں اور مسلمان عورت کا سب سے بڑا وصف کیا ہوتا ہے۔

اُمِّ علقمہ رحمۃ اللہ علیہا

اُمِّ علقمہ کا وجود ظلم و ستم کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ہے۔ جور و عدوان کی ہنسی اڑانے والی اور موت کا پرہیبت چہرہ دیکھ کر مسکرانے والی بے خوف اور نڈر خاتون کو دیکھنے کی آرزو ہو تو اُمِّ علقمہ کو دیکھ لو۔

کون نہیں جانتا کہ تاریخ اسلام میں سب سے زیادہ ظالم اور خونخوار شخص کون تھا؟ حجاج بن یوسف ثقفی جس کے سیاہ کارناموں نے تاریخ کے اوراق سیاہ ہیں۔ جس کے دامن پر ہزاروں بے گناہوں کے خون ناحق کے دھبے آج بھی نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ لاکھوں ظالم مل کر بھی ایک حجاج کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کی خونخوار آنکھوں میں ناچنے والے شعلوں میں ہزاروں یزید، لاکھوں ابن زیاد اور سینکڑوں شمر جھانکتے رہتے تھے۔ وہ بظاہر انسان نظر آتا تھا مگر درحقیقت ظلم اور درندگی کے قالب میں ڈھلا ہوا خونخوار بھیڑیا تھا۔ جس کی شعلہ ریز آنکھیں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی انسانی لاشوں کے مناظر سے ہی لطف اندوز ہو سکتی تھیں۔ جس کے کان صرف آہ و بکا اور نالہ و فریاد سے ہی سکون حاصل کر سکتے تھے جس کے ہاتھ ہمیشہ کسی نہ کسی کی گردن اڑانے کے لیے حرکت میں آتے تھے اور جس کے پاؤں صرف گناہ و معصیت کی

وادی ہی سے آشنا تھے۔جس بدنصیب دور میں اس شخص کو اقتدار حاصل تھا وہ حجاج ایسے شقی القلب اور پتھر دل انسان کی بدولت تاریخ کا ایک الم ناک باب بن کر رہ گیا ہے۔اس دور کی تاریخ کے ہر لفظ سے آج بھی ہزاروں بے گناہوں کا خون ٹپک رہا ہے۔اس پیکر ظلم وفساد نے سرکار دو عالم رحمۃ للعالمین کی مبارک تعلیمات کو انسانی خون کے دریا میں غرق کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور اسے انسانی گوشت و پوست کے ڈھیروں تلے دبا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔حجاج ایک ایسا ظالم، خون پرست اور بے رحم شخص تھا جس کے سامنے دم مارنے اور ہونٹ ہلانے کا مطلب اپنی موت کو دعوت دینا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دور میں حجاج مسلمانوں کے لیے عذاب الٰہی بن کر نازل ہوا تھا۔اور اس کا صرف یہی کام تھا کہ مسلمانوں کا خون چاٹ کر زندہ رہے۔وہ یوں تو ایک گورنر تھا مگر حقیقت میں اس کے اختیارات لامحدود تھے۔اس کی ہر لحظہ بے نیام رہنے والی تلوار کسی بڑی سے بڑی ہستی کے مقام و مرتبہ کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھی اور سب کے سروں پر یکساں طور پر لٹکتی رہتی تھی۔حجاج کو اس بات سے کوئی علاقہ نہ تھا کہ کون کیا ہے اور اس کا مرتبہ و امتیاز کیا ہے؟ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ اس کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ کی بلاچون وچرا تعمیل کی جائے۔اور ہر شخص کی گردن اس کے سامنے جھکی رہے اگر جھکنے کے لیے تیار نہ ہو تو فوراً تن سے جدا کر دی جائے۔

اسی ظالم وجابر حجاج کے دربار میں ایک بہادر اور خدا پرست خاتون اُم علقمہ رضی اللہ عنہا کو گرفتار کر کے پیش کیا گیا۔وہ جرأت و بسالت کی مجسم تفسیر جب حجاج کے روبرو آئی تو اس نے انتہائی نفرت اور حقارت سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اس کی منحوس خونی صورت کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔حجاج کے لیے یہ طرز عمل نہ صرف حیران کن تھا بلکہ اس کی آتش غیظ وغضب کو بھڑکانے کے لیے بھی کافی تھا حجاج نے

غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں ام علقمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اے خارجیہ! میرے منہ کی طرف دیکھو۔

ام علقمہ: جو منہ بارگاہ خداوندی سے مردود ہو چکا ہو اس کی طرف کیونکر دیکھوں۔

یہ ایک ہی جملہ حجاج ایسے خون آشام درندے کو ہوش و حواس سے بے نیاز کر دینے کے لیے بہت کافی تھا جس شخص کے سامنے آنے سے جری اور حوصلہ مند مرد پہلو بچاتے تھے اور اگر آتے تھے تو خاموشی سے اس کی خرافات اور بیہودہ باتوں کو برداشت کرنے کے لیے مجبور ہوتے تھے اس کی ظلم پرستی کو ایک پابند زنجیر عورت بھرے دربار میں للکار رہی تھی۔ بھلا حجاج یہ توہین کیسے برداشت کر سکتا تھا اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور شدت غضب سے اس کا جسم کانپنے لگا۔

اس گستاخ عورت کے خون کے بارے میں تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ اس نے اپنے حاشیہ نشین مصاحبوں سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''اس کا خون حلال ہے سب نے بیک آواز جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ جہاں حاکم حجاج ہو وہاں اس کے مصاحب کس درجہ کے ہوں گے اور ان سے اس کے علاوہ اور کس قسم کے جواب کی توقع ہو سکتی تھی۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ ام علقمہ کے لیے سزائے موت کا حکم صادر ہو چکا ہے جس کے لیے اب دنیا کے کسی دربار میں فریاد نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ کوئی قانون اس اٹل فیصلے پر نظر ثانی کر سکتا تھا اور نہ اسے منسوخ کر سکتا تھا کیونکہ حجاج ایک ایسا حاکم تھا جو اپنی نوک شمشیر سے روزانہ نئے قوانین وضع کرتا تھا۔ اور انسانی خون سے انہیں ضبط تحریر میں لاتا تھا۔ یہ فیصلہ صادر ہونے کے بعد حجاج کے دستور کی رو سے دوسرے لحہ ام علقمہ کی نعش خاک و خون میں غلطیدہ نظر آنا چاہیے تھی۔

دوسری طرف تصور کیجیے کہ ایک گرفتار ہو کر آنے والی بے بس و لاچار مظلوم عورت اس فیصلے کے بعد کس حال میں ہو گی یقیناً موت ان سے چند قدم کے فاصلے پر

کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مگر یقین کیجئے کہ اُمِ علقمہ رضی اللہ عنہا حجاج کے سامنے کھڑی موت پر مسکرا رہی تھی۔ جب حجاج نے دیکھا کہ وہ اپنے اختیار کو آخری حد تک استعمال کر چکا ہے مگر ایک کمزور اور بے بس عورت بڑی بے پروائی اور بے فکری کے ساتھ کھڑی زیر لب یوں مسکرا رہی ہے جیسے اس کے ظلم و ستم کا مذاق اڑا رہی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی مسکرانے کا موقع تھا۔ حجاج کے خیال میں تو اس وقت اس کے چہرے پر موت کی مردنی چھا جانی چاہیئے تھی۔ چاہیئے تھا کہ اس کا سارا بدن خوف و ہراس سے بیدِ مجنوں کی طرح کانپنے لگ جاتا۔ اس کی خوف زدہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے اور وہ گڑگڑا کر حجاج کے قدموں پر گر پڑتی اور منت وزاری کے ساتھ یہ التجا کرتی کہ اے امیر! تو رحم و کرم کا فرشتہ ہے۔ میں قصوروار اور گناہگار ہوں۔ اور میری زندگی تیرے عفو و کرم کی محتاج ہے۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دے، میرا قصور بخش دے مگر حجاج اسے پائے حقارت سے ٹھکرا کر جلاّد کو سرتن سے جدا کر دینے کا اشارہ کر دیتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ام علقمہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کا چہرہ اسی طرح ہشاش بشاش اور شگفتہ تھا جس پر غم و فکر اور تردد کا معمولی سا اثر بھی نظر نہ آتا تھا۔ وہ اسی اطمینان و سکون سے کھڑی حجاج کی طرف دیکھ کر مسکراتی رہی۔ وہ سخت بے چین ہو گیا اور اسے اپنا وجود اُمِ علقمہ کے سامنے دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑتا ہوا نظر آنے لگا۔ آخر وہ نہ رہ سکا اور قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

حجاج: اس موقع پر تیرے مسکرانے کا سبب کیا ہے؟

ام علقمہ نے تن کر کہا:

"تیرے مصاحبوں کے تو تیرے دوست کے حاشیہ نشینوں کو بھی مات کر دیا ہے۔"

حجاج: (حیرت سے) کون دوست؟

ام علقمہ: (بدستور مسکراتے ہوئے) فرعون۔ اس نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے بارے میں اپنے درباریوں اور مصاحبوں سے مشورہ کیا تو انہوں نے بیک زبان ہو کر کہا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی کو چند روز کی مہلت دو مگر تمہارے مصاحب ان سے بھی بڑھے ہوئے ہیں کہ ایک بے گناہ عورت کے خون کو حلال قرار دے رہے ہیں۔

ام علقمہ رحمۃ اللہ علیہا کے اس دلیرانہ جواب اور فقید المثال جرأت نے حجاج کو پانی پانی کر دیا۔ اس کا غیظ و غضب ندامت میں تبدیل ہو گیا اور اس نے فوراً تلوار نیام کر کے ام علقمہ کو رخصت کر دیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ظالم اور سفاک حجاج کی یوں بے نیام کی ہوئی تلوار امِ علقمہ کا خون چاٹے بغیر واپس نیام میں چلی گئی۔ درحقیقت ایک بہادر اور شجاع خاتون نے بھرے دربار میں اسے ذلت آمیز شکست دی تھی اور امِ علقمہ اس کے قصر جور و استبداد میں ایک خوفناک زلزلہ بن کر وارد ہوئی تھی۔ اس کی ایک مجاہدانہ مسکراہٹ اور مسکت جواب نے حجاج کے ظلم و ستم کو اپنے قدموں پر سجدہ ریز ہونے کے لیے مجبور کر دیا تھا ورنہ کسی پر رحم کھانا تو اس کی فطرت کے سراسر خلاف تھا۔

سوچئے! یہ کس تعلیم و تربیت کا کرشمہ تھا؟ ام علقمہ نے کون سے مدرسے اور کون سی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی؟ وہ بھی آپ کی طرح ایک عورت تھی۔ بالکل سادہ مزاج اور صاف گو عورت۔ آخر امِ علقمہ اور آپ میں کس چیز کا فرق ہے؟ امِ علقمہ میں وہ کون سی بات تھی جو آپ میں نہیں ہے؟ ان تمام سیدھے سادے سوالات کا جواب خود ہی سوچئے۔ کیا یہ درست نہیں کہ امِ علقمہ اسلام کی تعلیم کا ایک معمولی سا پرتو تھی؟ اس کا دل نشۂ توحید سے سرشار تھا۔ وہ ایک سچی مسلمان عورت تھی جو دنیا میں اللہ کے سوا کسی سے بھی مرعوب ہونا، خوف کھانا اور ڈرنا نہ جانتی تھی۔ مسلمان تو ہم بھی ہیں۔ مگر

ہم اسلام کی روح سے یکسر عاری ہو چکے ہیں۔ اُمِ علقمہ کی زندگی اس حقیقت کا درس دیتی ہے کہ ایک حقیقی معنوں میں مسلمان عورت کا دل دنیا کی محبت کا اسیر نہیں ہوتا وہ موت کے خوف سے اسی طرح بیگانہ ہوتی ہے جس طرح ہم دین سے بیگانے ہو چکے ہیں۔ موت اس کے نزدیک ایک بے معنی لفظ ہوتا ہے۔ مسلمان عورت آگے بڑھ کر موت کا خیر مقدم کرتی ہے اور پھر ایسی موت جو حق وصداقت کی راہ میں نصیب ہو۔ یہی تو اس کی سب سے بڑی تمنا ہوتی ہے۔

تاریخ سے پوچھ لیجئے! یہی وہ مائیں تھیں جن کے آغوش سے تربیت پا کر نکلنے والوں نے قیصر وکسریٰ کی شوکت وحشمت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ یہی وہ مائیں تھیں جنہوں نے اپنی نرم ونازک انگلیوں سے تاریخ کے بے شمار تابندہ ودرخشندہ ابواب تحریر کیے جن پر آج بھی ہم فخر کرسکتے ہیں۔

حضرت سُکَینہ بنت امام حسین علیہ السلام

"میری چھوٹی بیٹی تو یادِ الٰہی اور معرفتِ خداوندی میں اس طرح مستغرق رہتی ہے کہ شادی بیاہ کی طرف اس کا بالکل کوئی رجحان معلوم نہیں ہوتا۔" (سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ)

شہید کربلا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی چھوٹی صاحب زادی تھیں۔ والدہ کا نام رباب بنت امراء القیس تھا۔ حضرت علی اصغر رضی اللہ عنہ جو کربلا میں شہید ہوئے تھے آپ کے حقیقی بھائی تھے۔ بعض روایات کے مطابق اصل نام امیمہ یا امینہ تھا اور سکینہ کے لقب سے مشہور تھیں۔ تاریخ پیدائش میں اگرچہ اختلاف ہے مگر زیادہ تر ۵۲ھ صحیح خیال کی جاتی ہے۔

حضرت سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہ ان مظلوم خواتین میں سے ہیں جن کی برگزیدہ زندگیوں کو متعصب، تنگ نظر اور دروغ باف درباری افسانہ نگاروں نے مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انہوں نے بے سروپا اور من گھڑت روایات کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے کہ واقعۂ کربلا کے بعد اسلامی معاشرہ اس حد تک پست اور اسلامی تعلیمات سے عاری ہو چکا تھا کہ

نعوذ باللہ اہل بیت کی اولاد بھی اپنے اخلاقی اوصاف سے محروم ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں حضرت سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہ سے بھی کئی بے بنیاد افسانے منسوب کیے گئے ہیں اور لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ میدانِ کربلا میں اسلام کی عظمت و ناموس پر کٹ مرنے والے عظیم باپ کی محبوب ترین بیٹی کا گھر عرب کے گویوں، سازندوں اور حسن و عشق کے سفلی جذبات کا پرچار کرنے والے شعرا کے لیے ایک پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک صاحب ابوالفرج اصفہانی نے اپنی تصنیف کتاب الاغانی میں عرب کے موسیقاروں گویوں اور شعرا کے حالات جمع کیے ہیں اور ستم یہ کیا ہے کہ سیدنا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی لختِ جگر حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ بھی اسی عامیانہ انداز میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دور جاہلیت کی یاد تازہ کرنے والی شاعری، غنا اور موسیقی کی بہت شوقین تھیں۔ ملک کے نامور فن کاران کے مکان پر جمع ہوا کرتے تھے اور لوگوں کو ان کے کمال فن سے لطف اٹھانے کا اذن عام تھا۔ حالانکہ ان خرافات کے ثبوت میں ایک بھی معتبر اور قابل یقین روایت موجود نہیں۔ اور تاریخی شواہد ان افسانوں کی مکمل تردید کرتے ہیں۔ آپ کی شادی کے معاملے میں بھی اختلاف موجود ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ حضرت سکینہ بنت حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے مصعب بن زبیر، عبداللہ بن عثمان، عبداللہ بن حکم بن حزام اور زید بن عمر سے یکے بعد دیگرے شادیاں کیں۔ مگر دوسرے گروہ نے اسے قطعی غلط قرار دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت سکینہ رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے عبداللہ سے ہوا تھا جو میدانِ کربلا میں دوسرے اصحابِ امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ شہید ہو گئے تھے۔ ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ وہ بیوہ ہو گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے کسی سے شادی نہیں کی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے جناب حسن مثنیٰ نے اپنے چچا حضرت امام حسین علیہ السلام سے ایک مرتبہ درخواست کی کہ

ان کی شادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا میں سے کسی ایک کے ساتھ کر دیں۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے بڑی شفقت اور محبت سے فرمایا کہ اے جانِ عم! میرے نزدیک اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی اور میں اپنی بڑی بیٹی فاطمہ کو تمہارے لیے پسند کرتا ہوں کیونکہ میری چھوٹی بیٹی سکینہ تو یادِ الٰہی اور معرفت خداوندی میں اس درجہ مستغرق رہتی ہے کہ شادی بیاہ کی طرف اس کا کوئی رجحان معلوم نہیں ہوتا چنانچہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی آپ نے حسن مثنیٰ بن حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ سے کر دی۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اس قول سے حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بعض دوسری کئی روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ بے حد عبادت گزار اور زاہدہ تھیں۔ ہر وقت تسبیح وتحمید، ذکر الٰہی اور دعاء استغفار میں مصروف رہتی تھیں۔ اور دوسرے لوگوں سے بالکل الگ تھلگ نہایت سنجیدہ اور خاموش زندگی بسر کرتی تھیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے حضرت سکینہ کی جس زاہدانہ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے حضرت سکینہ کے بچپن کے تمام خدوخال نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جس پاکباز اور برگزیدہ خاتون کا بچپن اس قدر زہد و عبادت اور خشیت الٰہی میں ڈوبا ہوا ہو اس کی جوانی پر فرشتوں کا تقدس کیوں نثار نہ ہوتا ہوگا۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اپنی اس زاہدہ، عابدہ اور شب زندہ دار بیٹی کا بہت خیال رکھتے تھے چنانچہ ایک دفعہ فرمایا ''تیری جان کی قسم! میں اس گھر کو بہت عزیز رکھتا ہوں جس میں سکینہ اور رباب رہتی ہیں۔ مجھے ان دونوں سے بہت محبت ہے اور میں ان پر اپنا مال خرچ کرتا ہوں۔'' حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سکینہ رضی اللہ عنہا سے محض اس لیے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور بے پناہ شفقت سے پیش آتے تھے کہ وہ تقویٰ وطہارت میں بچپن ہی سے بہت ممتاز دکھائی دیتی تھیں۔ اور

ان کے عادات و خصائل میں اتنی کشش تھی کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے علاوہ خاندان کے دوسرے لوگ بھی انہیں بہت چاہتے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اپنی زوجہ رباب سے بھی انہیں زیادہ دلچسپی اپنی ہونہار اور نیک سیرت بیٹی سکینہ کی وجہ سے تھی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ سکینہ کی پرورش اور تربیت خاندان مصطفوی کے شایان شان طریقے پر ہو۔ اور روحانی کمال کی تمام منازل طے کرنے میں حضرت امام شہید رضی اللہ عنہ کا فیضان نظر شامل رہے۔

حادثۂ کربلا کے وقت حضرت سکینہ کی عمر اگرچہ آٹھ سال کے لگ بھگ تھی مگر وہ بھی دوسری خواتین اہل بیت کے ساتھ میدان کربلا میں موجود تھیں۔ جنگ کے دوران جب ان کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور چچا زاد بھائی حضرت عبداللہ عورتوں سے رخصت ہو کر میدان میں جانے لگے تو حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کی آنکھوں میں آنسو بہ نکلے۔ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''اے سکینہ! جب مجھے موت آجائے گی اس وقت تو تجھے بہت رونا ہے جو عمر بھر رہے گا اور اس کو تم اچھی طرح جان لو گی۔ مگر جب تک میں زندہ ہوں اس طرح حسرت کے آنسو بہا کر مجھے پریشان نہ کرو۔ تمہارے رونے سے میرا دل جلا جاتا ہے۔''

حادثۂ کربلا کے بعد جب اہل بیت کی خواتین کا قافلہ دمشق پہنچا تو بقول علامہ مجلسی ایک شخص سہیل بن سعد اس زمانے میں کسی ضرورت کے لیے دمشق گئے ہوئے تھے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت خواتین کی یہ حالت تھی کہ نہ ان کے سروں پر چادریں تھیں اور نہ اونٹوں پر کجاوے۔ راستہ میں سہیل قافلے کے قریب پہنچے اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی ایک صاحب زادی سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میرا نام سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہما ہے۔ سہیل نے بڑے ادب سے کہا کہ اگر میں آپ لوگوں کی مدد کر سکوں تو میرے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوگا۔ حضرت سکینہ

رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا کہ وہ شخص جو نیزے پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا سر لیے جا رہا ہے اس سے کہیئے کہ سر کو ہمارے آگے لے کر چلے تا کہ تماشا دیکھنے والے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر کو دیکھنے میں محو رہیں اور نامحرموں کی نگاہ ہم پر نہ پڑے۔ سہیل فوراً اس شخص کے پاس گئے اور اسے چار سو دینار دے کر آگے چلنے پر رضامند کر لیا۔ اللہ اللہ! اس مصیبت اور کسمپرسی کے عالم میں عفت و عصمت کا یہ احساس اور تقویٰ و طہارت کا یہ عالم کہ کم سنی میں بھی یہ گوارا نہیں کہ نامحرموں کی نگاہیں ان پر پڑیں۔ کون ایسی پاکباز ہستی سے توقع کر سکتا ہے کہ آگے چل کر انہوں نے لہو و لعب کی سرپرستی کا فرض انجام دیا ہو گا۔ اس قسم کی تہمت لگانے کی جرأت کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جس کا دل ایمان و صداقت سے بالکل خالی ہو چکا ہو اور اسے خاندان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کا بھی لحاظ نہ رہا ہو ورنہ کسی راسخ العقیدہ مسلمان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ایسی نیک سیرت اور پاکباز ہستی سے ایسے من گھڑت افسانے منسوب کرے کہ جب اسلام کے مخالفین انہیں بڑھا چڑھا کر بیان کریں تو پوری ملت اسلامیہ کا سر شرم و ندامت سے جھک جائے۔ جو لوگ لہو و لعب کی ایسی زندگی اختیار کرتے ہیں ان کے تیور بچپن سے ایسے نہیں ہوتے کہ وہ قلب و ذہن کو مفلوج کر دینے والے صدمات سہنے کے بعد انتہائی ظلم و تشدد کے ماحول میں بھی نامحرموں کی نگاہ سے بچنے کے لیے زیادہ فکر مند ہوں۔

جب خواتین اہل بیت یزید کے ہاں مقیم تھیں تو ایک روز حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا نے یزید سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

”اے یزید! رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے اگر تو سننا پسند کرے تو میں بیان کروں۔“ یزید نے کہا کہ ہاں بیان کرو۔ حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ رات کو نماز کے بعد دعا و استغفار سے فارغ ہو کر کچھ دیر تک جاگتی رہی۔ پھر بہت زیادہ

رونے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے میری آنکھ لگ گئی تو دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں اور ایک چمکتا ہوا نور زمین سے آسمان تک پھیل گیا ہے۔ وہاں میں نے ایک خوب صورت محل دیکھا جس کے اندر پانچ نورانی صورت کے بزرگ داخل ہو رہے تھے۔ میں نے ایک کنیز سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں جو اتنے زیادہ بے چین دکھائی دے رہے ہیں۔ اس نے کہا۔ سکینہ کیا تم نے ان کو نہیں پہچانا۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ یہ کہاں جا رہے ہیں تو اس نے بتایا کہ تمہارے باپ کے پاس۔ اس کے بعد میری نگاہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پر پڑی۔ ان سے لپٹ کر رونے لگی اور کہا۔ دادی! بخدا بابا قتل کر دیئے گئے اور میں اس کم سنی میں یتیم بنا دی گئی۔ یہ سن کر آپ نے مجھے سینے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ یہ خواب سننے کے بعد یزید نے اہل بیت کی خواتین سے کہا کہ آپ چاہیں تو بخوشی یہاں رہیں ورنہ آپ مدینہ واپس جانے میں آزاد ہیں۔

حافظ دمشقی نے ۱۱۷ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ اسی سال حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی بیٹی سکینہ رضی اللہ عنہا نے انتقال کیا جو بہت خوبصورت خاتون مشہور تھیں اور مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ سے شادی کی تھی۔ ایک اور مؤرخ عبداللہ یافعی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ آپ نے ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔ آپ کی اولاد کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اور نہ ہی ان سے کوئی حدیث مروی ہے بعض لوگوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ ان کی اولاد کا ثابت نہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کی حضرت عبداللہ جن کی کنیت ابوبکر تھی کی وفات کے بعد حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا نے کوئی دوسری شادی نہیں کی بلکہ ساری عمر یاد الٰہی اور زہد و عبادت میں بسر کر دی۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر پینسٹھ سال کے قریب تھی۔

مدینہ میں دفن ہوئیں۔ مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مصر میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئیں۔

حضرت سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہ سے متعلق جو افسانے مشہور کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورتوں میں بالوں کے جوڑے کا رواج بھی حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا سے شروع ہوا تھا کیونکہ سب سے پہلے انہوں نے اس جدت کو رواج دیا تھا۔ اسی نسبت سے عرب میں اسے جمہ سکینہ کا نام دیا جاتا تھا۔ اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے یہ بدعت روکنے کے لیے درہ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات تاریخی لحاظ سے بھی غلط ہے کیونکہ حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت سے قبل فوت ہو چکی تھیں۔

اکثر قابل اعتماد روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت سکینہ بنت حسین علیہ السلام گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتی تھیں اور آخر تک الگ تھلگ رہتی رہیں حتیٰ کہ عورتوں سے بھی ان کا زیادہ میل جول نہ تھا، زہد و ورع ان کی خصوصیت تھی اور وہ تمام اسلامی شعائر کی سختی سے پابند تھیں۔ ایک ایسے شخص کی افسانہ ترازی کو سہارا لے کر جسے معتبر اور بزرگ مؤرخین کاذب قرار دے چکے ہوں حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا ایسی ہستی پر بہتان باندھنا نہ صرف ناانصافی ہے بلکہ خاندان نبوت کی توہین کے مترادف ہے۔ صاحب الاغانی کی بے بنیاد باتوں کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی گواہی پر کسی صورت مقدم نہیں رکھا جا سکتا اور نہ ہی آغانی ایسی کتب کی کوئی اہمیت باقی رہ جاتی ہے کیونکہ اس کتاب کا مصنف کبھی مؤرخین کے زمرہ میں شمار نہیں کیا گیا۔ اس بات کو تو عقل سلیم بھی تسلیم نہیں کرتی۔ کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے آغوش شفقت میں پرورش پانے اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا ایسی پھوپھی کے زیر سایہ رہنے والی خاتون جس نے اپنی آنکھوں سے اپنے اقرباء اور عزیزوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھے ہوں اور ان بے گناہوں کو

خاک وخون میں تڑپتے دیکھا ہو۔ طرح طرح کے مظالم برداشت کئے ہوں، بچپن ہی میں ناقابل برداشت صدمات سہے ہوں۔ غریب الوطنی اور بے کسی کے عالم میں کوفہ و دمشق کے بازاروں میں اپنے خاندان کی رسوائی اور تحقیر کے دلدوز مناظر دیکھے ہوں۔ اس غریب کے دل میں دنیوی عیش وعشرت کی کون سی تمنا باقی رہ گئی ہوگی۔ اس کا زخم خوردہ دل کبھی ان خونی واقعات کی تلخ یاد سے بیگانہ نہیں ہوسکتا اور اسے دنیا کی مسرتوں میں کیا دلکشی نظر آتی ہوگی۔ وہ مظلوم بھلا موسیقی کی محفلوں اور شعروسخن کی مجلسوں سے کیا دل بہلا سکتی ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کا شمار عام عورتوں میں نہ ہوتا تھا۔ اور ان کا خاندان رسول ہاشمی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تھا۔

ولادت ووفات اور شادی وغیرہ کے اختلافات سے قطع نظر عام طور پر حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا کی زندگی ان تمام اسلامی شعائر کی آئینہ دار تھی جو ایک سچی مسلمان خاتون کی زیست کا حاصل ہوتے ہیں۔ وہ زہد وریاضت کی دلدادہ تھیں اور اپنا تمام وقت تزکیہ نفس میں صرف کرتی تھیں۔ ہر قسم کے ہنگاموں اور تفریحات سے قطعی طور پر الگ تھلگ رہ کر ہمہ وقت اللہ کی یاد میں مصروف رہتی تھی اور نہایت خاموشی کے ساتھ پاکیزہ زندگی بسر کرتی تھیں انہوں نے دمشق کے بازار میں جس کردار کا مظاہرہ کیا اور بچپن میں غیرت اور شرم وحیا کی جو روشن مثال قائم کی اس پر لاکھوں جوانیاں قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہماری خواتین کو سوچنا چاہیئے کہ مصیبت کے ایسے کڑے وقت میں ایک مسلمان عورت کس طرح اپنے وقار کو قائم رکھ سکتی ہے۔ مجبوری اور بے بسی کے عالم میں بھی اسے گوارا نہیں ہوتا کہ اس کا چاند سورج کو شرما دینے والا تقدس بردوش حسن غیروں کی حریص نگاہوں کی غذاء بن سکے۔ حضرت سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہما کی زندگی میں یہ درس پوشیدہ ہے کہ مسلمان عورت کوفہ و دمشق کے بھرے بازاروں میں بھی اپنی غیرت کا شدید احساس زندہ رکھ سکتی ہے اُن کے نزدیک اس سے بڑی

رسوائی اور کوئی نہیں ہوتی کہ وہ دوسروں کے لیے ایک تماشا بن جائے۔ اور کسی کی ناپاک نگاہیں اس کے شرف و امتیاز کے رُخِ پُر انوار کو داغدار کرنے کی کوشش کریں۔

اس دینداری اور زہد و ورع کے ساتھ وہ بے حد ذہین، انصاف پسند اور روشن ضمیر تھیں اور اکثر و بیشتر معاملات میں اپنی رائے کا اظہار بڑے جچے تلے الفاظ میں کیا کرتی تھیں چنانچہ یزید بن معاویہ سے متعلق ان کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ میں نے منکرین خدا میں یزید بن معاویہ سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔ قناعت اور درویشی کے باوجود بہت فیاض، نرم دل، غمگسار اور ہمدرد تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ حج کے لیے روانہ ہوئے تو حضرت سکینہ رضی اللہ عنہا نے ایک ہزار درہم ان کی خدمت میں روانہ کئے مگر آپ نے وہ رقم فقراء اور مساکین میں تقسیم کر دی۔

ام الخیر حضرت رابعہ عدویہ رحمۃ اللہ علیہا

''میں نے اپنے کو مفلس اور رابعہ کو مخلص پایا۔''
(حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ)

''جب عورت راہِ خدا میں مرد اور بہادر ہو، اس کو عورت نہیں کہنا چاہیے۔'' (حضرت شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ)

''حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ مسائل دریافت کرنے آپ رحمۃ اللہ علیہا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کی دعا اور نصیحت کے متمنی اور آرزومند رہتے تھے۔''
(دارا شکوہ)

وہ چمن زارِ شرف و ولایت اور فخر و بزرگی جس کی مہک سے عبادت و تقویٰ کی دنیا ہمیشہ رشکِ فردوس بنی رہے گی۔

آپ عرب کے ایک مشہور خاندان قبیلہ عدوی سے تھیں۔ بصرہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے رابعہ بصریہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔ کنیت ام الخیر تھی۔ حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا کے والد اسماعیل انتہائی تنگ دستی اور مسرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ بے حد دین

دار عبادت گزار اور نیک نفس تھے مگر غریبی اور مفلسی کا یہ عالم تھا کہ جس رات حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا پیدا ہوئیں گھر میں چراغ جلانے کے لیے تیل تک موجود نہ تھا اور نہ انہیں لپیٹنے کے لیے فالتو کپڑا تھا۔ حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا کی تین بڑی بہنیں تھیں۔ اور آپ سب سے چھوٹی تھیں اسی لیے آپ کا نام رابعہ یعنی چوتھی لڑکی مشہور ہوا۔ حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا کے والد ماجد ان کی پیدائش کے وقت کسی ہمسائے سے تیل مانگنے کے لیے گئے مگر غیرت نے دست سوال دراز کرنا گوارا نہ کیا اور واپس آ گئے۔ اسی حالت میں سو گئے تو خواب میں بشارت ہوئی کہ بصرہ میں ایک شخص عیسیٰ زاوان ہے جو ہر شب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سو مرتبہ دورد بھیجتا ہے۔ ایک رات وہ دورد بھیجنا بھول گیا ہے اور اب کفارے کے طور پر وہ اپنی حلال کی کمائی سے چار سو دینار تمہارے پاس بھیجے گا چنانچہ صبح کو عیسیٰ زاوان چار سو دینار لے کر خود ان کے والد کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اشیائے ضرورت فراہم کیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس رات حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا پیدا ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے والد کے خواب میں تشریف لائے اور فرمایا کہ تمہارے ہاں بہت مبارک لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا نے اسی قناعت اور فقر و تنہائی کے ماحول میں ابتدائی تربیت حاصل کی مگر جلد ہی والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور دوسری بہنیں بھی ان سے جدا ہو گئیں آپ کی عمر ابھی دس سال کی تھی کہ کسی نے انہیں لونڈی بنا کر بیچ ڈالا۔ خریدار آپ سے سخت مشقت اور محنت کے کام لیتا تھا۔ ایک معمولی کنیز ہونے کی وجہ سے آپ نے بے پناہ مصائب اور تکالیف برداشت کیں۔ ایک دفعہ آپ بازار میں کسی کام کی غرض سے جا رہی تھیں کہ کسی نامحرم کو دیکھ کر راستہ چھوڑنے کی کوشش میں گر پڑیں اور آپ کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا۔ آپ نے سجدہ میں گر کر اللہ سے دعا مانگی کہ یا الٰہی! اگرچہ میں ایک مصیبت زدہ معمولی کنیز اور بے حیثیت لونڈی ہوں لیکن مجھے اپنے مصائب و آلام کی کوئی فکر نہیں۔ میں صرف تیری

رضا اور خوشنودی چاہتی ہوں۔

اس تکلیف دہ غلامی کے زمانے میں بھی آپ انتہائی زاہدانہ زندگی بسر کرتی تھیں اور ہر وقت یادالٰہی میں مصروف رہتی تھیں۔ محنت و مشقت اور کام کاج کے بعد جتنا وقت ملتا صوم وصلوٰۃ اور وظائف و دعا میں بسر کرتی تھیں۔ ہمیشہ روزہ رکھتی تھیں اور رات بھر عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ ایک رات آپ اپنے مالک حقیقی کے حضور سر بسجود ہو کر دعا و استغفار میں محو تھیں کہ اتفاق سے گھر کا مالک جاگ اٹھا۔ اس نے دیکھا کہ مکان میں ہر طرف اندھیرا ہے مگر حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا کے کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے قریب آ کر دیکھا کہ حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا سجدے میں گری ہوئی ہیں اور ان کے سر کے قریب ایک نورانی ہنڈولا سا لٹک رہا ہے جس کی روح پرور روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے غور سے کان لگا کر سنا تو حضرت رابعہ یہ کہتی ہوئی سنائی دیں۔

"خداوندا! میں تیری مخلوق ہوں۔ لیکن تیری رضا اس میں تھی کہ میں تیرے ہی ایک بندے کی خریدی ہوئی لونڈی بن کر رہوں۔ اگر میں تیرے سوا کسی اور کی کنیز نہ ہوتی تو تیری عبادت کے لیے اتنی دیر میں حاضر نہ ہوتی اور ایک لمحہ بھی تیری عبادت سے غفلت نہ کرتی۔"

حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا کا مالک یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر سخت حیران ہوا اور اس پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ ایک معمولی کنیز کا روحانی مرتبہ اتنا بلند بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے فوراً صدق دل سے توبہ کی کہ آئندہ کبھی ایسی نیک اور خدا رسیدہ خاتون سے کوئی خدمت نہیں لوں گا۔ صبح ہوتے ہی اس نے حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا کو آزاد کر دیا اور بڑے ادب کے ساتھ عرض کی کہ اگر آپ رحمۃ اللہ علیہا چاہیں تو یہاں قیام فرمائیں۔ میں آپ کی ہر ممکن خدمت کو اپنے لیے باعث فخر و سعادت خیال کروں گا۔ بصورت دیگر آپ جہاں پسند فرمائیں تشریف لے جائیں۔ آپ نے آزاد ہوتے ہی شہر کے ایک غریب محلے میں ایک معمولی سا مکان

لے کر رہنا شروع کیا اور اپنی باقی زندگی یادِ الٰہی کے لیے وقف کر دی۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ آپ نے کسی شخص کے ساتھ شادی کر لی تھی اور اس کی وفات تک عام لوگوں کو آپ کی بزرگی اور عظمت کا زیادہ علم نہ ہو سکا کیونکہ وہ دنیا کے ہنگاموں سے الگ تھلگ خاموشی کے ساتھ اللہ کی یاد میں مصروف رہتی تھیں۔ جب آپ کے شوہر کا انتقال ہوا اس وقت ان کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ مشہور و معروف بزرگ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ آپ کے استاد تھے۔ اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر دینی امور کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ خود حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ان کے بہت زیادہ مداح تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اپنے کو مفلس اور رابعہ کو مخلص پایا ہے۔

آپ کی مبارک زندگی سادگی، تقویٰ، طہارت، پاکیزگی اور دینداری کا ایک بے مثال نمونہ تھا۔ انہوں نے جن تکلیف دہ اور پُر مصائب حالات میں روحانی کمال و ترقی کی منازل طے کیں وہ ایک عجوبہ سے کم نہیں۔ زہد و عبادت کا یہ عالم تھا کہ آپ رات بھر عبادت کرتی تھیں۔ ہمیشہ روزہ رکھتی تھیں اور رات دن میں ایک ہزار نوافل ادا کرتی تھیں۔ شب بیداری اور یادِ الٰہی میں مستغرق رہنا فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ آپ کو شہرت، ناموری اور خوشامد سے سخت نفرت تھی۔ اس لیے ہمیشہ اپنے نیک اعمال اور روحانی بلندیوں کو دوسروں سے چھپایا کرتی تھیں اور لوگوں کو بھی نصیحت کیا کرتی تھیں کہ جس طرح تم اپنے عیوب اور گناہ دوسروں سے چھپاتے ہو، اسی طرح اپنی نیکیوں اور اچھے کاموں کو بھی پوشیدہ رکھا کرو۔ اگر کوئی شخص ان کی تعریف کرتا تو انہیں سخت روحانی اذیت ہوتی تھی۔ ایسے لوگوں کو حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا یہ کہہ کر ٹال دیتی تھیں کہ جاؤ کوئی نیک کام کرو، کیوں اپنا وقت بے کار ضائع کرتے ہو۔ اگر کسی اشد ضروری بات کا جواب دینا پڑتا تو آیات قرآنی سے جواب دیا کرتی تھیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہیں قرآن کریم پر کتنا عبور حاصل تھا۔

آپ کے شرف و تقدس کا یہ عالم تھا کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ایسے جلیل

القدر بزرگ مسائل دریافت کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور دعاو نصیحت کے آرزومند رہتے تھے۔

ایک دفعہ کسی نے آپ سے دریافت کیا آپ اللہ کو دوست رکھتی ہیں۔فرمایا بے شک میں اللہ کو دوست رکھتی ہوں۔سوال کرنے والے نے پھر پوچھا کہ کیا آپ شیطان کو دشمن سمجھتی ہیں؟ فرمایا کہ اللہ کی محبت نے مجھے اس درجہ وارفتہ بنا رکھا ہے کہ مجھے شیطان کی دشمنی کی نہ پروا ہے اور نہ اتنی فرصت کہ میں اس طرف توجہ دوں۔

اس شرف و امتیاز کی وجہ سے آپ عوام میں تاج الرجال کے لقب سے مشہور تھیں اور آپ کا آستانہ مبارک بڑے بڑے بلند مرتبہ بزرگوں کے لیے سرچشمہ عرفان وہدایت کی حیثیت رکھتا تھا۔

بندوں کا احسان لینے سے ہمیشہ بچتی تھیں کیونکہ وہ بے حد خوددار اور غیرت مند تھیں۔ایک دفعہ موسم بہار میں گھر میں داخل ہوئیں پھر باہر نہ نکلیں۔کسی نے آپ سے کہا کہ باہر آؤ اور اللہ کی قدرت کا مشاہدہ کرو فرمایا کہ تم اندر آکر صانع قدرت کا جلوہ دیکھو۔وہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کے کپڑے بہت بوسیدہ ہو چکے ہیں۔اس نے عرض کیا کہ ہر شخص آپ کی خدمت کرنا اپنے لیے باعث سعادت خیال کرتا ہے۔اشارہ فرمائیں تو نیا لباس حاضر کر دیں۔آپ رحمۃ اللہ علیہا نے فرمایا کہ مجھے اس مالک ارض وسماء سے دنیا طلب کرتے ہوئے شرم آتی ہے جو ہر چیز کا مالک ہے۔بھلا اس سے کیونکر طلب کر سکتی ہوں جو خود مالک حقیقی کا محتاج ہے۔اسی طرح ایک مرتبہ آپ فریضہ حج ادا کرنے کے لیے جارہی تھیں۔راستے میں آپ کا گدھا بیمار ہو گیا۔اور لوگوں نے خیال کیا کہ مر گیا ہے چنانچہ اہل قافلہ میں سے ہر شخص نے آپ کا سامان اٹھانے کے لیے پیشکش کی۔آپ نے شکریہ کے ساتھ انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ جب میں نے حج کا ارادہ کیا تھا تو مجھے اللہ کی مدد پر بھروسہ تھا۔میں نے اس کے بندوں کی مدد پر بھروسہ کر کے نہیں آئی۔جب قافلے والے آپ سے علیحدہ ہو

گئے تو آپ نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کی اے مالک! ایک غریب اور مسکین عورت کے ساتھ شہنشاہ کو ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ تو نے مجھے اپنے گھر میں آنے کی دعوت دی اور میرے گدھے کو راستے میں ہی قریب المرگ کر دیا۔ تجھے علم ہے کہ میں تیرے احسان کی عادی ہو۔ مجھے اپنے بندوں کے احسان سے بچا۔ دوسرے دن آپ کا گدھا بالکل تندرست ہو گیا۔ آپ ہمیشہ اللہ سے دعا کیا کرتی تھیں کہ اے خدا دنیا سے جو کچھ میرے نصیب میں تو نے لکھا ہے وہ اپنے دشمنوں کو عطا فرما۔ کیونکہ میرے لیے بس تیری ذات پاک کافی ہے۔ مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تذکرہ نویسوں نے کشف وکرامات کے بے شمار واقعات آپ سے منسوب کئے ہیں۔ ان معجزات وکرامات کی روایات میں آپ کی زندگی کے حالات بھی گم ہو کر رہ گئے ہیں۔

حضرت شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے آپ رحمۃ اللہ علیہا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ عورت راہِ خدا میں مرد اور بہادر ہو اس کو عورت نہیں کہنا چاہیے۔ حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ نے ایک معمولی سا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ایک دفعہ نو بھوکے آدمیوں نے آپ رحمۃ اللہ علیہا سے کھانے کا سوال کیا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہا کے پاس صرف دو روٹیاں تھیں۔ اتنے میں کسی نے آواز دی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہا نے دونوں روٹیاں اسے عنایت فرما دیں۔ بھوکے مہمان سخت حیران ہوئے کہ اب ہمیں کیا دیں گی؟ اتنے میں کسی کی کنیز بہت سی روٹیاں لے کر آ گئی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہا نے گنا تو اٹھارہ روٹیاں تھیں۔ کنیز سے فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ تو غلطی سے یہ روٹیاں لے کر میرے پاس آ گئی ہے۔ تیری مالکہ نے کہیں اور بھیجا ہو گا۔ کنیز نے بہت کہا کہ بانو نے یہ روٹیاں آپ رحمۃ اللہ علیہا کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ مگر آپ رحمۃ اللہ علیہا نے اسے واپس لے جانے کی ہدایت کی۔ اس پر بھوکے مہمان اور بھی پریشان ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد وہی کنیز پھر روٹیاں لے کر واپس آئی۔ گنا تو پوری بیس روٹیاں تھیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہا نے یہ روٹیاں اپنے مہمانوں کے سامنے رکھ دیں۔

انہوں نے حیرت کے ساتھ روٹیاں واپس کرنے کی وجہ پوچھی تو حضرت رابعہ

ؓ نے فرمایا کہ جب تم لوگ میرے ہاں آئے تھے تو مجھے معلوم تھا کہ تمہیں کئی دنوں کا فاقہ ہے۔ میں نے سوچا کہ میرے پاس تو صرف دو روٹیاں ہیں۔ یہ نو مہمانوں کے لیے بہت ناکافی ہیں۔ اس لیے میں نے سائل کو دے دیں اور اللہ سے دعا کی کہ تو نے اسی دنیا میں ایک کے بدلے دس دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یہ وعدہ پورا کر دے۔ یہی وجہ تھی کہ جب اٹھارہ روٹیاں آئیں تو میں سمجھ گئی کہ یا تو لونڈی نے بددیانتی کی ہے یا بھیجنے والی نے غلطی کی ہے۔ چنانچہ میں نے تمہارے سامنے روٹیاں واپس کر دیں اور دوبارہ پوری بیس روٹیاں آ گئیں۔

اکثر مغربی اور مشرقی مورخین نے حضرت رابعہ ؓ کا یہ مشہور خواب بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ آپ ؓ نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے رابعہ! تو مجھے دوست رکھتی ہے؟ عرض کیا یا: رسول اللہ ﷺ! کون ہے جو آپ کو دوست نہیں رکھتا۔

ایک اور واقعہ بھی مشہور ہے کہ ایک دفعہ حج کرنے گئیں تو سات برس تک عرفات میں مقیم رہیں۔ حضرت شیخ علی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ انہیں غیب سے یہ آواز سنائی دی: اے رابعہ! تیری یہ کیسی طلب ہے جس نے تیرا دامن پکڑ لیا ہے۔ اگر تجھے میری تمنا ہے تو خواہش کر کہ میں تجلی کروں۔ حضرت رابعہ نے عرض کی کہ اے خالقِ کائنات! غریب اور کمزور رابعہ میں اتنی قوت کہاں کہ تیری تجلی دیکھ سکے۔ میں صرف ایک نکتے کی حقیقت معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ فقر کیا شے ہے؟ جواب ملا کہ فقر ہمارا قہر ہے۔ اللہ اللہ! ان ہستیوں کی عظمت و رفعت کا بیان کہاں ممکن ہے۔ جن کے خوابوں کی دنیا رحمتِ دو عالم، شہنشاہِ کونین، احمدِ مجتبیٰ ﷺ کے جلوے سے آباد ہو اور جو عرفانِ حقیقت کی اس آخری منزل تک پہنچ چکی ہوں۔ جہاں ذہن و نظر کے پردے اٹھ جائیں، وجودِ خاکی کے حجاب ختم ہو جائیں اور عالمِ انوار کے لافانی مناظر بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں۔ ایک دفعہ کسی نے ازراہِ تمسخر ان سے کہا کہ مردوں کو تین

رتبے ایسے عطا ہوئے ہیں جن سے عورتیں محروم ہیں۔ مرد کامل العقل اور مضبوط ہوتے ہیں مگر عورتیں ناقص اور کمزور چنانچہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر رکھی گئی ہے۔ عورتیں دین کے معاملے میں ناقص ہوتی ہیں۔ تیسرے کسی عورت کو آج تک نبوت عطا نہیں ہوئی۔ حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا نے فرمایا کہ عورتوں کو تین خصلتیں ایسی عطا ہوئی ہیں کہ جن سے مرد محروم ہیں۔ کسی عورت نے آج تک خدائی کا باطل دعویٰ نہیں کیا۔ عورتوں میں ہیجڑے نہیں ہوتے۔ آج تک جتنے نبی، ولی، شہید، صدیق، علماء اور فضلا ہوئے ہیں سب عورتوں کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔

ایک دفعہ لوگوں نے حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا سے دریافت کیا کہ بندہ کس طرح خوش ہوسکتا ہے؟ فرمایا کہ جب محنت اور نعمت دونوں پر یکساں اللہ کا شکر کرے۔ پھر پوچھا گیا کہ کیا گناہگار کی توبہ قبول ہوسکتی ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ گناہگار تو توبہ ہی اس وقت کرے گا جب اللہ اسے توبہ کرنے کی توفیق دے گا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ انسان آنکھوں، کانوں اور زبان سے معرفت الٰہی کی منزل نہیں پا سکتا کیونکہ یہ سب اعضاء تو حیرت کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا انحصار صرف دل پر ہے۔ اپنے دلوں کو بیدار رکھنے کی کوشش کرو کیونکہ دل اگر بیدار ہے تو خود بخود اللہ کی محبت میں گم ہوجاتا ہے۔

جب وقت وفات قریب آیا تو اپنی خدمت گزار عبدہ بنت شوال سے کہا اے عبدہ! میری موت کے بعد میرے لیے کسی کو تکلیف نہ دینا۔ اس وقت میں جو کرتا پہنے ہوئے ہوں اسی میں دفن کر دینا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ وفات کے وقت کئی بزرگ ہستیاں اور اولیائے وقت آپ کی سرِ بالیں موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں سے اٹھو اور اللہ کے محبوب بندوں کے لیے جگہ خالی کر دو۔ سب اٹھ کر باہر چلے گئے تو اندر سے یہ آواز سنی گئی۔ اے نفس مطمئنہ! تو میری رحمت پا کر شاکر رہا محنت و مشقت پر صابر رہا۔ دنیا سے اپنے پروردگار کی طرف رخصت ہو، اس حال میں کہ خدا کی عطا و بخشش پر تو راضی ہے اور خدا تجھ سے راضی ہے۔ میرے برگزیدہ اور صالح

بندوں کے گروہ میں شامل ہو جا۔" جب یہ اکابر مشائخ اندر گئے تو حضرت رابعہ حیاتِ جاودانی کی طرف رخصت ہو چکی تھیں۔ مزار جبل قدس میں بیان کیا جاتا ہے۔

وفات کے بعد آپ کو کسی نے خواب میں دیکھا اور ان سے پوچھا کہ نکیرین کے ساتھ کیسا معاملہ ہوا فرمایا جب وہ آئے اور پوچھا کہ تیرا رب کون ہے تو میں نے ان سے کہا کہ واپس جاؤ اور حق تعالیٰ سے کہو کہ اتنی بے اندازہ مخلوق میں تو نے اس کمزور اور نحیف و نزار بوڑھی عورت کو نہیں بھلایا تو میں تجھے کیسے فراموش کر سکتی ہوں جب کہ تو مجھے ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔

حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کی زندگی اور ان کے کردار کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسی دور کے عام حالات کو اپنے سامنے رکھیں۔ بنو امیہ کا دور حکومت تھا۔ امراء دولت، اقتدار اور حکومت کے نشے میں مست تھے۔ عام لوگ زندگی کو پر آسائش او رمسرت انگیز بنانے کے لیے ہر وقت زر و مناصب کے حصول کے لیے جدوجہد میں مصروف رہتے تھے۔ دنیا پرستی کی ہوس، بلند اور اعلیٰ اوصاف کو دیمک بن کر چاٹ رہی تھی۔ اسلام کی پاکیزہ تعلیم کے حقیقی خدوخال، زراندوزی اور ہوس پرستی کے بے پناہ بوجھ تلے دبے جا رہے تھے۔ ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے ایک مرد درویش حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور ایک بلند مرتبہ خاتون حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کو یہ توفیق عطا فرمائی کہ وہ فکر و نظر کی گہری تاریکی میں نیکی اور معرفت الٰہی کے چراغ روشن کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بصرہ کے تنگ و تاریک محلوں اور بوسیدہ جھونپڑوں میں روشن ہونے والی ان دو مشعلوں نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک عرفان و ہدایت کے لاکھوں چراغ روشن کر دیئے۔ دنیا کے تاریک ترین گوشے بھی ان کے نورانی کردار کی قندیلوں سے جگمگا اٹھے۔ ان دو مبارک ہستیوں نے جس سلسلۂ رشد و ہدایت کی بنیاد رکھی تھی اس نے پھیل کر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اولیائے کرام کی بے پناہ ہمت اور مسلسل کوششوں سے دور دراز ممالک میں حیرت انگیز سرعت سے اسلام پھیلتا چلا گیا۔

خصوصیت کے ساتھ برصغیر پاک و ہند اور قرب و جوار کے جزائر میں آج ہمیں جو مسلمان نظر آ رہے ہیں وہ سب ان اولیائے کرام کی تبلیغی کوششوں کے رہین منت ہیں۔

حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا نے اس منصب پرستی اور زر اندوزی کے دور میں غیرت اور خودداری کی جو مثال قائم کی وہ اسلام کی عظمت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ آپ نے عمر بھر کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ اپنی حاجت روائی کے لیے کسی بادشاہ اور رئیس کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تادم آخر کسی کا احسان تک لینا گوارا نہ کیا اور دنیا کی کوئی مجبوری ان کے پاؤں کی زنجیر نہ بن سکی۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے رازق پر بھروسہ کیا۔ ہمیشہ خالق ارض وسما سے مدد مانگی اور اسی شہنشاہ ہوں کے شہنشاہ کے دربار میں جھولی پھیلا کر اپنی مراد مانگی۔ وہاں بھی انہوں نے کبھی دنیا طلب نہیں کی۔ دولت نہیں مانگی، حشمت و شوکت کی تمنا نہیں کی، جاہ و جلال کی آرزو نہیں کی۔ دنیوی عیش و آرام کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ جب بھی دست طلب دراز ہوا تو اسی دعا کے ساتھ کہ الٰہی! بس تیری رضاء اور خوشی چاہتی ہوں۔ تیرے سامنے سب کچھ ہیچ ہے۔ مجھے تیرے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بے نیازی اور فقر او غناء کا یہ عالم تھا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھی دنیا کے کسی شخص کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کیا۔ بلکہ یہ وصیت فرمائی کہ جو بوسیدہ کرتا زیب بدن ہے اسی کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ ہماری ان بہنوں کے لیے مقام غور ہے جن کی نگاہ اس چندروزہ تازگی کے بے حقیقت اغراض سے کبھی آگے نہیں بڑھتی۔ پر تکلف ملبوسات، گراں قدر زیورات، پر تکلف کھانے اور زندگی کی آسائشیں جن کے لیے حاصل کائنات ہیں۔ جنہیں اپنے اعمال و افعال کی وجہ سے معمولی سی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتی ہیں۔ اپنے ساتھ کئی دوسرے لوگوں کو وقف رنج و الم بنا دیتی ہیں۔ دوسری طرف وہ مبارک ہستی ہے کہ عسرت و افلاس اور تنگدستی کے ماحول میں ہوش سنبھالا تو ماں باپ کی شفقت سے محروم ہو گئیں۔ اسی پر مصائب کا خاتمہ نہیں ہو گیا۔ بصرہ کے بازار میں انہیں کنیز بنا کر فروخت کیا گیا۔

بے پناہ محنت و مشقت کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ مگر وہ جوہر قابل مصائب و آلام کی اس بھٹی میں رہ کر کندن بنتا چلا گیا۔ انہوں نے ان حالات میں بھی ہمیشہ صبر و رضا اور توکل کا چراغ روشن رکھا۔ کبھی شکایت نہیں کی۔ کبھی حالات کا رونا نہیں رویا۔ کبھی اپنے مولا سے شکوہ نہیں کیا۔ ہمیشہ خندہ پیشانی اور صبر و استقلال سے ہر مصیبت کا خیر مقدم کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا، زہد و عبادت کی طرف توجہ فرمائی تو فرشتوں کو شرمسار کر دیا۔ آہِ سحر گاہی سے باوضو رہ کر اپنی خاموش راتوں کو ہمیشہ سجدوں سے آباد رکھا۔ تقویٰ و طہارت میں بڑے بڑے اللہ والوں اور خدا رسیدہ بزرگوں کو مات کر دیا۔ عشق الٰہی اور استغراق میں وہ کمال حاصل کیا کہ دنیا آج تک حیران ہے کہ ایک عورت کیسے درجۂ ولایت تک جا پہنچی اور کوئی مرد آج تک ان کا مقابلہ نہ کر سکا۔ سلوک و معرفت کی تمام منازل ایک سچی مسلمان خاتون کی طرح اس طرح طے کیں کہ کسی قدم پر احکام دین کی تعمیل میں غفلت نہیں ہوئی آخر یہ مرتبہ نصیب ہوا کہ رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی اور میدان عرفات میں قریب تھا کہ تمام حجابات اٹھ جاتے اور کوہ طور کو لرزہ براندام کر دینے والی تجلی ان کے سامنے ہوتی اور روایت کلیمی کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے دربار کی ایک معمولی کنیز میدان عرفات میں دہرا کر مذہبی تاریخ کا رخ بدل دیتی مگر مشیت کو یہ منظور نہ تھا اور حضرت رابعہ رحمۃ اللہ علیہا شاید اس کی متحمل بھی نہ ہو سکتی تھیں۔ ایسا نہ ہوا مگر ایک خدا رسیدہ خاتون نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ حضرت خیر الانام ﷺ کا دامن تھام کر انسانی وجود کی سرحدوں سے بہت آگے تک بھی جا سکتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ عورت ناپاک اور نجس ہوتی ہے کون اس حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے کہ ایک بلند مرتبہ خاتون کی عظمت حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سفیان ثوری ایسے بزرگوں سے خراج عقیدت حاصل کر سکتی ہے اور بڑے بڑے علماء اور مشائخ اس کے سامنے زانوئے تلمذ طے کر سکتے ہیں۔ ایک رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا ان کروڑوں مردوں پر بھاری ہیں جو اپنے نفس کے قید خانے سے باہر نہیں آ سکتے۔

ہماری وہ بہنیں جو آج چند کتابیں پڑھ کر پوری دنیا کو ہیچ سمجھنے لگتی ہیں۔اس سرچشمہ علم وعرفان کی طرف دیکھیں کہ علم ان کی چوکھٹ پر سجدہ ریز تھا۔مشکل ترین مسائل اور حقائق کائنات پر انہیں حیرت انگیز عبور تھا۔قرآن ان کی گفتگو تھی یعنی وہ آیات قرآنی میں بات کرتی تھیں،علوم عصریہ ان کے سامنے بے حقیقت تھے مگر اس کے باوجود وہ نیکی و پارسائی،تقویٰ وطہارت،عفو وحلم،مروت وشفقت خاکساری اور عجز کا مجسمہ تھیں۔حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے معرفت الٰہی،عشق حقیقی اور سلوک کی تمام منزلیں طے کیں۔مگر احکام خداوندی اور شریعت سے کبھی سر موانحراف نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ روزہ ونماز اور زہد وعبادت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔حالانکہ عشق الٰہی اپنے جلال و جمال کے ساتھ ان کے وجود کا حصہ بن چکا تھا۔کس قدر عالی ظرف تھیں حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ کسی کو اجازت دی کہ کوئی ان کی خوشامد تو کیا تعریف بھی کر سکے۔کیونکہ ان کے نزدیک دوسروں کی خوشامد سے انسان ذلیل ہوتا ہے اور کفران نعمت کا مرتکب ہوتا ہے اور دوسروں کی خوشامد سے کبر وغرور کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔یہ دونوں باتیں ایک مسلمان کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔سلام اس ہستی پر جس نے دنیادار لوگوں سے بے نیاز رہ کر حقیقی خودداری کی اسلامی روایات کو زندہ کیا۔رشد وہدایت اور علم ومعرفت کے چراغ روشن کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام صرف شمشیر زنی،جہانبانی،جہانگیری،فتوحات اور پر شکوہ سلطنتوں کا نام نہیں بلکہ یہ تسخیر قلوب کے ایک ایسے عمل کا نام ہے جس کی طاقت کا مخزن بھی دل کے اندر ہوتا ہے۔یہ وہ رشتہ ہے جو بندوں کا تعلق ان کے خالق سے پیدا کرتا ہے۔یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا جیسے بزرگوں نے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر،لشکر وسپاہ اور شمشیر وسلطنت سے بے نیاز رہ کر کفر وظلمت کے ان مراکز میں توحید الٰہی کے دیئے جلائے۔جہاں اسلام کا نام لینے

والوں کی گردنیں اڑادی جاتی تھیں۔ ان بوریا نشین فقیروں نے فقر و استغناء کی طاقت سے جاہ و جلال اور حشمت و شوکت کو ہر جگہ شکستِ فاش دی۔ شہنشاہوں اور مہاراجوں کی ہیبت و صولت کو لرزہ براندام کر دیا۔ تاریخ سے پوچھئے کہ کس طرح شکوہِ بوریا سے سر یر قیصری کانپتا رہا ہے۔ اسی فقر و استغناء میں مسلمانوں کا حقیقی جوہر پنہاں ہوتا ہے۔

حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کی زندگی جہاں ہمیں غیرت، خودداری اور غیر اللہ کی چوکھٹ پر نہ جھکنے کا درس دیتی ہے وہاں یہ سبق بھی سکھاتی ہے کہ جب مسلمان دنیا کی ہر بڑی سے بڑی طاقت سے بھی ڈرنا چھوڑ دیتا ہے اور صرف اللہ سے ڈرنا سیکھ لیتا ہے تو پھر دنیا کی ہر بدی اور ہر شیطانی طاقت اس سے ڈرتی ہے۔ دنیا کی محبت سے بے نیاز رہنے والے کو دنیا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

خدا کرے کہ حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کے شعلۂ حیات کی ایک چنگاری ہماری ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کے مردہ قلوب میں بھی جوشِ کردار کا یہ جوہر پیدا کر دے اور ہم ان کی ماہتاب کی طرح روشن زندگی سے کم از کم یہ سبق ضرور سیکھ سکیں کہ اپنی حاجت روائی کے لیے اللہ کے سوا کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کریں۔

عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا

آپ رضی اللہ عنہا علوم وفنون کا ایک مرقع جمیل تھیں اور عرب بھر میں صاحب فضل وکمال خیال کی جاتی تھیں۔ دور اموی کی اکثر علم دوست اور ممتاز خواتین میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

باپ کا نام طلحہ رضی اللہ عنہ تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی تھے آپ کی والدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لخت جگر تھیں۔ یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نواسی تھی۔ بے حد حسین وجمیل اور ذہین وعقل مند تھیں۔ پہلا نکاح عبداللہ بن عبدالرحمان بن ابوبکر رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ ان کی وفات کے بعد عمر بن عبیداللہ کے نکاح میں آئیں۔ ان کے ہاں چار بیٹے عمران، عبدالرحمان، ابوبکر اور طلحہ ہوئے اور ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام نفیسہ تھا۔ عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا بھی مسلمانوں کے دور عشرت کی اسلام دشمن افسانہ طرازیوں سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ان کی علمی فضیلت، ادبی قابلیت اور امتیازی حیثیت کو دشمنوں نے مبالغہ آرائی اور ہرزہ سرائی کے ایسے رنگ دیئے ہیں کہ ان کی شخصیت بے سروپا روایات اور من گھڑت قصوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ ایک بدنام اور اخلاق باختہ قصہ نویس نے تو ان سے کئی ایک ایسی باتیں بھی منسوب کر دی ہیں جنہیں کوئی شریف النفس شخص پڑھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ ہمارا اشارہ اسی افترا طراز اور دروغ باف ابوالفرج اصفہانی کی طرف ہے جس نے حضرت سکینہ بنت حسین

رضی اللہ عنہا ایسی بلند ہستی پر بہتان باندھنے میں شرم محسوس نہیں کی۔ اسی نے عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا کے متعلق بھی کئی ناروا باتیں لکھی ہیں اور جھوٹ سچ کو اس طرح گڈمڈ کر دیا ہے کہ آج انتہائی تحقیق و جستجو کے بعد بھی ان کے تفصیلی حالات نہیں مل رہے۔ ان کے متعلق صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ آپ نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ایسی باکمال اور بلند سیرت ہستی کے زیر سایہ تربیت حاصل کی۔ اپنی پیکر علم و فضل خالہ کی صحبت نے ان کے علمی اور ادبی ذوق کو نکھرنے میں بہت مدد دی۔ اور وہ بلند اوصاف کی ایک حسین و جمیل تصویر بن کر عہد شباب کو پہنچیں تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھتیجے عبداللہ بن عبدالرحمان سے ان کی شادی کر دی مگر وہ کچھ عرصہ بعد انتقال کر گئے۔ جس خاتون نے بچپن سے اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے دامان عاطفت میں پرورش پائی ہو اس کے فضل و کمال اور اوصاف جمیلہ کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں علم و فضل اور شعر و ادب میں انہیں جو امتیاز حاصل ہوا وہ اسی تربیت کا فیض اور اپنی خالہ کی صحبت کا اثر تھا۔ اصفہانی نے ان کے متعلق اپنی کتاب آغانی میں جھوٹ کا جو طومار باندھا ہے اس کا اندازہ اسی ایک بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ اس کے قول کے مطابق عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا نے عبداللہ بن عبدالرحمان رضی اللہ عنہما کی وفات کے بعد مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہما سے دوسری شادی کی جو ان کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اس شادی کا قصہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ مصعب نے ایک عورت عزۃ المیلا کو عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا کہ وہ ان کے حالات معلوم کر کے آگاہ کرے۔ دوسری طرف وہ بہتان لگاتا ہے کہ عائشہ پردہ نہ کرتی تھیں اور سب کے سامنے آجاتی تھیں۔ اگر اس کا یہ الزام درست ہوتا تو ان کے خالہ زاد بھائی کو ہرگز یہ ضرورت نہ پیش آتی کہ شکل و صورت دیکھنے اور حالات معلوم کرنے کے لیے وہ کسی دوسری عورت کی خدمات حاصل کرتے۔ جھوٹ سچ کی اس مکروہ آمیزش سے یہ بات ثابت ہوتی

ہے کہ اس زمانے میں لڑکیاں اپنے خالہ زاد بھائیوں سے بھی سخت پردہ کرتی تھیں۔ وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ نے عائشہ کے پہلے شوہر عبداللہ کی وفات کے بعد انہیں نکاح کا پیغام دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوہ ہو جانے کے بعد مصعب اپنی خالہ زاد بہن کی شکل وصورت اور عادات و خصائل سے پوری طرح آگاہ نہ تھے اسی وجہ سے مصعب کو عزۃ المیلا کا احسان مند ہونا پڑا۔ خود اصفہانی کی اپنی روایات یہ ثابت کرتی ہیں کہ عائشہ نہایت نیک نفس، پاکباز اور صحیح معنوں میں مسلمان خاتون تھیں۔ وہ عفت و عصمت اور شرم و حیا کا پیکر تھیں۔ اور پردہ کی اس حد تک پابند تھیں کہ ان کے حقیقی خالہ زاد بھائی بیوگی کے بعد بھی ان کی شکل وصورت سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ جو نیک عورت اپنے اتنے قریبی رشتہ داروں سے بھی اتنی دور رہنے کی عادی تھیں۔ ان سے متعلق یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ عمر بن ربیعہ ایسا آوارہ شاعر جس سے شرفاء پناہ مانگتے تھے اتنی جرأت کر سکتا تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نواسی اور طلحہ رضی اللہ عنہما کی بیٹی سے متعلق توہین آمیز اشعار لکھے اور ان کے حسن و جمال کی تشہیر سوقیانہ انداز میں کرے۔ حیرت ہے کہ مصعب تو انہیں دیکھ نہ سکے مگر ایک شاعر نے انہیں اتنا قریب سے دیکھ لیا کہ وہ ان کے پیکر کو اشعار میں ڈھال کر کوچہ و بازار میں پڑھتا پھرے۔ کیا اس وقت طلحہ رضی اللہ عنہ ایسے بلند مرتبہ صحابی کے خاندان میں ایک بھی غیرت مند شخص باقی نہ رہا تھا اور ان سب کا تعلق اسلام سے اتنی جلدی منقطع ہو گیا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے دور جاہلیت اپنی تمام ہوس ناکیوں اور جہالت آمیزی کے ساتھ پھر سے زندہ ہو گیا اور وہ اپنے گھرانے کو بھی اس لعنت سے نہ بچا سکے۔

اس طرح اصفہانی نے یہ الزام بھی عائد کیا ہے کہ مصعب سے شادی کے بعد عائشہ ہمیشہ ناراض اور رنجیدہ رہتی تھیں اور اپنے خاوند کی توہین کرتی تھیں۔ دوسرے ہی سانس میں وہ مصعب سے ان کی دلچسپی اور شوہر نوازی کا ایک واقعہ بیان کرتے

ہوئے لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ کسی بڑی لڑائی میں حصہ لینے کی وجہ سے کافی دیر تک گھر سے دور رہے۔ جب لڑائی ختم ہوئی تو خاک آلود پیشانی لیے ہوئے ان سے ملنے آئے۔ عائشہ نے اپنے رومال سے ان کی پیشانی صاف کی۔ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوہے اور پسینے سے ملی ہوئی بُو تم تک پہنچے تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ میرے لیے یہ بُو مشک سے بہتر ہے۔ اس روایت سے عائشہ رضی اللہ عنہا کے ایک اور وصف کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں اپنے شوہر سے کتنی محبت تھی اور وہ ان سے کس پر خلوص محبت سے پیش آتی تھیں۔ حضرت عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ کہ میرے لیے یہ بو مشک سے بہتر ہے اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں کہ ان کے دل میں اپنے شوہر کی اتنی عزت تھی اور وہ کتنی خدمت گزار تھیں۔ اغانی کی روایت کے مطابق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تیسرا نکاح عمر بن عبیداللہ سے کیا اور اسے بھی بدسلوکی کی شکایت رہتی تھی۔ واقعات وشواہد سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اغانی کے یہ تمام افسانے سراسر جھوٹ اور کذب بیانی پر مشتمل ہیں۔ اس کے اپنے بیانات اور قصے اس دور کی یادگار ہیں جب عیش پرست حکمران اور عشرت نواز امرائے دربار کے خوشامدی شعراء، گویے اور رقصہ گو ہر وقت اس کوشش میں مصروف رہتے تھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے آقاؤں کی عیش پرستی اور لہو ولعب کے لیے کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر کے انہیں خوش کر سکیں۔ شاہی دستر خوان کے ان گداگروں نے ان کے عیش وطرب کی محفلوں اور مجالس رقص وسرور کو جائز ثابت کرنے کے لیے زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے۔ اور ان اندھوں کو اندھیرے میں ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات سوجھتی تھی۔ حضرت سکینہ بنت حسین رضی اللہ عنہا اور عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا بھی ان کی ناپاک کوششوں سے نہ بچ سکیں۔ انہوں نے اپنی دروغ بافیوں اور کذب وافترا کی مدد سے کنیزانِ حرم، بے باک شاہزادیوں اور رؤساء کی داشتاؤں

نے لیے ان معزز و محترم اور عالی نسب اور بلند سیرت خواتین کی زندگیوں کو مسخ کر کے پیش کیا تاکہ امراء و روساء کے شبستان عیش میں داد عشرت دینے والی عورتوں کے ضمیر یہ جھوٹے افسانے سنا کر ملا دیے جائیں اور انہیں یقین آ جائے کہ جب سیدنا حضرت امام حسین علیہ السلام کی محبوب ترین بیٹی اور طلحہ رضی اللہ عنہ ایسے جلیل القدر صحابی کی لخت جگر ان سب باتوں کو جائز اور مباح سمجھتی تھیں بلکہ خود ان کاموں کی سرپرستی کرتی تھیں تو ان کے لیے کیا قباحت ہو سکتی ہے؟

جہاں تک عائشہ بنت طلحہ رضی اللہ عنہا کی علمی فضیلت اور ادبی کمالات کا تعلق ہے اسے اغانی میں بھی تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے متعلق یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے وقت کی بہت بڑی عالمہ اور ذہین خاتون تھیں۔ اپنے دور کے بڑے بڑے سیاست دانوں اور علماء فضلا سے وہ انتہائی عالمانہ گفتگو کرتی تھیں اور وہ سب ان کے فہم و تدبر سے بے حد متاثر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار ہشام نے انہیں اپنے دربار میں مدعو کیا۔ جب وہ آئیں تو ہشام نے ان کی علمی فضیلت اور ادبی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے اعزاز میں وقت کے تمام بڑے بڑے علماء و فضلا اور مشہور و معروف امراء کو دربار میں جمع کیا۔ سب سے پہلے عرب سے متعلق معلومات اور شعر و ادب کا تذکرہ ہوا تو عائشہ کا پلہ ان سے بھاری تھا۔ نجوم پر گفتگو ہوئی تو ان کا علم کم نہ تھا، اسی طرح دوسرے تمام علوم عصریہ پر عائشہ نے اپنی فضیلت، علمی برتری اور قادر الکلامی کا لوہا منوا لیا۔ سب نے متفقہ طور پر تسلیم کیا۔ عائشہ کا علمی اور ادبی مرتبہ بہت بلند ہے۔ خلیفۂ وقت ہشام ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ ایک لاکھ درہم بطور نذرانہ پیش کیے اور شاہانہ اعزاز و آداب کے ساتھ انہیں مدینہ رخصت کیا۔

فاطمہ بنت عبدالملک رضی اللہ عنہا

وہ فرض شناس اور نیک دل شاہزادی جس نے شاہی محلات میں انتہائی ناز ونعم کے ساتھ پرورش پائی۔ مگر اپنے درویش صفت خاوند کے ساتھ فقر و فاقہ کی صبر آزما زندگی بسر کی۔

خاندان بنوامیہ کے مشہور خلیفہ عبدالملک کی بیٹی تھیں۔ شاہی محلات میں انتہائی ناز ونعم کے ساتھ پرورش پائی۔ دنیا کے عظیم ترین مملکت کے فرماں روا کی لخت جگر اور چہیتی بیٹی ہونے کی وجہ سے دنیا کی ہر نعمت میسر تھی۔ گھر میں زر و سیم کی گنگا بہہ رہی تھی۔ کنیزوں، لونڈیوں، غلاموں اور خدام کی ایک فوج ہر وقت خدمت کے لیے موجود رہتی۔ آپ نے غم وفکر اور رنج ومحن کے کوسوں دور عیش وفراغت کے شاہانہ ماحول میں پرورش پائی۔ اور ایک عظیم الشان سلطنت کی شاہزادی کی حیثیت سے عنفوان شباب کی وادی میں قدم رکھا۔ باپ نے شادی کے لیے اپنے خاندان میں سے بہترین شخص کو منتخب کیا اور انتہائی دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے حضرت عمر بن عبدالعزیز سے نکاح کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے نام سے کون واقف نہیں آپ ایک دیندار، خداترس، عبادت گزار اور انصاف پرور مثالی حکمران کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ آپ

نے خلیفہ مقرر ہوتے ہی خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی اور تاریخ اسلام میں لازوال مقام حاصل کیا۔ فاطمہ بنت عبدالملک اسی درویش منش اور صاحب فقر خلیفہ کی بیوی تھیں۔ ۸۶ھ میں عبدالملک نے انہیں حجاز کا گورنر مقرر کر کے مدینہ بھیج دیا تو فاطمہ بھی ساتھ آئیں۔ اس وقت عمر بن عبدالعزیز بڑے ٹھاٹھ کی امیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے خود اپنی ابتدائی زندگی کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ "پھر مجھے لباس، خوشبو اور عیش و عشرت کا شوق ہوا تو میری دانست میں نہ میرے خاندان میں اور نہ دوسرے خاندان میں کوئی شخص ایسی امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا جس طرح میں۔" کہا جاتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز امویوں میں سب سے زیادہ عیش پسند تھے۔ ان کی مغرورانہ چال کا نام ہی "عمر چال" مشہور تھا۔ محل کی لونڈیاں اور کنیزیں ان کی چال کی نقل کرتی تھیں۔ مگر فاطمہ نے ان کی زندگی میں داخل ہوتے ہی آہستہ آہستہ عیش و عشرت کے تمام ہنگاموں سے انہیں متنفر کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز جتنی دیر مدینہ میں بحیثیت گورنر مقیم رہے۔ فاطمہ ان کی ممد و معاون بن کر رہیں اور اہل بیت کی محترم خواتین سے انہوں نے نہایت اچھے تعلقات استوار کرنے میں اپنے شوہر کی بہت مدد کی۔ ایک دفعہ حضرت فاطمہ بنت علی رضی اللہ عنہما ان سے ملنے تشریف لائیں تو عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ بھی آ گئے۔ تمام پہرہ دار اور غلاموں کو باہر نکلوا دیا گیا تاکہ حضرت فاطمہ بنت علی رضی اللہ عنہما پوری بے تکلفی اور اطمینان سے بات چیت کر سکیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ بنت علی رضی اللہ عنہما سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اے دختر علی رضی اللہ عنہ! روئے زمین پر مجھے کوئی خاندان تم سے زیادہ عزیز نہیں۔ تم خود میرے خاندان سے زیادہ مجھے عزیز ہو۔ اس کے بعد دونوں میاں بیوی نے حضرت فاطمہ بنت علی رضی اللہ عنہما کو انتہائی عزت و تکریم کے ساتھ رخصت کیا۔

سلیمان نے وفات سے پہلے ہی حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا چنانچہ ان کے مرتے ہی آپ نے جب عنان خلافت سنبھالی اور بیعت وغیرہ

کے فرائض سے فارغ ہوکر سیدھے اپنی بیوی کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ سلیمان نے مجھے خلیفہ بنا دیا ہے۔اس لیے اب تو ایک خلیفہ کی بیوی ہے۔ اُس خلیفہ کی بیوی، جس کی کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی۔اس لیے تمہارے پاس جتنے زیورات سونا، چاندی اور جواہرات ہیں سب بیت المال میں داخل کرو کیونکہ یہ سب مسلمانوں کا مال ہے۔ ہمارا ساتھی وہ ہے جو اچھے کاموں میں ہماری مدد کرے اور برے کاموں سے ہمیں روکے۔ ہماری راہنمائی کرے۔ ہمارے سامنے کسی کی چغلی نہ کھائے اور جس بات میں امداد نہ کرسکتا ہو اس میں مداخلت نہ کرے۔

کیسی عجیب وغریب بات ہے کہ ایک شخص اتنی بڑی مملکت اور رفیع الشان سلطنت کا فرمانروا مقرر ہوتا ہے تو سب سے پہلے اپنی بیوی کو حکم دیتا ہے کہ اپنا تمام قیمتی سامان اور زیورات سرکاری خزانہ میں جمع کراؤ کیونکہ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔ایک عورت وہ بھی لاڈلی شہزادی کے لیے کتنی بڑی آزمائش ہے کیونکہ مشہور ہے کہ عورت کو سونے، چاندی، ہیرے جواہرات اور زیورات سے بہت محبت ہوتی ہے چاہیے تو یہ تھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خلیفہ مقرر ہوتے ہی فاطمہ کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہوتا۔ خود خلیفہ انہیں بیش قیمت تحائف دیتے، روساء، امراء اور مصاحبین نذرانے پیش کرتے۔خود فاطمہ بھی حسب دستور کسی انتہائی گراں قیمت چیز کے لیے فرمائش کرسکتی تھیں۔ ہم روزانہ اپنے اردگرد اس قسم کے کئی مناظر دیکھتے رہے ہیں کہ کسی کے خاوند کو معمولی ترقی یا قدرے عہدہ بڑھ گیا تو بیوی نے یہ خوش خبری سنتے ہی زیورات وغیرہ کے لیے فرمائش پیش کردی۔انہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ خاوند ناجائز ذرائع یعنی رشوت، غبن اور دوسروں کی حق تلفی سے ان کی فرمائش پوری کرتا ہے۔ یا اپنی تنخواہ سے اس مطالبے کی تکمیل کا انتظام کرتا ہے۔انہیں تو قیمتی زیورات اور ملبوسات سے سروکار ہوتا ہے۔ایسی خواتین عموماً یہ دلیل دیا کرتی ہیں کہ

اب آپ ماشاءاللہ افسر بن گئے ہیں۔ میرے پاس تو کوئی ڈھب کا زیور بھی نہیں۔ لوگ باگ دیکھ کر کیا کہیں گے کہ یہ افسر کی بیوی ہے۔ چاہیئے تھا کہ فاطمہ بھی اپنے خاوند سے یہی توقع رکھتیں۔ کیونکہ ان کا خاوند تو مشرق ومغرب کی ایک بہت بڑی سلطنت کا شہنشاہ بن گیا تھا۔ فاطمہ سے فرمائش کا تو ذکر ہی کیا، الٹا انہیں اپنے تمام زیورات وغیرہ بیت المال میں داخل کرنے کا حکم مل گیا۔ حالانکہ انہیں اپنے خاوند کی طبیعت میں بہت دخل تھا اور وہ بڑی آسانی کے ساتھ کہہ سکتی تھیں کہ یہ سب چیزیں میری ملکیت ہیں، میں انہیں سرکاری خزانے میں کیوں جمع کراؤں مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اللہ کی اس نیک بندی نے اسی وقت بلا حیل وحجت اپنی ایک ایک چیز بیت المال کے سپرد کر دی اور اف تک نہ کی۔ اسی پر بس نہیں۔ پھر حرم کی تمام کنیزوں اور ملازمین کو طلب کر کے فرمایا کہ اب میں تم لوگوں کا خرچ برداشت نہ کرسکوں گا اس لیے میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ شوق سے الگ ہو جاؤ۔ فاطمہ خود عبدالملک ایسے صاحب جاہ وجلال خلیفہ کی چہیتی بیٹی تھی۔ اور اس نے کبھی عسرت اور تنگ دستی کا نام تک نہ سنا تھا۔ خاوند نے حکومت سنبھالتے ہی پہلے انہیں مال و دولت سے محروم کیا پھر خدمت گاروں کو بھی سبکدوش کر دیا اور گھر کے کام کاج کا تمام بوجھ فاطمہ کے سر پر آ پڑا۔ کہتے ہیں فاطمہ کے پاس صرف ایک قیمتی جواہر باقی رہ گیا تھا جو ان کے باپ عبدالملک نے بطور یادگار دیا تھا اور فاطمہ اسے بہت عزیز رکھتی تھیں۔ کیونکہ وہ جواہر ان کے مرحوم باپ کی نشانی تھی۔ ایک روز حضرت عمر بن عبدالعزیز کو معلوم ہوا تو فاطمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تمہیں دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے یا تو اس جواہر کو واپس کر دو اور بیت المال میں جمع کرا دو یا مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ۔“

اپنے درویش منش خاوند کا یہ حکم سن کر فاطمہ نے بلا تامل جواب دیا۔ ”میں آپ کو اس جواہر پر کیسے قربان کرسکتی ہوں یہ تو کوئی چیز نہیں۔ میں اس سے

بھی کئی گنا بیش قیمت جواہر پر آپ کو ترجیح دیتی ہوں۔''
چنانچہ انہوں نے فوراً اپنے باپ کی وہ آخری نشانی بھی خزانے میں جمع کرا دی۔
حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات کے بعد یزید خلیفہ ہوا تو اس نے وہ جواہر فاطمہ کو واپس دینا چاہا مگر انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ جس چیز کو میرے شوہر نے پسند نہیں کیا وہ ان کے بعد کیسے پسند کر سکتی ہوں مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خلیفہ مقرر ہونے کے بعد فاطمہ نے انتہائی تنگدستی اور فقر و فاقہ سے زندگی بسر کی۔ اور اکثر وہ اپنی اولاد کی روزمرہ کی ضروریات بھی پورا نہ سکتی تھیں۔ ان کی اس فقیرانہ زندگی کا اندازہ کرنے کے لیے چند ایک واقعات اختصار سے پیش کرنا کافی ہیں۔ ایک دفعہ حضرت عمر بن العزیز رضی اللہ عنہ نے لبنان کے شہد کا شوق ظاہر کیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے لبنان کے گورنر ابن معدی کرب کو کہلا بھیجا۔ اس نے فوراً حکم کی تعمیل میں بہت سا شہد بھیج دیا۔ جب یہ شہد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے سامنے رکھا گیا تو فاطمہ سے پوچھا کہ کیا تم نے یہ شہد ابن معدی کرب کے ذریعے منگوایا ہے؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا تو فوراً یہ شہد بازار میں فروخت کر کے قیمت بیت المال میں جمع کرا دی۔ دوسری مرتبہ پھر فاطمہ نے اپنے خاوند کی رغبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ڈاک کی ایک سواری پر آدمی بھیج کر دو دینار کا شہد منگوا لیا کیونکہ عمر بن عبدالعزیز شہد بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ جب خلیفہ کو معلوم ہوا اسی وقت وہ شہد بھی فروخت کر دیا۔ اور دو دینار بیوی کو واپس کر کے باقی رقم خزانے میں جمع کرا دی۔ ایک بار سرکاری سیب تقسیم کر رہے تھے کہ آپ کا ایک چھوٹا سا بچہ آیا اور ایک سیب اٹھا کر کھانے لگا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سختی سے وہ سیب چھین لیا اور بچہ روتا ہوا ماں کے پاس واپس چلا گیا۔ انہوں نے اسی وقت بازار سے سیب منگوا کر بچے کو دے دیا۔ گھر آئے تو سیب کی خوشبو سونگھ کر پوچھا کہ گھر میں سرکاری سیب تو نہیں آئے؟ فاطمہ نے تمام واقعہ

سنا دیا تو فرمایا کہ میں نے سیب اپنے بچے سے چھینا تو گویا اپنے دل سے چھینا لیکن مجھے یہ پسند نہ آیا کہ مسلمانوں کے ایک سیب کے لیے اپنے آپ کو برباد کروں۔

ایک دفعہ آپ کی بیٹی نے فاطمہ سے پوچھے بغیر ایک موتی باپ کی خدمت میں بھیجا اور عرض کی کہ کان میں ڈالنے کے لیے اس کا جوڑا بھیج دیجیے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس موتی کے ساتھ آگ کی دو چنگاریاں رکھ کر بھیج دیں۔ اور کہلا بھیجا کہ اگر تم ان چنگاریوں کو کان میں ڈال سکو تو میں اس موتی کا جوڑا بھیج سکوں گا فاطمہ نے سنا تو بیٹی پر بہت ناراض ہوئیں اور بیٹیوں کو سمجھایا کہ اپنے جلیل القدر باپ کو تنگ نہ کیا کرو اور ان کی ذمہ داریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو کیونکہ ان کا ساتھی وہی ہے جو نیک کاموں میں ان کی مدد کر سکے۔

آپ کا معمول تھا کہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر لڑکیوں کی خیریت دریافت کرنے جایا کرتے تھے۔ ایک رات گئے لڑکیوں نے آپ کی آہٹ سن کر ہاتھ سے اپنے منہ بند کر لیے اور دروازے پر آ گئیں۔ آپ نے ان سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس رات کے کھانے میں مسور کی دال اور پیاز کے سوا کچھ نہ تھا اس لیے انہیں یہ پسند نہیں کہ پیاز کی ناگوار بو ان کے والد تک پہنچے۔ اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رو پڑے اور کہا اے میری لڑکیوں! تم کو اس سے کیا فائدہ ہوگا کہ تم طرح طرح کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ دوزخ کی آگ میں جھونک دیا جائے یہ سن کر تمام لڑکیاں چیخ چیخ کر رونے لگیں۔ فاطمہ جس گھر کی ملکہ تھیں اس کا ایک اور منظر دیکھیے۔

ایک روز حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی چہیتی بیٹی امینہ کو نہایت پیار سے پاس بلایا۔ لیکن وہ نہ آئی۔ آپ سخت حیران ہوئے۔ ایک آدمی کو بھیج کر پھر بلایا اور پہلے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو امینہ نے کہا کہ امیر المومنین سے کہیے کہ میرے پاس کپڑا نہیں ہے اس لیے میں حاضر خدمت ہونے سے قاصر ہوں۔ خادم کو بلا کر حکم دیا کہ فرش پھاڑ کر امینہ کے لیے ایک قمیض تیار کروا دو۔ اتفاق سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی بہن ام البنین

بہت دولت مند تھیں۔ جب انہیں اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ایک تھان کپڑا بھیج دیا اور کہا کہ عمر سے کچھ نہ مانگو۔

آپ شاید یہ سن کر حیران ہوں کہ خلیفہ اسلام امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز کے گھر کا کل خرچ دو درہم روزانہ تھا اور فاطمہ اس حقیر رقم میں گھر کا گذارہ چلاتی تھیں۔ کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کبھی بیت المال پر اپنا بوجھ نہیں ڈالا۔ یہی وجہ تھی کہ فاطمہ اپنے بچوں کے ساتھ انتہائی غریبی اور مفلسی کی زندگی بسر کرتی تھی۔ ایک دفعہ عبداللہ بن ذکریا ان کے ہاں گئے۔ فاطمہ اور ان کے بچوں کی تنگدستی دیکھ کر ان کا دل بھر آیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ امیر المومنین آپ اپنے احکام اور ملازمین کو سوسو دینار بلکہ اس سے بھی زیادہ تنخواہیں دیتے ہیں۔ جواب دیا کہ اگر وہ قرآن و حدیث کے مطابق عمل کریں تو یہ بہت کم ہے۔ ان کو معاش کے جھگڑوں سے بالکل نجات دلانا چاہتا ہوں۔ عبداللہ نے کہا کہ جب یہ جائز ہے اور آپ خود ان سب سے زیادہ کام کرتے ہیں تو آپ بھی مشاہرہ لیجئے اور اپنے اہل وعیال کی تنگ دستی دور کیجئے کہ وہ محتاجوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں مگر آپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز فاطمہ کے پاس بیٹھے ان کی مفلسی سے متعلق باتیں کر رہے تھے تو دوران گفتگو فرمایا۔ فاطمہ! وہ زمانہ کتنا خوشگوار اور پرسکون تھا جب میں خلیفہ نہ تھا۔ فاطمہ نے جواب دیا یا امیر المومنین آپ اس زمانے سے زیادہ صاحب اختیار اور اہل مقدرت ہیں۔ غمگین ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا۔ فاطمہ! اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ فاطمہ یہ پُر درد فقرہ سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا اے پروردگار! انہیں دوزخ کے عذاب سے بچانا۔

فاطمہ کو اپنے عظیم المرتبت شوہر کی مجبوریوں اور ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا وہ دیکھ رہی تھیں کہ حکومت کے ادنیٰ ملازمین اور معمولی کارندے تک عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر خلیفہ اسلام جن سے دنیا سہمی رہتی ہے۔ اپنے لیے ایک درہم

کے انگور نہیں خرید سکتے۔ اور ان کی ناز و نعم سے پلی ہوئی بیٹی اور بچے دنیا کی ہر نعمت کے لیے ترستے رہتے ہیں۔ ان کے اپنے گھر میں فاقہ ہوتا تھا۔ مگر دوسروں کی حاجت روائی اور اعانت میں صبح و شام مصروف رہتے تھے۔ ایک دفعہ عراق سے ایک نادار عورت آئی جس کے ساتھ پانچ لڑکیاں بھی تھیں۔ اس نے خلیفہ اسلام کا ویران اور شکستہ حال گھر دیکھ کر کہا کہ میں اس ویران گھر سے اپنا گھر آباد کرنے آئی ہوں۔ فاطمہ نے ہنس کر کہا کہ تم لوگوں کے گھروں کی آبادی ہی نے اس گھر کو ویران بنا رکھا ہے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میرے شوہر کو ہر لحظہ ملت اسلامیہ کے ہر فرد کی فکر دامن گیر رہتی ہے وہ اپنے گھر کی طرف کیسے توجہ دے سکتے ہیں۔

تھوڑے عرصہ بعد ہی دشمنوں نے سازش کر کے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو زہر دے دیا اور آپ اس کے اثر سے سخت بیمار ہو گئے تو فاطمہ ہر وقت ان کی چارپائی سے لگی بیٹھی تھیں۔ صبح و شام ان کی تیمارداری کرتی تھیں اور رو رو کر بارگاہ رب العزت میں اپنے شوہر کی صحت مندی کی دعائیں مانگتی تھیں۔ ایک روز فاطمہ نے ان سے کہا کہ یا امیر المومنین! آپ میری موجودگی کی وجہ سے سوتے نہیں ہیں۔ میں باہر چلی جاتی ہوں۔ شاید آپ کو نیند آ جائے۔ یہ کہہ کر آپ دروازے کے باہر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ حرکت وغیرہ نہیں ہوتی۔ اندر آ کر دیکھا تو دنیائے اسلام کی یہ نامور شخصیت اپنے اللہ کے حضور میں پہنچ چکی تھی۔

وفات کے وقت آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے بیوی بچوں کے لیے نہ کوئی جائداد چھوڑی اور نہ کوئی اندوختہ۔ فاطمہ ان کے بعد کافی عرصہ تک زندہ رہیں۔ جب بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ذکر ہوتا۔ ان کی آنکھیں وفور غم سے اشکبار ہو جاتیں۔

اس وقت ہے کوئی ایسی صابر و شاکر عورت جو فاطمہ بنت عبدالملک کا ہی مقابلہ کر سکے۔ فاطمہ کوئی معمولی عورت نہ تھیں۔ ان کا ماضی بے حد تابناک اور مسرت آفرین تھا۔ وہ سلطنت اسلامیہ کی شہزادی تھیں۔ اور عیش و آرام سے زندگی بسر کرنے

کی عادی تھیں۔ فاقہ کشی اور محتاجی تو بہت دور کی چیزیں ہیں۔ انہیں کبھی یہ محسوس نہ ہوا تھا کہ وہ کب کسی خواہش کا اظہار کرتی ہیں۔ اور کب اسے پورا کیا جاتا ہے۔ کہاں وہ عیش و آرام اور شان و شوکت کی زندگی اور کہاں یہ مفلسی۔ وہ گردش روزگار کا شکار نہ ہوئی تھیں۔ اور نہ ان کے اقتدار و اختیار میں کوئی کمی ہوئی تھی۔ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ اس فقر و فاقہ کی حالت میں رہنے پر مجبور نہ تھیں۔ خاوند قلمروئے اسلامیہ کا تاجدار تھا۔ تمام رشتہ دار بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ شاہی خاندان سے تھیں اور ایک صاحب شان و سطوت خلیفہ کی بیٹی تھیں۔ انہیں کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر انہوں نے کسی چیز کی پروا نہ کی اور آخر دم تک پورے صبر و استقلال کے ساتھ اپنے نیک دل اور خدا پرست خاوند کے ساتھ مصیبت و حسرت کی زندگی بسر کی۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر بے تاب ہو جاتی تھیں۔ ان کی خدمت اور دل نوازی میں کوئی کمی نہ ہونے دیتی تھیں۔ اپنی اولاد کو کسمپرسی اور حسرت کے عالم میں دیکھتی تھیں مگر مہر بلب رہتی تھیں۔ ان حالات میں بھی انہوں نے اپنے درویش شوہر کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔

ہماری ان بہنوں کے لیے مقام عبرت ہے جو چند لقموں کی کمی برداشت کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ کسی مجبوری اور مصیبت کے باعث ان کی ضروریات میں ذرا سا فرق آجائے تو گھر میں ہنگامہ برپا کر دیتی ہیں اور شوہر کے لیے جینا حرام کر دیتی ہیں۔ بلکہ کئی تو برے دنوں کے آثار دیکھتے ہی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر کر چل دیتی ہیں یا پھر طلاق کے مطالبات شروع ہو جاتے ہیں۔

شہزادی فاطمہ۔ نہیں سلطنت اسلامیہ کی ملکہ فاطمہ بنت عبدالملک کی زندگی ہماری خودغرض اور عیش و عشرت کی دلدادہ بہنوں کے لیے ایک معنی خیز درس ہے۔

زبیدہ خاتون

ہارون الرشید کی عظمت وشوکت کا راز جس کے ذوقِ قرآن خوانی کی بدولت شاہی محلات کے در و دیوار ہر وقت قرآن مجید کی قرأت سے گونجتے رہتے تھے، جن کی لونڈیاں اور کنیزیں تک قرآن مجید کی حافظہ تھیں۔

آپ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد سے تھیں۔ اصل نام امۃ العزیز تھا اور امّ جعفر کنیت تھی۔ ان کے دادا خلیفہ منصور کو ان سے بہت زیادہ محبت تھی وہ جب تک اپنی پوتی کو دیکھ نہ لیتے چین نہ آتا تھا۔ خلیفہ منصور نے بچپن میں ان کا نام زبیدہ رکھا تھا جو آج تک تاریخ کے اوراق پر جلی حروف میں کندہ ہے۔ ان کے ہوش سنبھالتے ہی دستور شاہی کے مطابق قرآن کریم اور احادیث کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے قابل اور لائق اساتذہ مقرر ہوئے۔ اسی عمر سے قرآن مجید سے دلی اور روحانی تعلق پیدا ہوا جو تادم آخر قائم رہا۔ قرآن مجید اور احادیث کی تعلیم سے فارغ ہو کر انہوں نے عربی ادب اور دیگر علوم عصریہ پر عبور حاصل کیا۔ نہایت ذہین، سلیم الطبع اور روشن دماغ تھیں۔ تعلیم و تربیت کے ان تمام مراحل کو بڑی تیزی سے طے کر کے گلستان علم و حکمت میں شگفتہ پھول بن کر مہکنے لگیں۔ اسلام کی شیدائی تھیں۔ اور زہر

وقت اللہ اور رسول ﷺ کی محبت میں سرشار رہتی تھیں۔ عنفوان شباب کے عالم میں بھی مذہبی امور سے حیرت انگیز حد تک دلچسپی تھی۔ بڑی پابندی اور اہتمام کے ساتھ پانچوں وقت نماز ادا کرتی تھیں اور باقاعدگی سے روزے رکھتی تھیں۔ آپ کی شادی دور عباسیہ کے مشہور خلیفہ ہارون الرشید سے ہوئی۔ یہ وہی ہارون الرشید تھے جن کے دور حکومت کو مؤرخین سنہری زمانہ قرار دیتے ہیں۔ زبیدہ سے شادی کے ایک سال بعد ہارون الرشید کو ولی عہد نامزد کر دیا گیا۔ میاں بیوی میں بے حد محبت تھی۔ سفر و حضر میں اپنے خاوند کے ساتھ رہتی تھیں۔ جہاں ہارون الرشید سریر آرائے سلطنت ہوئے تو زبیدہ ان کی دست راست ثابت ہوئیں۔ خلیفہ امور سلطنت میں ان سے مدد لیتے اور پیچیدہ سے پیچیدہ سیاسی مسائل اور پریشان کن معاملات ان کی اصابت رائے کے سامنے بے حقیقت تھے۔ انہوں نے اپنی خدا داد ذہانت اور قابلیت سے سلطنت عباسیہ کی عظمت و شوکت کو چار چاند لگا دیئے۔ یہ ان کی بیدار مغزی اور عقل و فراست تھی کہ تاریخ اسلام کے شخصی دور حکومت میں ہارون الرشید کا زمانہ سنہری زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ زبیدہ حرم شاہی میں رہتے ہوئے بھی سلطنت کے تمام چھوٹے بڑے امور سے ہر لحظہ آگاہ رہتی تھیں اور اس وقت ان کا آفتاب مقدر نصف النہار پر تھا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے کبھی اسلامی شعائر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ان کی عبادت گزاری اور احکام شریعت کی پابندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ روزانہ اسی خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں پانچوں وقت حاضر ہو کر توبہ و استغفار کرتی تھی وہ اپنے وقت کی سب سے زیادہ فیاض، دریا دل اور سخی خاتون تھیں۔ ان کی نیکی، پاکدامنی اور عفت و عصمت خاندان عباسیہ میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ قرآن مجید سے گویا انہیں والہانہ عشق تھا۔ تلاوت قرآن ہی میں ہمیشہ سکون قلب پاتی تھیں حرم شاہی کی فضا ہر وقت قرآن خوانی سے معمور رہتی تھی۔ ان کی صرف یہی خواہش ہوتی تھی کہ

وہ جہاں بھی ہوں قرآن مجید کی پاک قرأت کے سوا اور کوئی آواز ان کے کانوں میں نہ پہنچے۔ اسی محبت اور ذوق کی بدولت انہوں نے سینکڑوں عورتوں کو قرآن حفظ کرایا۔ خود ان کی اپنی کنیزوں میں ایک سو کے قریب قرآن شریف کی حافظہ تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کا فرض تھا کہ روزانہ تین سپارے پڑھ کر سنائیں گویا قصر شاہی میں روزانہ دس مرتبہ قرآن شریف ختم کیا جاتا تھا۔ ان حافظہ کنیزوں سے اس کے سوا اور کوئی کام نہ لیا جاتا تھا اور زبیدہ ان سب کو بے حد عزیز رکھتی تھیں۔ کیوں نہ ہوتا، ان کے سینوں میں وہ لازوال دولت پوشیدہ تھی جو زبیدہ کو ملک و سلطنت سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ کہاں جاتا ہے کہ ہارون الرشید کے دور حکومت میں زبیدہ کا محل ہر وقت روح پرور قرأت سے گونجتا رہتا تھا اور وہاں سے گزرنے والا ہر شخص ایک لمحہ کے لیے محسوس کرتا تھا کہ وہ قدسی نفوس سے فیضیاب ہونے والوں کی بستی میں آ گیا ہے۔ زبیدہ وہ مبارک ہستی تھی جن کی بدولت سینکڑوں عورتوں کو حافظہ قرآن بننے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

دور عباسیہ کے جاہ و جلال اور شوکت و حشمت کا یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف عیش و عشرت کی فراوانی تھی۔ امرائے دربار اور روسائے سلطنت کا ذکر کیا۔ عام لوگوں کے گھروں میں بھی عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ رہتی تھیں۔ خوش حالی اور فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ لوگ عیش و طرب کے ہنگاموں میں گم رہنے کے عادی ہو چکے تھے۔ شاہی محلات میں رقص و سرود اور عیش و نشاط کے چشمے بہہ رہے تھے گویا اس وقت ایسا ماحول تھا کہ دارالسلطنت کے کوچہ و بازار میں موسیقی اور گانے کے ہنگامے گرم رہتے تھے۔ ہر طرف نغمات کی بارش ہو رہی تھی ایسے حالات میں دوسرے کئی اللہ کے نیک بندوں کی طرح زبیدہ محل بھی ان تمام بداعتدالیوں اور لہو و لعب کے ہنگاموں سے یکسر پاک تھا۔ انہوں نے اتنی بڑی سلطنت کی ملکہ ہونے کے باوجود وقت کے چلن کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے محل کی چار دیواری کے اندر کبھی کسی خلاف شرع فعل

کے ارتکاب کی اجازت نہ دی۔ اس روشن ضمیر ملکہ کا محل ذکر الٰہی کے روح پرور ترانوں سے گونجتا رہا اور وہاں کلام الٰہی کی آواز کے سوا کسی دوسری آواز کو بلند ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ہارون الرشید نے وفات سے قبل زبیدہ کے بیٹے امین اور دوسری بیوی کے بیٹے مامون الرشید کو خلیفہ مقرر کیا۔ امین نے مسند شاہی پر قدم رکھتے ہی اپنے سوتیلے بھائی مامون الرشید کو معزول کر دیا لیکن زبیدہ نے اس ناانصافی اور ظلم کی شدید مخالفت کی مگر امین نے ان کی ایک نہ سنی۔ مامون الرشید نے اپنی حق تلفی کا بدلہ لینے کے لیے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی اور امین کو قتل کر دیا۔ مامون الرشید کی شادی کے بعد زبیدہ فریضۂ حج ادا کرنے کی غرض سے حجاز تشریف لے گئیں۔ کعبۃ اللہ میں لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ حج کے ایام میں یہاں پانی نہ ملنے کی وجہ سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زبیدہ نے اسی وقت بغداد سے ماہر اور لائق انجینیروں کو وہاں بلایا اور ایک نہر کا نقشہ تیار کرنے کا حکم دیا جو دریائے دجلہ سے مکہ اور وہاں سے مدینہ تک جائے۔ انجینیروں نے بڑی مشکل سے تمام علاقے کا مفصل جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہاں نہر کھودنا بہت مشکل کام تھا کیونکہ چاروں طرف ریگستان پھیلا ہوا تھا اور راستے میں خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑ کھڑے تھے۔ اگر نہر کھودی بھی جاتی تو آندھیوں اور طوفانوں کے ساتھ اڑنے والے ریت کے تودے اسے پھر پُر کر دیتے۔ چنانچہ انجینیروں نے یہ صورت حال زبیدہ کے سامنے پیش کی اور اس کام کو ناممکن قرار دیا۔ مگر زبیدہ نے ان کی ایک نہ سنی اور نہر تیار کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ کس کی مجال تھی کہ تعمیل نہ کرتا فوراً نقشہ تیار کیا گیا۔ ریت کے تودے الٹ کر اور پتھریلے پہاڑ کاٹ کاٹ کر دس میل لمبی نہر تیار ہوئی جس پر زبیدہ نے پانی کی طرح دولت صرف کر دی۔ یہی وہ نہر ہے جو نہر زبیدہ کے نام سے آج تک مشہور ہے اور اب بھی حجاز میں موجود ہے۔ نہر زبیدہ جس کاریگری اور ہنر مندی سے تیار ہوئی اس کا اندازہ اسی بات سے ہو

سکتا ہے کہ اسے دینا کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ زبیدہ نے اپنے قیام کے دوران مکہ سے مدینہ منورہ تک بے شمار کارواں سرائیں بنوائیں اور واپسی کے چھ برس بعد انتقال کیا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ شہر اسکندریہ ویران پڑا تھا۔ اور بالکل اجڑ چکا تھا۔ زبیدہ نے اسے از سر نو تعمیر کرایا اور آباد کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی مسجدیں اور سرائیں بنوائیں۔

زبیدہ اگر یہ نہر نہ بنواتیں تو ان کا نام قرآن مجید کی لازوال عظمت و رفعت کے سائے میں ہمیشہ زندہ رہتا اور ہر وہ مسلمان جو کتاب الٰہی کو عزیز رکھتا ہے۔ زبیدہ کو کبھی فراموش نہ کرتا۔ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کو سوچنا چاہیئے کہ تاریخ کے اس سنہری دور میں بھی علوم وفنون کا آج سے کہیں زیادہ چرچا تھا۔ بڑے بڑے علماء اور فضلاء اس وقت دارالسلطنت میں جمع تھے اور ہارون الرشید کے دربار میں علم و حکمت کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ دنیا بھر کے علوم وفنون کا مرکز بغداد تھا۔ صاحب علم ہستیوں اور کمال فن رکھنے والوں کی سرکاری طور پر سرپرستی ہوتی تھی۔ فلسفہ ریاضی، ہیئت، ادب، شاعری، مصوری، سیاست، لسانیات اور فلکیات کے علاوہ بے شمار دوسرے علوم کا سرچشمہ وہی شہر تھا۔ مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے سلطنت کی ملکہ بلکہ حکمران خاتون نے جو خود بھی علم وفضل کا پیکر تھی قرآن مجید کو سب پر ترجیح دی اور اس کی حاصلِ زیست بنایا۔ آج یہ حالت ہے کہ دنیا کے تمام علوم وفنون پر عبور حاصل کرنے کے جنون سروں پر سوار ہے۔ صرف قرآن کریم کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اس کی تعلیم بھی حاصل کی جائے کتنا بڑا فرق ہے ذہنی غلامی اور آزادی میں۔ یہ درحقیقت پستی اور بلندی کا فرق ہے۔ ایک عورت کنیزوں تک کو قرآن حفظ کرا دیتی ہے اور آج اکثر خواتین کو کلمہ بھی ٹھیک سے پڑھنا نہیں آتا۔

شہزادی عباسہ

تدبر و ذہانت کا ایک نادر نمونہ تھیں اور عورتوں کو ناقص العقل ہونے کا جو طعنہ دیا جاتا ہے۔ اس کا مجسم جواب تھیں۔ عباسی دور کے تجربہ کار سیاست دان ان کی عقل و فراست کے قائل تھے۔

مہدی بن منصور کی بیٹی اور خلیفہ ہارون الرشید کی سب سے چھوٹی بہن تھیں خاندان عباسیہ کی شاہی روایات کے مطابق ابتدائی تعلیم و تربیت مشہور علمائے دربار کی نگرانی میں حاصل کی اور دور عباسیہ کی پرشوکت شہزادیوں کی طرح محلات میں پرورش پائی۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر اور شرح پر حیرت انگیز حد تک عبور حاصل تھا۔ انتہائی فصیح و بلیغ اور پر حکمت انداز میں قرآن مجید کی مشکل آیات کی تفسیر بیان کیا کرتی تھیں اور اکثر مشکل مسائل کو اس خوبی کے ساتھ بیان کیا کرتی تھیں کہ بڑے بڑے درباری علماء دنگ رہ جاتے تھے۔ ان کی قابلیت اور دینی معلومات عام علماء سے کہیں زیادہ تھیں۔ پہلا نکاح محمد بن سلیمان سے ہوا لیکن وہ جلد ہی فوت ہو گئے تو ہارون الرشید نے اپنے ایک عزیز ابراہیم بن صالح سے ان کی شادی کر دی۔
عباسہ ایک خوش بیان اور باکمال شاعرہ تھیں کیونکہ انہوں نے عربی اور فارسی کی

تعلیم نہایت اعلیٰ پیمانے پر حاصل کی تھیں اس لیے ادبی امور اور شعر وسخن کے معاملات میں ان کی رائے بہت وقیع خیال کی جاتی تھی۔ ویسے بھی شعر فہمی اور سخن سنجی میں کوئی عورت ان کی ہم پایہ نہ تھی۔ اکثر جب خلیفہ کی نجی مجالس میں شعر وادب پر بحث ہوتی تو تمام اختلافی امور میں عباسہ سے مشورہ حاصل کیا جاتا اور وہ ایسی بچی تلی رائے دیتی تھیں کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آواز میں کمال درجہ کا لوچ عطا فرمایا۔ جب قرآن مجید قرأت سے پڑھتی تھیں تو سننے والوں پر سحر کی کیفیت طاری ہو جاتی اور اس وقت وہ پورے ماحول پر روحِ تقدس بن کر چھا جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ شاہی محل کی تمام بزرگ خواتین ہر وقت عباسہ سے قرأت کے ساتھ قرآن مجید سننے کی آرزو مند رہتی تھیں۔ جب بھی عباسہ سامنے آتیں ان سے یہی فرمائش کی جاتی کہ قرأت سے قرآن پڑھ کر سنائیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن خوانی کے اعلیٰ ذوق اور دلی شوق وشغف کے بغیر اس خصوصیت کا پیدا ہونا ممکن نہیں تھا۔ خصوصاً ایسے ماحول میں جب کہ شخصی حکومت کے تمام تقاضے کسی نہ کسی صورت میں موجود تھے اور شاہی خاندان کے اکثر افراد کا ان سے متاثر ہونا کوئی عجیب بات نہ تھی۔

عباسہ بہت زیرک، معاملہ فہم، دور اندیش اور ذہین ہونے کے علاوہ اپنے خاندان کی بے حد خیر خواہ تھیں۔ انہیں اختلافات، افتراق وانتشار اور لڑائی جھگڑے سے سخت نفرت تھی۔ وہ عباسی خاندان کے مختلف افراد کے تعلقات کو خوشگوار بنانے میں دن رات مصروف رہتی تھیں۔ ان کی سب سے بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ مملکت اسلامیہ کے ذمہ دار اور صاحبِ اختیار افراد باہم صلح وآشتی اور یگانگت کے ساتھ امور سلطنت کو انجام دیں جب بھی کسی بات پر اختلاف پیدا ہوتا تھا عباسہ اسے اچھے طریقے سے ختم کرنے کے لیے اپنا پورا اثر ورسوخ استعمال کرتی تھیں۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ شاہی خاندان کی ناچاقی اور بے اتفاقی سے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط ہوں گے جو

ہر وقت مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کو نیست و نابود کرنے کے لیے تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ عباسہ تاریخ کی اس حقیقت کو خوب سمجھتی تھیں کہ ماضی میں دنیا کی تمام بڑی بڑی حکومتیں امراء کی سازشوں اور تخت و تاج کے وارثوں میں جنگ و جدال کی وجہ سے تباہ و برباد ہوتی رہی ہیں۔ باہمی مخاصمت، دشمنی، حسد و رقابت اور ناچاقی نے کئی قوموں کو صفحہ قرطاس سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔ جس گھر یا سلطنت اور قوم میں پھوٹ اور نااتفاقی پیدا ہو جائے۔ ہمیشہ دشمن ہی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔ اس وقت اگرچہ سلطنت عباسیہ شان و شوکت اور قوت و دبدبہ کے اعتبار سے اپنے عروج پر تھی لیکن مسلمانوں کے بے شمار دشمن مناسب وقت کے انتظار میں چاروں طرف تاک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ کسی طرح مسلمانوں میں پھوٹ اور انتشار کی بیماری پیدا کر دیں اور شاہی خاندان کے افراد کو خانہ جنگی میں الجھا دیں تاکہ مسلمانوں کی طاقت آپس میں لڑ بھڑ کر فنا ہو جائے اور سلطنت زیادہ سے زیادہ کمزور ہو جائے تو وہ اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ عباسہ وقت کی سیاسی حالات اور نقاضوں سے پوری طرح باخبر تھیں اور اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق ہمیشہ فتنوں کا سد باب کرنے میں پوری مدد دیتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے محبت رکھنے والا ہر دردمند شخص اس طرح سوچ سکتا ہے کیونکہ جب دشمن حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا جبر و تشدد صرف شاہی خاندان تک ہی نہیں رہتا بلکہ شاہی خاندان کے افراد کی تمام بداعمالیوں اور گناہوں کی سزا پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے جیسے ایک گھر میں باپ یا ماں ان کے خلاف قانون حرکت اور جرم سے پورا گھر متاثر ہوتا ہے اور گھر کے کسی بڑے شخص کی بدکرداری پوری خاندان کو تباہ کر دیتی ہے حتیٰ کہ معصوم اور بے گناہ بچوں کا مستقبل تباہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی ملک کے حکمران کے اعمال کی سزا ساری رعایا کو ملتی ہے اور فاتح دشمن کی

چمکتی ہوئی تلوار ہر شخص کے سر پر بلا امتیاز موت بن کر لہراتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ شہزادی عباسہ شاہی خاندان کی باہمی رنجشوں اور کدورتوں سے ہمیشہ آزردہ خاطر ہو جاتی تھیں اور انہیں اس قسم کے واقعات سے بہت صدمہ پہنچتا تھا۔ ہادی اور ہارون الرشید کی ولی عہدی کے لیے خطرناک اختلاف پیدا ہوا تھا۔ اور شہزادی عباسہ نے اس میں جو ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔ اس سے عباسہ کی اس خصوصیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ خلیفہ مہدی کے دو بیٹے ہادی اور ہارون الرشید ملکہ خیزران کے بطن سے تھے خلیفہ بڑے بیٹے ہادی کو ولی عہد مقرر کرنا چاہتے تھے مگر ملکہ خیزران کو علم تھا کہ ہادی خلافت کی اہم ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل نہیں کیونکہ وہ بہت زیادہ عیش پرست کمزور طبیعت اور نااہل تھا۔ اس کے برعکس ان کی خواہش تھی کہ چھوٹے بیٹے ہارون الرشید کو ولی عہد نامزد کیا جائے۔ ہارون الرشید اپنے بڑے بھائی ہادی کی نسبت بہت زیادہ سمجھدار زیرک اور دوراندیش تھے۔ اور ہر لحاظ سے اس منصب کے اہل تھے۔ خلیفہ مہدی نے اس پریشانی سے نجات حاصل کرنے کے لیے دونوں کو ولی عہد مقرر کر دیا اور یہ وصیت کر دی کہ ہادی کے بعد ہارون الرشید کو خلیفہ بنایا جائے۔ مہدی کی وفات کے بعد جب ہادی خلیفہ ہوا تو ہارون الرشید نے اظہار اطاعت کے طور پر سب سے پہلے اپنے بھائی کے ہاتھ پر بیعت کی مگر ہادی نے انہیں ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے نابالغ بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانے کا اعلان کر دیا۔ ہادی کی اس بے انصافی اور بددیانتی کی وجہ سے سخت نازک صورت حال پیدا ہو گئی اور قریب تھا کہ مسلمانوں کی یہ عظیم الشان سلطنت ان دو حقیقی بھائیوں کی خانہ جنگی کا شکار ہو کر تباہ ہو جائے۔ جب معاملہ بہت زیادہ بگڑتا ہوا نظر آنے لگا تو شہزادی عباسہ سخت بے چین ہو گئیں اور ان کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ کسی طرح اس جھگڑے کا کوئی قابل قبول حل مل جائے جس سے باہمی خونریزی رک جائے۔

ایک روز شہزادی عباسہ نے ہادی کو خوش وخرم دیکھ کر اسے ہنسی مذاق کی باتوں سے بے حد محظوظ کیا۔ اور اسے بے شمار دلچسپ لطیفے اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنائیں ہادی اتنا خوش ہوا کہ اس نے موج میں آ کر شہزادی عباسہ سے کہا۔ بہن! میرا دل چاہتا ہے کہ آج تم اپنے بھائی سے کچھ مانگو تو وہ تمہیں دل کھول کر دے۔ عباسہ نے قدرے سوچ کر جواب دیا بھائی! میں کچھ مانگوں گی، آپ نہ دے سکیں گے۔ ہادی ایسے خلیفۂ وقت کے لیے یہ طعنہ بہت بڑا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا کہ یہ ناممکن ہے کہ میں تمہاری خواہش کو پورا نہ کرسکوں۔ مانگو کیا مانگتی ہو۔ عباسہ نے پھر کہا کہ مانگوں! کہا "ہاں ضرور مانگو" عباسہ نے جواب دیا۔ میری خواہش ہے کہ آپ ہارون الرشید کو معزول کرنے کا خیال ترک کر دیں۔ ہادی کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ عباسہ نے یہ صورت دیکھ کر کہا کہ میرے بھائی! اس مطالبے میں میری کوئی ذاتی غرض شامل نہیں ہے۔ ہارون کے خلیفہ ہو جانے سے مجھے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔ میں تو صرف خلافت عباسیہ کی حفاظت اور بقا چاہتی ہوں۔ میرے پیش نظر مسلمانوں اور ملک کی بہتری ہے۔ ولی عہد ابھی نابالغ ہے اور آپ کا یہ کام کئی فتنے پیدا کرنے کا موجب بن جائے گا۔ ہادی نے اپنے بیٹے کے حقوق کا سوال بڑی شدومد سے اٹھایا تو شہزادی عباسہ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ یہ وصیت کر دیں۔ اگر اس وقت تک آپ کا بیٹا جعفر جوان نہ ہو تو ہارون الرشید کو خلیفہ بنا دیا جائے۔ عباسہ نے ہادی کو پوری طرح قائل کر لیا تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے یہ تجویز منظور کر لی۔ اس طرح شہزادی عباسہ نے نہ صرف عباسی خلافت کو تباہی سے بچا لیا بلکہ تاریخ کو ہارون الرشید ایسے بے نظیر حکمران سے محروم نہیں ہونے دیا۔

فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہا

"میری استاد فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا نے فرمایا ہے کہ کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس کا انہیں علم نہ تھا۔" (حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ)

"مکہ میں ایک عورت فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہا نامی ہے۔ جو بزرگ ترین ہے۔ قرآن مجید کے حقائق و معانی اس طرح بیان کرتیں کہ مجھے ان پر رشک آتا تھا۔"

(حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ)

"جو کوئی اللہ کے لیے اس طرح نیک عمل کرے گویا خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس سے زیادہ خلوص کسی میں نہیں ہو سکتا اور جس کے عملِ خیر میں خلوص ہو اس سے زیادہ خدا کا نیک بندہ کون ہو سکتا ہے۔" (فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہا)

آپ کا نام فاطمہ تھا۔ نیشاپور میں پیدا ہوئیں اور تیسری صدی ہجری کے شروع کا زمانہ پایا۔ اس وقت دنیائے فقر و غناء اور جہان زہد و عبادت و ولایت پر حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ ایسے بلند پایہ اولیاء اللہ اور جلیل القدر بزرگوں کا جلال و جمال چھایا ہوا تھا۔ اس وقت جہاں ایک طرف شخصی

حکومت کے مفاسد عام تھے وہاں علم وحکمت اور فضل و کمال کے دریا بھی پوری روانی کے ساتھ موجزن تھے۔ علماء فضلاء مفسرین اور محدثین کی ایک بہت بڑی جماعت موجود تھی جو پوری ملت اسلامیہ کا نچوڑ سمجھی جاتی تھی۔ فاطمہ نے زاہد و عابد اور باعمل علمائے عصر کے زیر سایہ رہ کر علم و فضل میں کمال حاصل کیا اور ثابت کر دیا کہ صرف شاہزادیاں اور شاہی محلات میں رہنے والے بیگمات ہی علم و فضل میں کمال حاصل نہیں کر سکتیں بلکہ ایک غریب عورت کا بے پناہ شوق اور عشق اسے علم وحکمت کی ان بلند ترین چوٹیوں تک پہنچا سکتا ہے۔ جہاں اوجِ ثریا بھی سجدہ ریز ہے۔ صرف علم حاصل کر لینا اور کتابوں کو حفظ کر لینا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کی روشنی میں عمل کی پرخطر اور خارزار وادیوں کو طے کر کے منزل مقصود تک پہنچنا حصول علم کا حقیقی مقصد ہوتا ہے۔ جس طرح علم سے بے نیاز عمل گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے اسی طرح عمل کے بغیر علم فکر ونظر کا فساد بن سکتا ہے۔ اور یہ فساد انسان کو تباہی کے عمیق غاروں میں گرا دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مردوں کی تاریخ تو ایسے راہ نوردان شوق سے بھری پڑی ہے جنہوں نے بے پناہ مصائب برداشت کر کے اور نفسانی خواہشات کی سنہری زنجیروں کو توڑ کر عمل کی منازل طے کیں اور قابل رشک بلندیوں تک جا پہنچے۔ مگر عورتوں میں یہ مرتبہ بہت کم ہستیوں کو نصیب ہوا ہے۔ ان کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے لیے آسمان کی رفعتوں کو چھونے اور شرف و امتیاز کے بلند ترین مقامات حاصل کرنے کے تمام دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور اسلام نے ان راستوں پر جبر و تشدد اور ظلم کے پہرے نہیں بٹھائے بلکہ قرآن کی انگشت شہادت تو ہر وقت ان راستوں کی طرف پیش قدمی کرنے کی دعوت دیتی رہتی ہے۔ ضرورت صرف خلوص نیت، عمل پیہم اور شوق و جستجو کی ہے۔ فاطمہ نیشاپوری اگرچہ علم و فضل کا ایک دریا تھیں مگر ان کے علم نے انہیں سطحیت کا اسیر

نہیں رکھا کہ وہ ہر وقت اسی نشے میں سرشار ہیں کہ علم و حکمت کے میدان میں لاکھوں پر بھاری ہیں اور بہت کم لوگ ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ کبر و غرور اور فخر و نخوت کو انہوں نے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا بلکہ جتنا ان کا علم بڑھتا گیا وہ اتنی ہی زیادہ منکسر المزاج، حلیم الطبع اور زاہدہ و عابدہ بنتی گئیں۔ ان کا ذوق عبادت اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ ساری ساری رات نوافل پڑھنے میں گزار دیتی تھیں اور ان کی ہر بات میں ذکر الٰہی کا رنگ ہوتا اور ان کا ہر فعل صدق و دیانت اور تقویٰ و طہارت سے عبارت ہوتا تھا۔ ان کی پوری زندگی نیکی اور پارسائی کے سانچے میں ڈھل چکی تھی۔ زندگی میں شاید ہی کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہو۔ ہمیشہ موٹا اناج کھاتی تھیں۔ گاڑھا پہنتیں اور کھال اوڑھ کر گزارہ کرتی تھیں حالانکہ ان کے عقیدت مند انہیں بہترین کھانے اور ملبوسات پیش کرتے مگر وہ سب غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتی تھیں۔ اس قسم کی بے ریا اور بے لوث زندگی نے انہیں ولایت کے رتبے تک پہنچا دیا۔ بڑے بڑے صوفیاء اور اولیائے کرام ان سے متاثر تھے کیونکہ وہ تصوف کی حقیقت اور اس کے اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھیں۔ اور عملی زندگی بسر کرتی تھیں۔ اپنے وقت کے دو بہت بڑے اولیائے کرام حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ اور بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ ان کے شاگرد تھے اور ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے تھے کہ انہوں نے فاطمہ نیشاپوری سے فیض حاصل کیا ہے۔ حضرت شیخ بایزید بسطامی قدس سرہ نے فاطمہ رحمۃ اللہ علیہا کی بے حد تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ایک مرد اور ایک عورت دیکھی۔ عورتوں میں جس عورت کو میں صاحب کمال اور عارفہ پایا وہ فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہا ہیں۔ کسی مقام پر کوئی خبر ہو وہ آپ پر منکشف ہو جاتی ہے ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا کہ میری استاد فاطمہ نیشاپوری فرمایا کرتی تھیں کہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا انہیں علم نہیں۔ مشائخ میں سے کسی نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھ کر پوچھا کہ سب سے زیادہ بزرگ کون ہے؟

آپ نے فرمایا کہ مکہ میں ایک عورت فاطمہ نیشاپوری ہے جو بزرگ ترین ہے۔ وہ قرآن مجید کے ایسے ایسے حقائق و معانی بیان کرتی ہیں کہ مجھے ان پر رشک آتا ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت بھی منسوب ہے کہ آپ نے فاطمہ علیہا کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا میں کوئی صوفی آپ سے زیادہ بزرگ نہیں جو درمیان میں سبب اور واسطہ پر نظر نہ رکھتا ہو۔ فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ حکمت و عرفان اور معرفت الٰہی کا سمندر تھیں۔ ان کے اقوال اور بیانات میں زندگی کے بڑے بڑے حقائق پوشیدہ ہیں۔ ایک دفعہ فرمایا کہ جو کوئی محض اللہ کے لیے اس طرح نیک عمل کرے گویا خدا اسے دیکھ رہا ہے تو اس سے زیادہ خدا کا نیک بندہ اور کون ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص اس طرح نہیں رہتا کہ اللہ سے اس کی لو لگی رہے۔ وہ ہر میدان میں اڑتا پھرتا ہے اور ہر قسم کی باتیں کرتا ہے۔ اس سے نیک کام بہت کم اور گناہ بہت زیادہ سرزد ہوتے ہیں لیکن جو ہر حال میں خدا سے لو لگائے رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ صدق و صداقت کے سوا باقی تمام باتوں سے اسے گونگا کر دیتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسان خدا سے شرم رکھے اور ہر وقت دلی خلوص کے ساتھ اس کی طرف متوجہ رہے۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ نیک کام انجام پاتے ہیں بلکہ گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا۔

حضرت فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے بے شمار پا پیادہ حج کیے اور ہر منزل پر لوگوں کو نیکی کے راستے پر چلنے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ حجاز کے علمائے وقت اور خانہ کعبہ کے بزرگان دین ان کے ساتھ بے حد عزت و احترام کے ساتھ پیش آتے تھے اور ان سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب آخری مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئیں تو یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید ان کا آخری حج ہو۔ ان کا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ ۲۲۳ھ میں وہیں وفات پائی۔ بعض تذکرہ

نویسوں کی روایات کے مطابق مکہ معظمہ کے قریب کسی مقام پر داعی اجل کو لبیک کہا اور دربار حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک خاک ابدی آرام وسکون کے لیے نصیب ہوئی۔

حضرت فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک پاک اور صوفیانہ زندگی کا یہ پہلو خاص طور پر قابل غور ہے کہ ان کے نزدیک فقر وتصوف کی بنیادی اور اولین شرط زہد وعبادت تھی۔ انہوں نے تادم آخر نماز کی پابندی فرمائی اور زیادہ سے زیادہ مرتبہ فریضۂ حج ادا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مجذوب بن کر حدودِ الٰہی کو توڑنے اور شعائر اسلامی سے روگردانی کرنے کو کبھی تصوف نہیں سمجھا بلکہ تزکیۂ نفس اور روحانی بلندیوں تک پہنچنے کے لیے انہوں نے اتنی کثرت سے عبادت کی کہ ہم میں سے کوئی اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ان کی زندگی ہمیں سکھاتی ہے کہ عمل سے زندگی بنتی ہے۔ جنت بھی جہنم بھی۔ دنیا کی ہر مسلمان عورت نیک اعمال کی بدولت بلند ترین مقامات حاصل کرسکتی ہے اور قرطاس ہستی پر غیر فانی حروف میں اپنا نام کندہ کرسکتی ہے ان کی زندگی کا یہ رخ بھی ہر لحاظ سے قابل تقلید ہے کہ جب ایک مسلمان عورت کا دامن حیات اللہ سے وابستہ ہوجاتا ہے اور اس کا دل انوار معرفت سے سراپا نور بن جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے خود اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرکے دوسروں کے لیے ایک بے مثال نمونہ بنتی ہے اور پھر ہر لحظہ دوسروں کو نیکی کی تلقین کرنا۔ انہیں علم وفضل کے زیور سے آراستہ کرنا اور صراط مستقیم پر چلانا اس کا مقصد زندگی بن جاتا ہے۔ وہ صرف اللہ کے لیے جیتی اور اللہ کے لیے جان دیتی ہے۔

فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ پیغام کہ نیک اعمال کی بنیاد ہمیشہ خلوص پر رکھو اور صدق ودیانت کو اپنا شعار بناؤ۔ ہر مسلمان عورت کے لیے اوج وکمال کی طرف آنے کی دعوت ہے۔ جس نے اس پیغام کو دل سے سمجھ کر حرز جاں بنالیا وہ ایک ناقابل تسخیر طاقت بن سکتی ہے۔

آمنہ رملیہ رحمۃ اللہ علیہا

"اگر اللہ تعالیٰ نے رزق دینے کی ذمہ داری خود لی ہے تو تیری فکرمندی کیوں؟ اگر ہر چیز کے بعد دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے تو بخل کیسا؟ اگر جنت حق ہے تو خوشی کیوں؟ اور اگر دوزخ سچ ہے تو گناہ کیوں اگر ہر چیز قضا و قدر کی گرفت میں ہے تو پھر ڈر کس کا؟ (آمنہ رملیہ رحمۃ اللہ علیہا)

آمنہ نام تھا تقریباً ۱۶۳ھ میں بغداد کے ایک نواحی علاقے میں رملہ میں پیدا ہوئیں۔ والدین بے حد غریب تھے۔ گھر میں ہر وقت فقر و فاقہ کی حالت رہتی تھی۔ طبیعت بچپن ہی سے قدرتی طور پر حصول علم کی طرف راغب تھی۔ بے حد ذہین، روشن دماغ اور عقل مند تھیں۔ سن شعور کو پہنچیں تو اپنی والدہ کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئیں۔ اس زمانے میں مکہ علم و حکمت اور رشد و ہدایت کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ ایک بزرگ عالم ان دنوں مسجد حرام میں درس دیا کرتے تھے۔ آپ حصول علم کی خاطر ان کے حلقہ درس میں شامل ہو گئیں۔ اور بڑے ذوق و شوق کے ساتھ تحصیل علم میں مصروف ہو گئیں۔ عرصۂ دراز تک مکہ معظمہ میں مقیم رہیں اور اس دوران بڑی محنت اور جستجو سے قرآن کا علم حاصل کیا۔ جب ان کے استاد انتقال فرما گئے تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے علم حدیث سیکھنے کے لیے مدینہ منورہ آ گئیں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر ان کی صلاحیتیں خوب اجاگر ہوئیں

اورانہوں نے والہانہ ذوق وشوق کے ساتھ علم حدیث پر پورا عبور حاصل کیا۔ انہیں بے شمار احادیث زبانی یاد تھیں۔ ۱۹۹ھ کے قریب علم فقہ حاصل کرنے کے لیے حضرت امام شافعی کی خدمت میں دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لائیں۔ اس طرح آپ نے اس دور کے جلیل القدر آئمہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل کیا۔ جب حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مصر تشریف لے گئے تو آپ کوفہ آ گئیں۔ اور شرعی علوم کے بلند پایہ ماہرین اور فقہاء سے فیض حاصل کیا۔ عرصہ دراز کی علمی ریاضت اور سخت محنت کے بعد مراجعت فرمائے وطن ہوئیں تو علوم دین میں آپ کو قابل رشک مرتبہ حاصل ہو چکا تھا۔ چاروں طرف آپ کے علم وفضل کی دھوم مچ گئی۔ اور لوگ جوق در جوق علمی تشنگی بجھانے کے لیے آپ کے آستانہ حکمت پر حاضر ہونے لگے۔ بغداد کے بے شمار لوگ جن میں علماء بھی شامل ہوتے تھے آپ کے حلقہ درس میں آنا فخر وسعادت سمجھتے تھے کہا جاتا ہے کہ اس وقت مردوں میں بھی بہت کم لوگ علم وفضل کے میدان میں آپ کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ بڑے بڑے علماء، صوفیاء اور فضلاء آپ کی علمی قابلیت اور ذہانت کے دل سے معترف تھے۔ ۲۰۹ھ میں ایک درویش کامل نے آپ کی طرف توجہ فرمائی تو ان کی روحانی تعلیم نے آمنہ رملیہ رحمۃ اللہ علیہا کے تمام ظاہری علوم کو علم باطن میں تبدیل کر دیا جس سے ان کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہوا۔ ان کا علمی کبر وغرور اور احساس برتری دیکھتے دیکھتے عجز وانکساری اور خاکساری کے سانچے میں ڈھل گیا۔ علمی نکتہ آفرینی اور فلسفیانہ انداز فکر کا دور بالکل ختم ہو چکا تھا۔ صبح وشام ذکر الٰہی اور عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ اللہ کی تسبیح وتحمید اور گریہ وزاری ان کا معمول بن گیا۔ اپنا تمام مال واسباب راہ خدا میں تقسیم کر دیا اور بالکل فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ روزہ ونماز اور ذکر وفکر کے علاوہ کسی دوسری چیز سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ سات حج پاپیادہ کیے۔ اس وقت کے ایک بہت بڑے بزرگ حضرت بشر رحمۃ اللہ علیہ ان

کے بے حد مداح تھے۔

ایک مرتبہ آمنہ رحمۃ اللہ علیہا نے حضرت بشر سے کہا کہ اے بشر! میں سوتی ہوں مگر دل جاگتا ہے۔ حضرت بشر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ ساری ساری رات انتہائی خشوع وخضوع سے اس طرح عبادت کرتی تھیں کہ صبح تک دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر رہتی تھیں۔ ایک دفعہ کسی رئیس نے بے حد اصرار کے ساتھ دس ہزار اشرفیاں قبول کرنے کے لیے بہت زیادہ مجبور کیا تو آپ نے اس کو چھونا تک گوارا نہ کیا بلکہ شہر میں منادی کرا دی کہ جس کو روپے کی ضرورت ہو آ جائے چنانچہ شام تک ان کے پاس ایک کوڑی باقی نہ رہی حالانکہ اس روز ان کے گھر میں فاقہ تھا۔ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ایسے جلیل القدر اور بلند مرتبت امام جن کے زہد و تقویٰ کے خود امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ معترف تھے آمنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بشر رحمۃ اللہ علیہ کے توسط سے یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ آمنہ رملیہ ان کے لیے دعا کریں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہا کی صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں ہے۔

حضرت آمنہ رملیہ رحمۃ اللہ علیہا کی زندگی میں مسلمان خواتین کے لیے کتنا بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ وہ ایک ایسے دور میں جب کہ مختلف ممالک اور دنیا کے دور دراز شہروں میں آنے جانے کے موجودہ تیز رفتار ذرائع موجود نہ تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک سفر بے حد پرخطر، دہشت ناک اور کٹھن ہوتا تھا۔ اخبارات کا رواج نہ تھا۔ چھاپہ خانے نہ تھے۔ موجودہ طرز کے بڑے بڑے اسکول اور کالج عام نہ تھے آسانی کے ساتھ کتابیں دستیاب نہ ہوتی تھیں اور پھر انہیں پڑھانے والوں سے تعلق پیدا کرنا بھی آسان نہ تھا۔ ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسی غریب اور مفلس لڑکی کا تصور کیجیے جسے پیٹ بھرنے کے لیے دو وقت کا کھانا بھی میسر نہ ہو۔ اس نے دیہاتی ماحول میں پرورش پائی ہو اور وہ دنیا کے نشیب و فراز سے بالکل ناواقف ہو۔ اللہ کے سوا دنیا میں کوئی اس کا حامی اور مددگار نہ ہو۔ کوئی اس کی سفارش کرنے والا اور راہنمائی

کرنے والا نہ ہو۔ اسے کسی طرف سے نہ کوئی وظیفہ ملتا ہو اور نہ کسی قسم کی دوسری مالی امداد حاصل ہو۔ ان حالات میں ایک سیدھی سادی الھڑ دیہاتی لڑکی دل میں تحصیل علم وحکمت کی آرزو لیے چیتھڑوں میں لپٹی اپنی غریب اور مفلس ماں کی معیت میں فریضہ حج ادا کرنے کے لیے جاتی ہے۔ سفر کی بے پناہ صعوبتیں برداشت کرتی ہے اور تمام دنیوی اسباب آسائش سے محروم ہونے کے باعث کئی مصائب برداشت کرنے کے بعد دیار حبیب میں پہنچ جاتی ہے۔ لوازمات حج سے فراغت پانے کے بعد لاکھوں انسانوں میں اس کی کھوئی کھوئی آنکھیں کسی صاحب علم کو تلاش کرتی ہیں۔ آخر اس کی امید بر آتی ہے اور ایسے ایک بہت بڑے بزرگ کے حلقۂ درس میں شامل ہو کر علم قرآن سیکھنے کا موقع مل جاتا ہے جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے، حصول علم کا شوق بھی اسی رفتار سے فراواں ہوتا جاتا ہے۔ وہ مکہ و مدینہ کے حکمت کدوں کی خاک چھانتی پھرتی ہے۔ برسوں کی تلاش وجستجو اور محنت وریاضت کے بعد وہ تمام دینی علوم پر حیرت انگیز حد تک عبور حاصل کر لیتی ہے۔ ایسے ایسے کامل اور بلند مرتبت اساتذہ کی صحبت نصیب ہوتی ہے، جو منصب امامت پر فائز تھے اور دنیائے اسلام میں احترام وعقیدت کے مراکز خیال کیے جاتے تھے۔ بڑے بڑے ارا کین سلطنت بلکہ خلفاء تک ان کی خدمت میں باریابی حاصل کرنا اپنے لیے باعث فخر وسعادت خیال کرتے تھے۔ ایسے بزرگوں کی خدمت میں رہ کر اس نے برسوں مختلف علوم حاصل کیے اور اپنی علمی پیاس بجھائی۔ آخر وہ اس رتبے کو پہنچی کہ خود کبار علمائے کرام اس کے حلقۂ درس میں شامل ہونا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے اور وہ دلدادگان علم وحکمت کے لیے سرچشمہ ہدایت بن گئی۔

یہی مفلس اور قلاش لڑکی آمنہ رملیہ رحمۃ اللہ علیہا تھی جس نے ایک کمزور اور ناتواں اور بے سہارا عورت ہونے کے باوجود چین تک جا کر علم حاصل کرنے کے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو کس شان سے عملی جامہ پہنایا۔

کیا یہ اسلامی تعلیم کا اعزاز نہیں کہ ایک بے یار ومددگار دیہاتی لڑکی اپنی ذاتی

کوشش اور کاوش سے علمی فضیلت کی آخری حد تک جا پہنچی کون کہتا ہے کہ اسلام تعلیم نسواں کا دشمن ہے؟ تاریخ گواہ ہے۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ کی عورتوں کا تو ذکر ہی کیا ان کے بڑے بڑے مذہبی راہنما اور پادری لکھنے پڑھنے تک کی صلاحیت سے محروم تھے ان کے نزدیک علم اور جادو ہم معنی الفاظ تھے کیا پورا یورپ اس دور کی ایک بھی عورت کو حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا، فاطمہ نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہا اور آمنہ رملیہ رحمۃ اللہ علیہا کے مقابلے میں پیش کر سکتا ہے؟ اس وقت کسی عیسائی عورت کو یہ اجازت نہ تھی کہ کتاب مقدس کو چھونے تک کی کوشش کر سکے۔ مذہبی راہنمائی کا شرف تو اسے آج تک بھی نصیب نہیں ہو سکا۔

پورا یورپ اس نظریہ کا قائل تھا کہ عورت بدی کی جڑ ہے اور نجس ہے۔ اس لیے وہ انجیل کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ اس وقت امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن آمنہ رملیہ رحمۃ اللہ علیہا ایسی بلند پایہ ہستیوں کے علم و حکمت کا سدابہار گلستان بن کر پوری دنیا کو نور و نگہت کی دولت بخش رہا تھا۔ اس وقت مسلمان عورت قرآن کی حافظہ تھی، قاریہ تھی، مفسرہ تھی۔ محدثہ اور فقیہہ تھی۔ علوم شریعت اور علوم عصریہ کی عالمہ اور فاضلہ تھی۔ بڑے بڑے علماء ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے۔ ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ جلیل القدر بزرگ اولیاء اور آئمہ کرام ان سے فیضیاب ہونا باعث سعادت خیال کرتے تھے۔ وہ مسلمان خواتین خود ایک مکتب اور یونیورسٹی تھیں۔ ہزاروں لوگ ان کے علم و فضل سے بہرہ ور ہوتے تھے اکثر وہ جو مردوں کے استاد، معلم، راہنما اور امام تھے ان کی استادی اور راہنمائی کا شرف ان بلند کردار عورتوں کو حاصل تھا۔

اندھی تقلید کا روگ آج کس طرح ہمارے شاندار ماضی کو برباد کر رہا ہے کاش! ہماری مسلمان بہنیں اپنی تاریخ کے اوراقِ پارینہ میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو تلاش کرنے کے قابل ہو سکیں اور مسلمان عورت کے شرف کو عرش اعظم کے سامنے سجدہ ریز دیکھ سکیں۔

مغیرہ بنت ازرو

جس کی عصمت وعفت اور غیرت نے نشۂ اقتدار میں مست شہنشاہی کو غریب الوطنی اور بے کسی کے عالم میں للکارا، جس نے سنسان جنگل کی تنہائی میں مسلمان عورت کے بلند کردار کی قندیل قیامت تک کے لیے روشن کردی اور مستقبل کی عورت کے لیے ایک تابندہ ودرخشندہ مثال قائم کردی۔

خاندان بنو عباس کی حشمت وصولت اور عظمت وشوکت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ خلیفہ مامون الرشید کے سر پر تاج شہنشاہی جگمگا رہا تھا۔ وہ ایک طرف بلادِ اسلامیہ کا روحانی پیشوا سمجھا جاتا تھا تو دوسری طرف ایک رفیع الشان، پُر ہیبت اور پر جلال سلطنت کا تنہا حکمران تھا۔ اس وقت یہ دنیا کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت ترقی وکمال کے لحاظ سے اوجِ ثریا کو شرمسار کر رہی تھیں۔ مامون الرشید کا بڑا لڑکا اور ولی عہد شہزادہ عباس طائفہ الخل میں شکار کھیلتا ہوا ایک نواحی جنگل کے قریب جا نکلا۔ شام کے جھٹپٹے میں اس نے دیکھا کہ ایک حسین وجمیل عورت چشمے پر پانی کی گاگر بھر رہی ہے۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں آفتاب کو شرما دینے والی ایک عورت

اس ویران وسنسان جنگل میں شہزادہ عباس کے لیے ایک عجوبہ سے کم نہ تھی۔ وہ شاہی رعب وداب اور تمکنت کے ساتھ اس عورت کے قریب پہنچا اور جاتے ہی انتہائی بے باک لہجے میں پوچھا کہ اے حسین عورت! تو کون ہے؟ کس خاندان سے ہے اور ایسے غیر آباد مقام پر جہاں جنگل اور پہاڑ کے سوا کچھ نہیں تو تنہا کیا کر رہی ہے؟ یہ غیر متوقع اور بے ہودہ سوال سن کر اس غیور اور باحیا خاتون کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس نے حقارت بھری نظروں سے شہزادہ عباس کی طرف دیکھا اور جواب دیئے بغیر بڑی خودداری کے ساتھ چل دی یہ تو شاہی تمکنت اور خاندانی فخر وغرور کے منہ پر زبردست طمانچہ تھا۔ ولی عہد سلطنت اور ہونے والے خلیفہ کے لیے اس سے بڑی توہین اور کیا ہوسکتی تھی۔ ایک معمولی بیابانی عورت نے نوجوان شہزادے کی بات کا جواب دینا بھی اپنے لیے کسر شان خیال کیا۔ شہزادہ عباس وفور غضب سے دیوانہ ہوگیا۔ حکم دیا کہ اس مغرور عورت کا حسب ونسب دریافت کرو۔ اور اسے ولی عہد کی جانب سے نکاح کا پیغام دو۔ فوجی افسران اور محافظ سپاہی فوراً اس کے پیچھے روانہ ہوئے۔ شکار ملتوی کر دیا گیا کیونکہ ایک بے حیثیت انجان عورت نے شاہی غرور ونخوت کے سر میں خاک ڈال دی تھی۔ شہزادہ اپنے خیمے میں واپس جا کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ نشۂ اقتدار اور شاہی نخوت کا غرور اور دوسری طرف جوانی کی سرمستی۔ اس کے لیے یہ بالکل ایک نیا تجربہ تھا کہ شہزادہ اس دبدبہ وہیبت کے مظاہرے کے ساتھ ایک معمولی عورت کو اپنی بات کا جواب دینے پر آمادہ نہ کرسکا۔ عباس رات بھر انتہائی پریشانی کے عالم میں کبھی خیمے کے اندر اور کبھی خیمے سے باہر بے تابی سے ٹہلتا رہا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اس مغرور عورت سے اپنی شکست کا انتقام لیے بغیر واپس نہ جائے گا شاہی وقار مجروح ہوا تھا اس کی پریشانی اور بے تابی ہر لحاظ سے قابل فہم تھی۔ خدام اور سپاہی تلاش وجستجو کے بعد واپس آئے تو انہوں نے بتایا کہ وہ حسین وجمیل عورت جس کی نفرت وحقارت سے بھرپور

نگاہوں نے شاہزادے کو اپنی نظروں سے بھی گرا دیا تھا۔ خاندان برامکہ کی لڑکی مغیرہ ہے اور رازرو کی بیٹی ہے۔ اس کے شوہر کا نام حسین بن موسیٰ تھا جو قتل ہو چکا ہے اور وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ وارثوں میں اس وقت کوئی بھی زندہ نہیں۔ وہ شہزادہ عباس کی طرف سے نکاح کا پیغام سنتے ہی آگ بگولا ہو گئی اور اس نے انتہائی غضب ناک آواز میں شہزادے کے پیغام کا یہ جواب دیا ہے۔

ہارون الرشید ہمیں ملیا میٹ کر چکا ہے اور ہمیں قتل و غارتگری کا شکار بنا چکا ہے۔ اب مامون الرشید ہماری عزت و ناموس اور عصمت و عفت کے درپے ہے۔ جاؤ! اور عباس کو کہہ دو کہ اگر اس نے میری جھونپڑی کے اندر قدم رکھنے کی جرأت کی تو اسی دہلیز کے نیچے اس کا مدفن بنے گا۔

شہزادہ عباس یہ جواب سن کر ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گیا پھر اچانک اس کی آنکھوں سے غیظ و غضب کے شعلے نکلنے لگے۔ اس کا جسم وفور غضب سے کانپ کانپ گیا کیونکہ ایک بے سر و سامان اور بے یار و مددگار عورت نے پورے خاندان عباسیہ کی عظمت و شوکت کو للکارا تھا۔ شہزادے نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو عتاب شاہی کی اطلاع دینے کے لیے روانہ کر دیا۔

مغیرہ بھی رات بھر سو نہ سکی تھی۔ اسے علم تھا کہ طلوع ہونے والی صبح کا سورج شاید اس کی بے گور و کفن لاش کے سوا کچھ نہ دیکھ سکے گا۔ اس نے انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ نماز فجر ادا کی۔ اور اللہ کے حضور میں گڑگڑا کر اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے دعا مانگی۔ نماز اور دعا سے فارغ ہو کر اس نے اپنے دونوں معصوم بچوں کو سینے سے لپٹا کر خوب پیار کیا۔ اور کہا میرے بچو! اس جنگل میں اللہ کے سوا تمہارا کوئی حامی و ناصر نہیں ہے۔

اتنے میں شہزادہ عباس کے سپاہیوں نے دستک دی اور یہ پیغام دیا کہ شہزادہ

عباس نے حکم دیا کہ اس کا غصہ تیرے غرور کو خاک میں ملا دے گا۔ اس کے غضب کی آگ تیرے جان و مال کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ شہزادے کے حکم سے یہ مکان ضبط کیا جاتا ہے اور تجھے دو گھنٹے کی مہلت دی جاتی ہے کہ اس مکان کو خالی کر دے۔ مغیرہ یہ پیغام سن کر دروازے پر آئی اور ان سے کہا۔ عباس وہ وقت بھول جائے جب میرے بڑے دادا کا سر ہارون الرشید کے سامنے رکھا گیا اور اس خونِ ناحق کے بعد اس نے خاندان برامکہ کو اناج کے ایک ایک دانے کے لیے محتاج کر دیا تھا مگر میری دادی، ماں اور بہنیں جس طرح ان مظالم کو برداشت کرتی رہی ہیں اس کی داستان ابھی خاندان بنو عباس نے فراموش نہیں کی ہوگی۔ اگر آج وہ پھر ہمارے صبر و استقلال اور تحمل کا امتحان لینے پر مامور ہوا ہے تو کوئی بات نہیں۔ وہ اپنا شوق پورا کر سکتا ہے میں اپنا فرض ادا کروں گی۔ یہ کہہ کر مغیرہ نے ایک معمولی سی چادر اوڑھی اور اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ شہزادہ عباس جبر و تشدد کے ذریعہ اس کا التفات حاصل نہ کر سکا۔ اور بے نیل و مرام واپس آ گیا۔ اس کے بعد عرصۂ دراز تک کسی کو مغیرہ بنت ازرو کی کوئی خبر معلوم نہ ہوئی۔

دوسری صدی ہجری ختم ہونے والی تھی۔ مامون الرشید معمول کے مطابق اپنا دربار سجائے امور سلطنت میں مصروف تھا۔ امرائے سلطنت اور رؤسائے دربار حسب مراتب بیٹھے تھے۔ سلطنت کا ولی عہد شہزادہ عباس، خلیفہ کے پہلو میں متمکن تھا کہ ایک عمر رسیدہ عورت دربار میں فریادی بن کر داخل ہوئی۔ مامون نے اسے طلب کیا اور پوچھا کہ کیا چاہتی ہو؟ اس عورت نے انتہائی خشمناک لہجے میں کہا کہ ایک بیوہ عورت کا مکان صرف اس لیے ضبط کیا جا چکا ہے کہ وہ اپنی عصمت و آبرو کی محافظ تھی۔ خاندان بنو عباس کو یہ ظلم مبارک ہو۔ مگر مامون الرشید! یاد رکھو ایک روز اس شہنشاہ کے حضور بھی پیش ہونا پڑے گا جس کی سلطنت کبھی فنا نہیں ہوتی۔ امیر المومنین! میں ایک ظالم کے

خلاف فریاد لائی ہوں اور آج اس بھرے دربار میں انصاف چاہتی ہوں۔ مامون الرشید کے دربار میں جہاں ہر شخص دم سادھے بیٹھا تھا۔ کسی میں ہونٹ ہلانے کی جرأت نہ تھی۔ اس نامعلوم عورت کی بے باکی اور بے خوفی دیکھ کر سب اس کا منہ تکنے لگے۔

مامون الرشید نے کہا کہ ظالم کا نام بتاؤ۔ وہ کون ہے۔ ہم انصاف کریں گے یہ سن کر عورت ہنسنے لگی اور کہا ظالم۔ آپ کے پہلو میں بیٹھا ہے۔ میں شہزادہ عباس کے خلاف فریاد لے کر آئی ہوں جو اس وقت آپ کے تخت شہنشاہی پر متمکن ہے۔ مامون الرشید کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اس نے چوب دار کو حکم دیا کہ عباس کو اس عورت کے برابر کھڑا کر دو تا کہ دونوں میں امتیاز باقی نہ رہے۔ اس کے بعد مامون نے اس پر جرح شروع کی تو وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکا بلکہ ہر سوال کے جواب میں رک رک کر کوئی ادھوری سی بات کہہ دیتا تھا۔ مغیرہ بنت ازور نے بڑی جرأت کے ساتھ تمام واقعہ بیان کیا۔ اس کے بارعب چہرے سے عظمت اور غیرت ٹپک رہی تھی۔ مغیرہ نے عباس کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

عباس! یہ درست ہے کہ تو مامون الرشید کا بیٹا ہے اور ملک و سلطنت کا مالک بننے والا ہے۔ لیکن یہ کمزور ہاتھ اس وقت کے منتظر تھے جب تو اپنی دھن میں بے خود اور بے قابو ہو کر ایک قدم بھی آگے بڑھتا تو تیری لاش خاک و خون میں تڑپتی نظر آتی۔ آل برامکہ اور ان کی دولت و عزت کو عباسیوں نے پائمال کر دیا مگر ہماری عصمت وہ دولت ہے کہ ہم عباسیہ سلطنت کو بھی اس پر قربان کر سکتی ہیں۔ وزیر دربار نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا کہ ادب سے گفتگو کرو۔ یہ بے باک گفتگو آداب شاہی کے خلاف ہے مگر مامون الرشید نے کہا کہ اس کو مت روکو۔ یہ حق رکھتی ہے کہ جو اس کے منہ میں آئے کہے۔ یہ اس عورت کی صداقت ہے جس نے اس کے حوصلے کو بلند کر دیا ہے اور

اس کی گفتگو کو بے باکی عطا کی ہے اور دوسری طرف عباس کی کمزوری ہے
جس نے اس کی زبان گنگ کر دی ہے۔

اسی وقت مامون الرشید نے خود تخت شاہی سے اتر کر اشرفیوں کی پانچ تھیلیاں اس کے قدموں میں ڈال دیں۔ نہ صرف اس کا وہ جنگل کا جھونپڑا نما مکان واپس کیا بلکہ قصرِ عباس جو ایک عظیم الشان محل تھا۔ مغیرہ کو عطا کیا اور لجاجت سے درخواست کی کہ عباس کا قصور معاف کر دے۔ یاد رہے کہ مغیرہ بنت ازور برمکیوں کے اسی خاندان سے تھی جو ہارون الرشید کے عہد حکومت میں سلطنت کے سیاہ و سپید کا مالک تھا۔ مگر جب ان پر خلیفہ کا عتاب نازل ہوا تو ہارون نے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔

مغیرہ کی اخلاقی عظمت، جرأت و بسالت اور عصمت پرستی میں ایک سچی مسلمان عورت کا کردار جھلک رہا تھا۔

فخر النساء شہدہ بنت ابونصر احمد

"کمالِ فن کا مکمل نمونہ، علوم و فنون کا مجسمہ، فنِ تدریس میں بے نظیر فنِ کتابت اور خوشنویسی میں یکتائے روزگار، بہترین مقررہ اور صاحبِ فضیلت تھیں۔ ہزاروں طلبہ ان کے خرچ پر زیورِ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوئے۔"

شہدہ ۴۸۲ھ میں شہر دینور میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام ابونصر احمد تھا جو اپنے دور کے زبردست عالم اور ممتاز شخصیت تھے۔ فخر النساء کے لقب سے مشہور ہوئیں۔ آپ کے والد کو عباسی خلیفہ نے ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر دینور سے بغداد بلا لیا۔ اور اپنے شاہی ملازمین میں شامل کر لیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی شہدہ نے ایک ایسے پاکیزہ علمی ماحول میں آنکھ کھولی جہاں رات دن علوم و فنون کے چرچے رہتے تھے۔ ہر وقت اصحاب علم و فضل کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اور گھر میں عموماً علمی مسائل کا تذکرہ جاری رہتا تھا۔ شہدہ بچپن ہی سے بہت ذہین، ہوشیار اور عقل مند تھیں۔ کچھ گھر کا ماحول اور کچھ شہدہ کا شوق، بہت جلد علمی مشاغل میں دلچسپی لینے لگیں۔ باپ نے انہیں حدیث اور فقہ کی تعلیم بڑی محنت کے ساتھ دی۔ شہدہ نے فن کتابت بھی اپنے باپ سے سیکھا اور بہت جلد خوشنویسی اور خطاطی میں اتنی ماہر ہو گئیں کہ شہر کے کئی خوشنویس ان سے اصلاح لینے کے لیے آتے تھے۔ آپ کا خط اس قدر پاکیزہ اور خوبصورت تھا کہ دیکھنے والا حروف کے دائروں اور نکتوں وغیرہ کے اعجاز میں

گم ہو کر رہ جاتا تھا۔ اپنے اس کمال فن کی بدولت وہ لوگوں میں شہدہ کاتبہ کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ ان کے حسن تحریر میں ایک جادو پنہاں تھا جس سے ان کے فنی ذوق کی لطافت، بلندی اور سیرت کی خوب صورتی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ مشہور ہے کہ جس کی تحریر میں خوب صورتی ہو اس کی سیرت میں بھی کوئی نہ کوئی حسن ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ شہدہ کے اساتذہ میں ابوالخطاب نصر بن احمد، ابوعبداللہ حسن بن احمد نعمانی، ابوالحسینی، احمد بن عبدالقادر بن یوسف اور ابوبکر محمد بن احمد شاشی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ ان لائق اور یگانۂ روزگار اساتذہ کے فیض صحبت نے انہیں علوم وفنون کے سانچے میں ڈھال دیا۔ وہ اپنے وقت کی بہترین مقررہ، عالمہ اور فاضلہ بن گئیں اور اپنے باپ کی صحیح جانشین ثابت ہوئیں۔ شاہی ملازمت کے بعد ان کے والد بہت خوش حال اور فارغ البال ہو گئے تھے اور دارالسلطنت کے تمام حلقوں میں بہت عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ عزت وشہرت تھی۔ شاہی دربار میں لائق تعظیم خیال کئے جاتے تھے وہ اگر چاہتے تو اپنی قابل فخر اور پیکر علم وفضل بیٹی کو کسی بہت اونچے گھرانے میں بیاہ سکتے تھے جب کہ شہدہ نے سن بلوغ تک پہنچتے ہی کمال فن اور علمی لیاقت میں بہت شہرت حاصل کر لی تھی۔ ملک کے رؤساء اور شہزادے تک ان سے وابستہ ہونا باعث فخر سمجھتے تھے مگر شادی کے معاملے میں نہ شہدہ نے خود یہ تاجرانہ انداز پسند کیا اور نہ ان کے فاضل باپ نے کسی سیاسی یا خاندانی مصلحت کی قربان گاہ پر اپنی ہونہار بیٹی کو بھینٹ چڑھانا گوارا کیا۔ شہدہ کے باپ نے علم وفضل کی اس شہزادی کے لیے اپنے غریب شاگردوں میں سے ایک لائق اور نیک سیرت شخص علی بن محمد کو شادی کے لیے منتخب کیا۔ رؤسائے دربار اور شہزادے شہدہ کو سیم وزر کے انبار تو دے سکتے تھے ہر قسم کے دنیوی اسباب آسائش وراحت تو مہیا کر سکتے تھے بلکہ اسے ہیروں اور جواہرات میں تول کر بھی لے سکتے تھے مگر وہ شہدہ کے لیے ہوس پرست جہلاء سے

زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے۔ وہ شہدہ کو نہیں، اس کے پر شباب حسن و جمال اور اس کے شرف و فضیلت کو اپنی سماجی برتری کے لیے خرید کر اپنے لیے ذریعہ کبر و نخوت بنانے کے سوا اور کیا قدر دانی کر سکتے تھے۔ وہ شان و شوکت اور فخر و تفاخر کے سوداگر ضرور تھے۔ مگر ذوق بلند اور علم و فضل کی گہرائیوں سے بسائی ہوئی جنت میں رہنے کے قابل نہ تھے۔ چونکہ شہدہ کے والد خود بہت بڑی عالمانہ شخصیت کے مالک تھے اور اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ گنج حکمت و فن کا وارث، ان شوکت پرست دنیا داروں اور بوالہوس قسم کے لوگوں سے کہیں زیادہ ممتاز، لائق احترام اور انمول حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ وہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بھی ایک غیر فانی سلطنت کا تاجدار ہوتا ہے جس کی عظمت و رفعت کے سامنے ان کی حیثیت کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ وہ جانتے تھے کہ دولت ہر کس و ناکس کے پاس جمع ہو سکتی ہے۔ دنیوی شوکت اور اعزاز، خوشامد، چاپلوسی، فریب کاری اور ظلم و عدوان سے بھی حاصل ہو سکتا ہے مگر بحر علم کی شناوری ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ یہ عطیہ خداوندی ہر جاہل، اجڈ اور کوڑ مغز کا مقدر نہیں بن سکتا۔ یہ دولت اسی کو ملتی ہے جو اس کا مستحق اور اہل ہو۔ پھر شہدہ خود ایک ایسا ہیرا تھا جو پتھر کے ٹکڑوں اور سنگ ریزوں میں رہنے کے لیے عالم وجود میں نہ آیا تھا بلکہ وہ صرف دنیائے علم و حکمت کو روشنی بخش سکتا تھا۔ چنانچہ شہدہ کے باپ نے اپنی عالمہ اور فاضلہ بیٹی کی رضاء حاصل کر کے اپنے ایک معمولی شاگرد کو یہ اعزاز بخشا۔ وہ اگرچہ بے حیثیت اور غریب تھا۔ مگر علم و فضل اور لیاقت و ہنر مندی کے اعتبار سے شہدہ کے لیے موزوں ترین تھا۔

اس باکمال خاتون نے تحصیل علم سے فارغ ہو کر لوگوں کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا جہاں وہ خود درس دیتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر، فقہ و حدیث اور دیگر علوم دینی میں شہدہ کو اتنی دسترس حاصل ہو چکی تھی کہ لوگ ان کی علمی تقاریر بن کر

مبہوت ہو جاتے تھے۔ وہ ایسے ایسے نکات بیان کرتی تھیں کہ ان کے تبحر علمی پر حیرت ہوتی تھی۔ شہدہ کی درس گاہ اتنی مشہور ہو چکی تھی کہ لوگ اس مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر سند حاصل کرنا ایک قابل اعزاز خیال کرتے تھے حتیٰ کہ حکومت بھی ان کی کوشش و کاوش کو بے حد قدر دانی کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد شہدہ کہ اتنی شہرت ہوئی کہ عباسی خلیفہ المقتضی نے انہیں شرف باریابی بخشا اور ان کے علم و فضل اور قابلیت سے متاثر ہو کر ایک بہت بڑی جاگیر عطا فرمائی۔ شہدہ نے اس کی آمدنی سے دریائے دجلہ کے کنارے ایک عظیم الشان درس گاہ تعمیر کرائی جس میں سینکڑوں طلبہ بیک وقت تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ اس درس گاہ میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے طلبہ کو کھانا، کپڑا اور کتب وغیرہ شہدہ کی طرف سے ملتی تھیں۔ مستحق لوگوں کو مالی امداد بھی دی جاتی تھی اور ان کے تمام مصارف شہدہ خود ادا کرتی تھیں۔ شادی کے پینتالیس برس بعد ان کے شوہر نے وفات پائی۔ مشہور ہے کہ شہدہ نے اتنی علمی فضیلت، مرتبہ و حیثیت اور شہرت و ناموری کے باوجود عمر بھر اپنے خاوند کی بے پناہ خدمت کی۔ وہ اپنے شوہر کی تمام ضروریات کا خود خیال رکھتی تھیں اور ہر وقت ان کے آرام و آسائش میں منہمک رہتی تھیں۔ اپنے شوہر سے والہانہ محبت ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔ اور لوگ اکثر ان کی مثال دیا کرتے تھے۔ خاوند کی موت تک شہدہ اسی راستے پر گامزن رہیں اور انہوں نے اپنے گھر کو جنت ارضی کا نمونہ بنائے رکھا۔ شہدہ کی یہی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے لوگ انہیں فخر النسا کے نام سے یاد کرتے تھے اور ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے شہدہ نے ۵۷۴ھ میں جب کے نوے برس کی عمر پا چکی تھیں۔ بغداد میں وفات پائی اور تادم آخر تعلیم و تدریس کا سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری رکھا۔

شہدہ پہلی مسلمان خاتون تھیں جنہوں نے اپنی کوششوں اور بے پناہ محنت سے بغداد میں ایک شاندار یونیورسٹی قائم کی اور عمر بھر اپنے خرچ سے اسے چلا دیا۔ اس کا

دل چسپ پہلو یہ تھا کہ اس درس گاہ میں ہزاروں مردوں نے تعلیم حاصل کر کے بڑا نام پایا اور صف اول کے فقہا اور علماء میں شمار ہوئے۔ ان گنت مردوں کو ان کی شاگردی پر فخر تھا۔ ایک عرصے تک شہدہ کی دی ہوئی سندات کو علمائے عصر بطور حوالہ پیش کرتے تھے۔ اور فخریہ کہا کرتے تھے کہ ہم نے شہدہ کی درسگاہ سے علم و حکمت کے موتی رولے ہیں۔

وہ بزرگ آخر ایسی ہی درس گاہوں سے نکل کر شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچے۔ جن کی علمی کاوشوں اور عرق ریزیوں کو آج بھی یورپ سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ اسلام نے عورت کو کہاں سے اٹھا کر کہاں پہنچا دیا تھا اور وہ کونسا بلند مرتبہ تھا جو ایک مسلمان عورت حاصل نہ کر سکی۔

شہدہ نے دنیائے علم و حکمت پر حکومت کرنے کے باوجود جس ایثار و قربانی کی مثال قائم کی اور انہوں نے جس طرح اپنی زندگی اور صلاحیتوں کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ ہماری خود پرست بہنوں کے لیے ایک روشن مثال ہے۔ شہدہ کی زندگی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مسلمان عورت ہر حال اور ہر حیثیت میں اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے راستے سے سر مو انحراف پسند نہیں کرتی۔ وہ اپنی ملت کی خدمت، اپنی قوم کی تعمیر اور اسلام کی سر بلندی کے لیے ہی زندہ رہتی ہے۔ وہ اپنے قومی فرائض انجام دینے کے باوجود اپنے گھریلو فرائض کو بھی کبھی فراموش نہیں کرتی خواہ وہ ملک کی بہت بڑی یونیورسٹی کی چانسلر ہی کیوں نہ ہو۔ شہدہ کے بعد ساتویں صدی ہجری کی ایک خاتون بنت خدا دیروی کو کتابت اور خوشنویسی میں شہرت حاصل ہوئی حالانکہ اس کے دونوں ہاتھ کٹے ہوئے تھے مگر وہ پاؤں سے کتابت کرتی تھی۔ حکومت مصر نے اس کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ بنت خدا دیروی کا مقبرہ اسکندریہ میں اب بھی موجود ہے۔

ام الکلام حفصۃ المرکینہ

ایک شعلہ نوا خطیبہ اور ایک آتش بیان مقررہ تھیں۔
فصاحت و بلاغت اور جوش و خروش کا بحرِ بے کراں تھیں۔
ان کا دل ملت کے درد سے معمور تھا۔ فیاضی اور سخاوت کی
ایک مثال تھیں۔

حفصۃ المرکینہ کے ابتدائی حالات معلوم نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عہد موحدین میں موجود تھیں۔ ابو یوسف منصور باللہ کے دور خلافت میں اندلس کے مشہور شہر اشبیلیہ میں ۵۸۴ھ میں وارد ہوئیں۔ مرکینہ بے حد نیک، عبادت گزار، پاک سیرت، پرہیز گار اور خدا پرست خاتون تھیں۔ خود عالمہ تھیں اور علم دوست تھیں۔ فیاضی اور سخاوت کی ایک روشن مثال تھیں۔ کافی دولت مند اور صاحب حیثیت تھیں مگر اپنی تمام دولت غریبوں، مسکینوں محتاجوں اور دکھی لوگوں پر خرچ کیا کرتی تھیں۔

حفصۃ المرکینہ کی شہرت اور ناموری اور بے پناہ ہر دلعزیزی کا باعث ان کا زور خطابت تھا۔ وہ اپنے عہد کی ایک بے نظیر خطیبہ اور آتش نوا مقررہ تھیں۔ فصاحت و بلاغت اور کمال خطابت میں لاجواب خیال کی جاتی تھیں اور پورے اندلس میں کوئی ان کا ہمسر اور ہم پایہ نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ جب تقریر کرنے کھڑی ہوتی تھیں تو مجمع مسحور و

مبہوت ہو جاتا تھا۔ ان کی قادرالکلامی اور فصاحت لوگوں کو بتوں کی طرح ساکت و جامد بنا دیتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے فصاحت و بلاغت اور روانی کا ایک پرشور دریا بہہ رہا ہے۔ جس کی موجوں پر سب بہے جا رہے ہوں انہیں اسلام سے والہانہ محبت تھی۔ اللہ اور رسول ﷺ سے دیوانہ وار عشق رکھتی تھیں۔ دل میں مسلمانوں کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور ملت کی معمولی سی تکلیف انہیں بری طرح سے بے چین اور مضطرب کر دیتی تھی۔ ان کی تقریر کا سب سے بڑا وصف یہی خلوص تھا جس کا دامن ہر حال میں صداقت سے وابستہ رہتا تھا۔ بہت نڈر، بے باک اور بے خوف تھیں۔ وہ حکومت کے بڑے بڑے افسروں اور خلیفۂ وقت کا بھی احتساب کرتی تھیں۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ کسی سرکاری عالم یا عہدے دار نے کوئی غلط کام کیا ہے یا مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت میں کوتاہی کی ہے تو ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا تھا۔ پھر اس پرشور طوفانِ خطابت میں ان لوگوں کو اپنی ہستی ایک شکستہ اور ڈوبتے ہوئے جہاز کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ قومی محبت اور مسلمانوں کے درد کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ عیسائیوں نے اندلس کے ایک صوبے پر حملہ کر کے کئی شہروں اور قصبات کو تباہ و برباد کر دیا۔ مردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کے گھروں اور کھیتوں کو جلا دیا۔ انہوں نے کئی دن تک قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم رکھا ان بے پناہ مظالم کی خبر جب دارالخلافہ میں پہنچی تو چاروں طرف ایک کہرام مچ گیا۔ لوگ جوش و خروش اور غم و غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ جب مرکینہ کو اس دلدوز حادثہ کی اطلاع ملی تو غصے سے چہرہ تمتما اٹھا۔ انہوں نے فوراً شبیلیہ میں ایک فقیدالمثال عام جلسہ منعقد کیا جس میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں شریک ہوئے مرکینہ نے اس جلسہ میں ایسی پرجوش تقریر کی کہ لوگ اسی حالت میں جہاد پر روانہ ہونے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اندلس کے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور چاروں

طرف ایک آگ سی لگا دی۔ اس موقع پر مرکینہ نے اندلس کے بازاروں میں جو تقریریں کیں اگر آج وہ پوری طرح محفوظ ہوتیں تو فن خطابت کا انمول سرمایہ قرار دی جاتیں۔ سلطان اس وقت مراکش میں مقیم تھا۔ حفصۃ المرکینہ نے فوراً ان کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا اور لکھا کہ اے امیر المومنین! عیسائی وحشیوں نے سلویس، سرے، دور، اور بیجا کے مسلمانوں کو انتہائی بے رحمی اور سنگ دلی سے ذبح کر ڈالا ہے۔ کیا ان بد نصیب مظلوم مسلمانوں کی چیخیں اور آوازیں آپ کے کانوں تک نہیں پہنچیں۔ آپ ہمارے سلطان ہیں اور مسلمانوں کی جان و مال کے محافظ ہیں۔ قیامت کے دن جب آپ سے اتنے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے ظالمانہ قتل سے متعلق سوال کیا جائے گا تو آپ کیا جواب دیں گے؟ یہ خط پڑھتے ہی سلطان نے گورنر کو ایک زبردست فوج تیار کرنے کا حکم دیا۔ مرکینہ پہلے ہی اندلس کے طول وعرض میں جہاد کا بے پناہ جوش پیدا کر چکی تھیں اور لوگ شوق شہادت میں سر کٹانے کے لیے بے تاب و مضطرب پھر رہے تھے۔ اندلس کے کوچہ و بازار میں ''الجہاد'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اور ہر سمت بے پناہ جوش پھیلا ہوا تھا۔ جب سرکاری طور پر اسلامی فوج میں شمولیت کا فرمان نافذ ہوا تو لوگ جوق در جوق لشکر میں شامل ہونے کے لیے جانے لگے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے پورا اندلس کفن بردوش ہو کر میدان جہاد میں نکلنے کے لیے بے قرار ہے۔ مرکینہ کی پر جوش تقریروں نے اندلس کے ہر گھر میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک عظیم الشان لشکر جرار تیار ہو گیا۔ چونکہ گورنر نے منتخب لوگوں کو جہاد میں شرکت کی اجازت دی تھی اس لیے بے شمار لوگ دلی تمنا کے باوجود اس سعادت سے محروم رہے۔ مسلمانوں کا یہ پر جوش لشکر جس کے کانوں میں مرکینہ کے سحر آلود الفاظ طبل جنگ بن کر گونج رہے تھے۔ عیسائی ٹڈی دل سے ٹکرایا اور ایک خونریز جنگ کے بعد عیسائیوں کو عبرت ناک شکست ہوئی۔ فتح کی خوش خبری ملتے ہی

سلطان نے حفصۃ المرکینہ کو لکھا کہ میں نے عیسائیوں کی آہ وبکا کی صدائیں یہاں بیٹھ کر سنی ہیں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ یہ آوازیں تم نے بھی ضرور سنی ہوں گی۔ مجھے امید ہے کہ اب تمہارے دردمند اور بے چین دل کو قرار آ گیا ہوگا۔ مسلمانوں نے مظلوم شہیدوں کے خون کا بدلہ لے کر اپنی ملی غیرت کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

ذرا اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑایئے کہ ہماری فیشن پرست اور آرائش و زیبائش کی الجھنوں میں گرفتار بہنوں میں اس وقت کتنی حفصۃ المرکینہ ہیں؟ کتنی ایسی خواتین ہیں جو دولت وثروت کے ہوتے ہوئے بھی مرکینہ کی سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتی ہوں؟ جن کی دولت دوسروں کو دکھوں اور مصائب سے آزاد کرانے میں صرف ہو رہی ہو؟ کتنی ایسی عورتیں ہیں جن کے قلوب میں قوم اور ملت کی ایسی بے مثال تڑپ موجود ہے؟ ہماری ان بہنوں کی تعداد کتنی ہے جو نمائشی سرگرمیوں اور نام و نمود کی بیماری سے دور رہ کر ملک وقوم کی اس طرح خلوص وصداقت کے ساتھ خدمت کر رہی ہیں؟ آخر مرکینہ بھی آپ کی طرح ایک مسلمان عورت تھی، اسے قدرت نے جادو بیانی اور آتش نوائی کا وصف عطا فرمایا تھا اور اس ام الکلام نے اپنی صلاحیت سے قوم کو بیدار کرنے، ان میں جوش عمل پیدا کرنے اور زندگی کی نئی روح پھونکنے کا کام اس طرح لیا کہ آج بھی تاریخ اس کے نام کو اپنے دل میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔

شہزادی امینہ بنت محمد

ایک بہادر اور غیرت مند خاتون جس نے چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بھی اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کی۔ جس کے ضمیر کو خریدا نہ جا سکا۔ جس کی عصمت ہیرے اور جواہرات میں نہ تل سکی۔ تو اسے زندہ جلا دیا گیا۔

امینہ دولت ہسپانیہ کے بانی اموی خاندان سے تھی۔ باپ کا نام شہزادہ محمد بن امیہ تھا۔ جسے عیسائیوں نے اندلس پر قبضہ کرنے کے بعد زبردستی عیسائی بنا لیا تھا۔ شہزادہ محمد عیسائیوں میں فردی نانڈو کے نام سے مشہور تھا۔ عراق، شام، حجاز اور دیگر ملحقہ علاقوں میں بنو امیہ کے زوال کے بعد جب عباسی خاندان برسر اقتدار آیا تو ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن الداخل کسی نہ کسی طرح جان بچا کر ہسپانیہ کی طرف بھاگ گیا اور وہاں اس نے ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جس کی بے مثال عظمت و شوکت اور حشمت و سطوت آج بھی تاریخ عالم کے صفحات میں جگمگا رہی ہے اور عجوبۂ عالم عمارت کئی سو سال تک بڑی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کے ساتھ حکومت کی مگر بعد میں باہمی انتشار و تفریق اور ریشہ دوانیوں کے باعث ان کے زوال اور انحطاط کا دور شروع ہوا تو عیسائیوں نے آہستہ آہستہ ہسپانیہ کے تمام شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت ابو عبداللہ اندلس کے تخت حکومت پر متمکن تھا۔ جس نے لاچار و بے بس ہو کر

ملک عیسائی شہنشاہ کے سپرد کر دیا۔ اور خود ذلت وخواری کے عالم میں اپنے آباؤ اجداد کے آباد کیے ہوئے بے نظیر اور خوبصورت شہروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا ہسپانیہ سے نکل گیا۔ اندلس سے مسلمانوں کا دردناک اخراج تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ جس کی تفصیلات پڑھ کر آج بھی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عیسائیوں نے ملک پر قبضہ کرتے ہی چاروں طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ شہزادیوں اور بیگمات حرم کو سر بازار رسوا و ذلیل کیا۔ مسلمان عورتوں کی آبروریزی کی گئی اور بے شمار انسانوں کو انتہائی بہیمانہ طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ سرزمین اندلس مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بن گئی۔ اور ہر طرف مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ عالیشان تاریخی مسجدوں کو گرجوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور ان درندوں نے مسلمانوں کی عظمت وشوکت کا ایک ایک نشان مٹانے کے لیے ہر بڑے سے بڑا ظلم روا رکھا۔ لاکھوں بے گناہ مسلمانوں کو نشانہ ستم بنایا گیا صرف اس کو زندہ رہنے کی اجازت دی گئی جس نے مجبور ہو کر اپنا مذہب تبدیل کر لیا یا ان کی غلامی کا طوق لعنت زیب گلو بنا لیا۔ شہزادہ محمد بھی ان بدنصیب افراد میں سے تھا۔ جنہوں نے مسلسل جبر و تشدد سے تنگ آ کر کسی مناسب گھڑی کے انتظار کے لیے مجبوراً فاتح شہنشاہ کا مذہب قبول کر لیا۔ امینہ اسی بدقسمت شہزادے کی بیٹی تھی جو اس وقت بہت کم سن تھی۔ فاتح فوج کے سپاہیوں نے معصوم شہزادی کو زبردستی اغوا کر کے باپ سے جدا کر دیا اور اس کا نام اسبیلہ رکھ دیا۔ ننھی امینہ کو کچھ عرصہ بعد عیسائیوں کے ایک مذہبی سکول میں تعلیم و تربیت کے لیے بھیج دیا گیا تاکہ وہ اپنے مذہب اور اپنے ماضی سے بالکل بے تعلق ہو کر پرورش پا سکے۔ امینہ نے اسبیلہ کے نام سے اس رومن کیتھولک گرجے میں تمام بچپن بسر کیا اور وہیں سن بلوغ کو پہنچی تو ہسپانیہ کے عیسائی حکام نے اسے کنیز بنا کر اپنی ملکہ کے دربار میں بطور تحفہ پیش کرنا چاہا۔ اگرچہ امینہ کو اس کے

مذہب اور سرپرستوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا تھا۔ مگر عیسائی اس کا کوئی علاج نہ کر سکے کہ اس غیور شہزادی کی رگوں میں ایک غیرت مند عرب خاندان کا خون گردش کر رہا تھا۔ جوان ہوتے ہی اس میں وہ تمام اوصاف ظاہر ہونا شروع ہو گئے جو اس کے حکمران خاندان کا طرۂ امتیاز تھے۔ وہ فطری طور پر بے حد غیور، شجاع، نڈر اور عصمت مآب ثابت ہوئی۔ عیسائی حکام نے اسے ملکہ کی خدمت گار بنانے کے لیے بڑے بڑے لالچ دیئے۔ ہر ممکن طریقے سے ڈرایا دھمکایا اور مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ اس پر بے پناہ سختیاں کی گئیں اور تکالیف میں مبتلا کیا گیا مگر امینہ نے یہ حیثیت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ کنیز بننے پر موت کو ترجیح دے گی۔ اندلس کے عیسائی حکام اسے وہاں رکھنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس کا باپ بھی اسی شہر میں موجود تھا اور دوسرے کئی لوگ بھی اس راز سے اندرونی طور پر آگاہ تھے۔ اس لیے انہیں خطرہ تھا کہ امینہ کو کسی طرح صحیح صورت حال سے آگاہ ہونے کا موقع نہ مل جائے۔ دوسری طرف الحمراء کا گورنر جان الوریز شہزادی کے حسن و جمال کو ہوس بھری نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اس کی ہر ممکن کوشش یہ تھی کہ اگر شہزادی امینہ ملکہ کے دربار میں جانا پسند نہیں کرتی تو قصر الحمراء میں اس کی داشتہ بن کر رہنا قبول کرے مگر امینہ ایسی غیرت مند اور باعصمت دوشیزہ اس ذلت کو کیسے قبول کر سکتی تھی۔ جب وہ لوگ کسی طرح امینہ کو اپنے ڈھب پر نہ لا سکے تو انہوں نے اس بے کس و مجبور لڑکی کو قصر الحمراء کے ایک کمرے میں نظر بند کر دیا اور اس کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ اسی زمانے میں اندلس کے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے عرب مسلمانوں نے عیسائی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ ہسپانوی فوج چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑی اور لاکھوں کی تعداد میں مسلح سپاہیوں نے ان مجاہدین کو گھیرے میں لے کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان کی جھونپڑیاں اور خیمے تک جلا دیئے گئے اور جو مسلمان بھی سامنے آیا اسے

موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ امینہ کا باپ محمد بھی اسی جنگ میں کام آ گیا۔ اور ہسپانوی سپاہیوں نے غداری کی سزا کے طور پر اس کا سرتن سے جدا کر کے نیزے پر چڑھا دیا اور اسے اپنے سپہ سالار کے پاس بھیج دیا۔ شہزادہ محمد کے ایک وفادار ساتھی یعقوب نے جو مذہب کے لحاظ سے یہودی تھا یہ خبر سنی تو اسے بہت صدمہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شہزادہ محمد اندرونی طور پر اندلس میں اسلامی اقتدار بحال کرنے کے لیے تدابیر سوچتا رہتا تھا اور کسی مناسب موقع کے انتظار میں زندہ تھا یعقوب کو شہزادی امینہ کے اغوا اور حراست کا پورا علم تھا وہ اسی وقت شب کی تاریکی میں قصر الحمراء پہنچا تو دربان نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ یعقوب نے اسے رشوت دے کر اندر جانے کی اجازت حاصل کر لی اور شہزادی امینہ کو اس کے کمرے میں ملا۔ شہزادی امینہ نے اسے بتایا کہ وہ جنوبی پہاڑیوں میں برپا ہونے والی بغاوت سے باخبر ہے اور اسے یہ بھی علم ہے کہ یہ جنگ ہسپانوی فوج اور مسلمان عربوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ شہزادی نے یعقوب کو اپنے احساسات سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس دوران نہ جانے کیوں بے اختیار اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ مسلمان باغیوں کی امداد کے لیے محاذ جنگ تک پہنچ جائے حالانکہ وہ رومن کیتھولک عیسائی تھی مگر وہ حراست میں ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکی۔

یعقوب نے اسے کہا کہ بیٹی! تم نہ ہسپانوی ہو اور نہ کیتھولک عیسائی۔ بلکہ تم ایک مسلمان لڑکی ہو۔ اندلس کے حکمران خاندان بنوامیہ کی شہزادی ہو۔ تمہارے باپ کا نام محمد بن امیہ ہے۔ جسے بزور طاقت عیسائی بنالیا گیا تھا اور وہ فرڈی نانڈو کے نام سے مشہور تھا۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا تھا کہ تمہارا باپ اس جنگ میں قتل ہو چکا ہے۔ یعقوب نے شہزادی امینہ کو اس کے اغوا اور گرجے میں تربیت کا تمام واقعہ سنا دیا اور بتایا کہ اس کا نام اسیلہ نہیں بلکہ امینہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تم اس کمرے میں تنہا بند ہو اور کسی شخص کو تم سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ شہزادی امینہ کو یہ سن کر سخت صدمہ ہوا کہ وہ اپنے

مذہب سے محروم کر دی گئی ہے اور اپنی قوم سے علیحدہ ان درندوں کی قید میں پڑی ہے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے باپ کی موت کا بھی بہت افسوس ہوا۔ اس نے یعقوب کو بتایا کہ الحمراء کا گورنر جان الوریز اس کی عزت و ناموس پر ڈاکہ ڈالنے کی فکر میں ہے اور ہر وقت اسے پریشان کرتا رہتا ہے۔ امینہ نے یعقوب کو یہ بتایا کہ اب جان الوریز جبر و تشدد پر اتر آیا ہے اس لیے وہ اپنی آبرو بچانے کے لیے جلد از جلد قصر الحمراء سے نکل جانا چاہتی ہے۔ یعقوب نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ شہزادی امینہ نے اسے رازدارانہ لہجے میں کہا کہ میں نے اس دیوار میں ایک سوراخ بنالیا ہے مگر یہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا آج رات میں اسے مکمل کرلونگی تم گھوڑے لے کر باہر میرا انتظار کرنا۔ یعقوب بہت نیک اور وفادار شخص تھا اس نے شہزادی کے حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا۔ امینہ نے رخصت ہوتے وقت اس کا خنجر بھی حفاظت کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کے بعد جان الوریز شہزادی امینہ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے جبر و تشدد کے ذریعہ شہزادی امینہ کی غیرت اور شجاعت کا امتحان لینے کی کوشش شروع کی تو دوسرے لمحے یعقوب کا دیا ہوا خنجر الوریز کے سینے میں پیوست ہو چکا تھا اور اس کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔ شہزادی امینہ نے اطمینان سے خنجر نکال کر صاف کیا اور باہر نکل گئی۔ قصر الحمراء کے باہر یعقوب گھوڑے لیے اس کا منتظر تھا۔ دونوں ہسپانیہ کی سرحد سے نکل جانے کے لیے تیزی سے سفر کرنے لگے۔ مگر صبح کے وقت ساحل سے قدرے فاصلے پر ہی گرفتار کر لیے گئے۔ کیونکہ ہسپانوی فوج کو علی الصباح ہی اپنے گورنر کے قتل کا علم ہو گیا تھا۔ اور انہوں نے جنوبی بستیوں میں ہرکارے دوڑا دیئے تھے۔ ان دونوں کو گرفتار کر کے غرناطہ لایا گیا۔ ہسپانیہ کی ظالم عدالت نے یعقوب کی کھال کھینچنے اور شہزادی امینہ کو زندہ جلا دینے کا حکم دیا۔

شہزادی کے لیے ایک دہشتناک الاؤ تیار کیا گیا۔ اور وہ زنجیروں میں جکڑ کر وہاں لائی گئی۔ اس اندوہناک منظر کا تماشا دیکھنے کے لیے شہر کے ہزاروں مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ شہزادی کو ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا گیا اور چشم زدن میں آگ

کے سرکش شعلے موت کا رقص بن کر اس کے گرد ناچنے لگے۔ شہزادی امینہ نے مرنے سے قبل تماشائیوں سے مخاطب ہو کر انتہائی مؤثر انداز میں کہا۔

تم میرا جسم تو جلا کر راکھ کر سکتے ہو مگر میری روح کو نہیں جلا سکتے۔ میری روح ہمیشہ زندہ رہے گی۔ میرے نہاں خانۂ دل کے اندر اب جو شمع ہدایت روشن ہو چکی ہے اسے تمہاری جلائی ہوئی آگ کے شعلے نہیں بجھا سکتے یہ شمع میری راکھ کے ہر ذرے میں قیامت تک جلتی رہے گی۔ میں اس دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ میرا گھر جنت میں ہے مگر اے ظلم وعدوان کے سانچے میں ڈھلے ہوئے درندو! بہت جلد تمہاری باری میں آنے والی ہے اور تمہیں ان جرائم کی عبرت ناک سزا ملے گی جن کا ارتکاب تم ہسپانیہ کی حسین وجمیل سر زمین پر کر رہے ہو۔ میں اس آگ کو خوشی سے قبول کرتی ہوں کیونکہ دوزخ کی آگ کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد آگ کے تند و تیز شعلوں نے شہزادی امینہ کو اپنی لپیٹ میں لے کر ہمیشہ کے لیے دنیا کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا مگر اس بہادر اور عصمت مآب دوشیزہ کی خاک کا ہر ذرہ آج بھی اس حقیقت کا اعلان کر رہا ہے کہ مسلمان عورت کی عصمت و ناموس کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں خرید سکتی۔ وہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھر کر بھی اپنی آبرو کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ وہ ایک بہادر اور شجاع کی موت مرنا اپنے لیے باعث سعادت سمجھتی ہے۔ مگر بدی کی طاقت کے سامنے سر جھکانا کسی صورت گوارا نہیں کرتا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا ہے تو یقین کر لو کہ وہ مسلمان کہلانے والی عورت اسلام پر ایک تہمت بن کر زندہ ہے۔ اس کے جسد مردہ میں اسلام کی روح نہیں بلکہ کچھ اور ہے جس کا ایک سچی مسلمان عورت کی زندگی سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔

حمیدہ بانو بیگم

وہ بہادر اور شیر دل خاتون جو قومی ابتلاء کے وقت آہن پوش ہو کر میدانِ جنگ میں نکلی۔ جس کی پُر جلال آواز اور حق گوئی نے سلطان تیمور اور اس کے فوجی افسروں پر سکتے کا عالم طاری کر دیا۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں
(اقبال)

اصل نام امتہ الحبیب تھا۔ ایرانی نژاد تھیں۔ ان کا باپ یزدانی مشہور ترک شہنشاہ بایزید کی فوج کا ایک نامور جرنیل تھا۔ ترکستان میں پیدا ہوئیں اور اپنے جنگجو باپ کے زیر سایہ تربیت حاصل کی۔ امتہ الحبیب کو بچپن ہی سے شہسواری اور فن سپہ گری میں مہارت حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا چنانچہ انہوں نے ایک سپاہی عورت کی طرح عسکری تربیت حاصل کی اور نوعمری کے زمانے میں ہی کئی حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ چنانچہ امتہ الحبیب کو بھی اپنے باپ کی زیر کمان فوج میں افسر مقرر کر دیا گیا۔ امتہ الحبیب اپنی بہادری، شجاعت اور اولوالعزمی، جرأت اور شرافت کی وجہ سے فو

ج میں بے حد عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ سب لوگ ان کے پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کے معترف تھے۔ ایک دفعہ امیر تیمور کی خونخوار فوج نے عذاب الٰہی بن کر بایزید کی سلطنت کو گھیر کر پائمال کرنا شروع کر دیا۔ بایزید کی فوجیں میدان جنگ میں بڑی بہادری اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کرتی رہیں۔ مگر انتہائی خونریز جنگ کے بعد ترکوں کو شکست فاش ہوئی۔ امتہ الحبیب اپنے بہت سے بہادر سپاہیوں اور جان نثاروں کے ساتھ زندہ گرفتار کر لی گئیں۔ بایزید نے سلطنت ہاتھ سے جاتے دیکھ کر عجز و انکساری سے صلح کی پیش کش کی اور امیر تیمور سے درخواست کی کہ وہ مزید خونریزی بند کر کے مناسب شرائط پر صلح کرے مگر تیمور اس وقت فتح کے نشے میں چور تھا اس نے بڑی بے اعتنائی سے بایزید کی یہ درخواست ٹھکرا دی اور دوسرے دن تمام ترک سپاہیوں اور افسروں کے قتل عام کا حکم صادر کر دیا۔ امتہ الحبیب نے امیر تیمور کا یہ حکم سنا تو انہیں سخت طیش آیا۔ ایک بہادر اور شیر دل خاتون کے لیے اس طرح ذلت اور بے بسی کی موت مرنے کا خیال بہت اذیت ناک تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مرنے سے پہلے ایک مرتبہ امیر تیمور کے ظلم و تشدد اور سنگ دلی کے خلاف ضرور سخت ترین الفاظ میں احتجاج کریں گی تاکہ وہ حقیقت سے آشنا ہو سکے کہ اس طرح ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنا شجاعت اور بہادری کی توہین ہے۔ چنانچہ وہ اسی طرح مردانہ فوجی لباس میں امیر تیمور کے دربار میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔ امیر تیمور نے اپنے افسروں اور درباریوں سے مشورہ کے بعد انہیں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی اجازت دی۔ امتہ الحبیب نے انتہائی جرأت اور بے باکی سے امیر تیمور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اے شہنشاہ! تو نے بایزید پر کسی تقصیر اور گناہ کے بغیر بلاوجہ چڑھائی کر کے ہزاروں انسانوں کو خاک و خون میں تڑپایا ہے اچھی طرح سمجھ لے کہ یہ ایک

ایسا سنگین جرم ہے جو قدرت کبھی معاف نہیں کرے گی۔ تو نے ستر ہزار بے گناہ ترکوں کو فریب دے کر سرنگ کے ذریعہ اڑا دیا۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تیرے دل میں ندامت کی ایک معمولی سی لہر بھی پیدا نہ ہوئی۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ترکوں کا قتل نہیں ہے بلکہ تو اسلام کی جڑوں کو کھود رہا ہے۔ کیا تو بتا سکتا ہے کہ کسی بھی آسمانی شریعت یا دنیا کے قانون میں مسلمانوں کو اس قدر بے رحمی اور سنگ دلی سے موت کے گھاٹ اتارنا جائز ہے؟ بایزید نے نہایت عجز و فروتنی کے ساتھ تجھے صلح کا پیغام دیا کہ یہ سرزمین اور زیادہ مسلمانوں کے خون سے لالہ زار نہ بنے۔ مگر فتح مندی کے غرور اور قوت کے نشے نے تجھے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ تو اس درخواست پر سنجیدگی سے غور کر سکے۔

اے فاتح شہنشاہ! ہماری مانند ایک روز تیری زندگی کا پیمانہ بھی لبریز ہونے کو ہے اور تجھے بھی اس دنیائے فانی سے منہ موڑ کر ایک دن ایک بڑے شہنشاہ کے دربار میں کھڑا ہونا ہے۔ جب وہ شہنشاہوں کا شہنشاہ تجھ سے پر غضب ناک لہجے میں ان مظلوموں کی بابت سوال کرے گا تو تیرے پاس کیا جواب ہوگا؟ تو اس کی قہاری اور جباری سے کیسے بچ سکے گا؟ دنیا کی کون سی طاقت تجھے اس کے عتاب سے بچا سکے گی کیا یہ خونخوار سپاہی اس وقت بھی تیرا ساتھ دیں گے؟ کیا ان کی خون آشام تلواریں اس وقت تیری لیے ڈھال بن سکیں گی؟ اے امیر! آج تک ہم نے مظلوم اور بے گناہ قیدیوں پر بہادروں کی تلواروں کو موت کی بجلی بن کر گرتے نہیں دیکھا۔ ہم بے بس قیدی ہیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہایت بزدلانہ اور نفرت انگیز حکم ہے کہ اس بے کسی اور بے بسی میں تو نے

ہمارے قتل کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے بعد امۃ الحبیب نے وفور جوش میں اپنا آہنی خود اتار کر زمین پر پٹخ دیا اور کہا کہ اے سلطان! میری طرف دیکھ میں ایک کمزور اور ناتجربہ کار عورت ہوں۔ کیا تو اندازہ نہیں کرسکتا کہ جس قوم کی عورتیں اتنی بے باک اور بہادر ہیں ان کے مرد شجاعت و دلیری میں کیسے ہوں گے۔

ایک شیر دل خاتون کو فوجی لباس میں ملبوس اس طرح بے خوفی سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھ کر سلطان تیمور کے دربار پر سناٹا چھا گیا کیونکہ اس وقت امۃ الحبیب ایک ایسے شخص کے سامنے کھڑی تھی جس کے ایک اشارۂ ابرو پر ہزاروں انسان موت کے آغوش میں سلا دیئے جاتے تھے جس کا ایک اشارہ سینکڑوں جنگجو مردوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ وہ سلطان تیمور کے سامنے کھڑی تھیں جس کی ہیبت سے دنیا بھر کے حکمرانوں کا زہرہ آب ہوتا تھا۔ جس کا ذکر سن کر سینوں میں دل کانپ کانپ جاتے تھے۔ وہ امیر تیمور جس کے سامنے اس کے اپنے بہادر فوجی افسر خزاں زدہ پتے کی طرح زرد ہو جاتے تھے۔ امۃ الحبیب کی یہ مجاہدانہ گفتگو سن کر خود امیر تیمور مبہوت ہو گیا اور اس کی صاف گوئی نے سلطان کو حیرت زدہ کر دیا وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا اور پھر امۃ الحبیب اور اس کے سپاہیوں کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ امیر تیمور نے اسی وقت امۃ الحبیب کے باپ کے پاس شادی کا پیغام بھیجا جسے منظور کر لیا گیا۔ اور امۃ الحبیب سلطان تیمور کے نکاح میں آ گئیں۔ شادی کے بعد امیر تیمور نے انہیں حمیدہ بانو بیگم کا خطاب دیا اور شہنشاہ بیگم کہلائیں۔ ان سے امیر تیمور کے کئی بچے ہوئے مگر زندہ نہ رہے۔ امۃ الحبیب صرف ایک شجاع اور بہادر خاتون ہی نہ تھیں بلکہ وہ بے حد علم دوست اور دانش مند تھیں۔ انہوں نے کئی ایک کتابیں بھی تصنیف کیں جو محفوظ نہ رہ سکیں۔ سن ۸۰۷ھ میں جب امیر تیمور کا انتقال ہوا تو حمیدہ بانو

بیگم زندہ تھیں۔ خاوند کی وفات کے بعد سوتیلے بیٹے نے انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔ آخر انہوں نے بیٹے کے مظالم سے تنگ آ کر طفلس میں قیام کیا مگر وہاں بھی انہیں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا تو قسطنطنیہ اٹھ آئیں اور اکسٹھ برس کی عمر میں وہیں انتقال کیا۔

حمیدہ بانو بیگم کی زندگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ گئے گذرے دور میں بھی ایک ایسی سچی خاتون جس نے مسلمانوں کے گھرانے میں تربیت حاصل کی ہو کبھی ذلت ونکبت کے سامنے سر جھکانا گوارا نہیں کرتی۔ موت اس سامنے کھڑی ہو کر مسکراتی ہے مگر وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صداقت شعاری اور حق گوئی کی اسلامی روایت کو نئی زندگی عطا کر دیتی ہے۔ اسے امیر تیمور ایسے جابر و قاہر شہنشاہ کی ہیبت و سطوت بالکل مرعوب نہ کر سکی۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں ہر سمت دشمنوں کی تلواریں بے نیام نظر آ رہی تھیں اور جہاں اس کی گونجتی ہوئی آواز کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا بالکل معمولی بات تھی۔ ایک زنجیروں میں جکڑی ہوئی قیدی عورت کس دلیری کے ساتھ اعلان حق کرتی ہے۔ حمیدہ بانو بیگم نے اس فاتح شہنشاہ کے دربار میں اسلام دوستی اور قوم پروری کی ایسی مثال قائم کی جس پر آج تک تاریخ فخر کرتی ہے۔ اس نے اپنی قوم کی عظمت کو چار چاند لگا دیئے اور ترکوں کا سر بہت بلند کر دیا۔

کہاں ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ عورت کمزوری اور مکروفریب کا دوسرا نام ہے ایک معمولی مسلمان عورت کا وجود اس الزام کی مجسم تردید ہے۔

ہمارے وطن کی عظمت کا بلند ترین تصور بھی ہماری بہنوں کے ایسے ہی کردار کا منتظر ہے۔ اس کردار کا قصر عظیم صرف سچائی، صداقت، جرأت اور خدا پرستی کی بنیادوں پر تعمیر ہوا کرتا ہے۔ خودغرضی اور خود پرستی اسے ہمیشہ منہدم کرنے کا باعث ہوتی ہے۔

گیتی آرا بیگم

معرکۂ حق و باطل میں فولاد اور گھر کی چار دیواری میں ریشم کی طرح نرم اور حلیم، بہادر، مدبر، دوراندیش اور مستقل مزاج خاتون جس کی عسکری قابلیت اور جنگی صلاحیت نے مردوں کی شجاعت اور مردانگی سے خراجِ اطاعت وصول کیا۔ جب شہزادی تھی تو جنگجو سپاہی تھی، اور صرف اپنے حق کے لیے تلوار اٹھانا جانتی تھی۔ جب ملکہ بنی تو رعایا کے لیے رحمتِ خداوندی، خاوند کے لیے باعث طمانیت، علم و فضل کے لیے ابر باراں اور غریبوں کے لیے غیبی امداد بن گئی۔

گیتی آرا نام۔ زابلستان کے حکمران علی مرادن خان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں ہیں۔ باپ نے اپنی اکلوتی نورنظر کی اعلیٰ اور مکمل تربیت کے لیے بڑا اہتمام کیا۔ اسے علوم وفنون میں یکتائے روزگار بنانے کے لیے وقت کے مشاہیر علماء کی خدمات حاصل کی۔ اور زابلستان کے بہترین دماغ اس کی تعلیم وتربیت کے لیے مامور ہوئے۔ شہزادی کو بچپن ہی سے فنون حرب سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں گیتی آرا نے مروجہ علوم پر حیرت انگیز عبور حاصل کر لیا۔ وہ علم و فضل میں

زابلستان کے اندر اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ سخن فہم اور علم دوست ہونے کے علاوہ بہترین مصورہ تھی قدرت نے حسن صورت کے ساتھ بے پناہ صلاحیتیں عطا کی تھیں۔ جنہیں بہترین تعلیم و تربیت نے اتنا اجاگر کیا کہ پورا زبلستان گیتی آرا بیگم کے نام کے دھوم سے گونج اٹھا۔

شہزادی کی عمر ابھی بارہ سال کی تھی کہ اس نے دار الحکومت میں عورتوں کو عسکری تربیت دینے کے لیے ایک اسکول قائم کر دیا۔ چونکہ وہ خود فنون حرب میں کمال مہارت رکھتی تھی۔ اور اس کم عمری میں ہی بہترین فوجی افسروں کی تربیت نے اسے ایک ماہر جرنیل بنا دیا تھا۔ اس لیے اسے جنگی امور اور عسکری تعلیم و تربیت سے بہت لگاؤ تھا۔ علی مردان خان نے اپنی بیٹی کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی اور وہ بیٹوں کی طرح اس کی قدر و منزلت کرتا تھا۔ گیتی آرا بیگم نے فوجی اسکول قائم کرتے ہی اپنی مملکت میں یہ حکم نافذ کرا دیا کہ بیس سے پچیس سال تک کے درمیان عمر کی تمام غیر شادی شدہ خواتین اس اسکول میں لازمی طور پر فوجی تربیت حاصل کریں۔ چونکہ دنیا کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اسکول تھا اس لیے لوگوں نے قدرے مخالفت بھی کی مگر کوئی شخص علی مردان کے حکم کی نافرمانی نہ کر سکا اور تھوڑے ہی عرصے میں تقریباً چار ہزار عورتیں گیتی آرا کے اسکول میں تربیت حاصل کرنے لگیں۔ شہزادی نے ان کے لیے بہترین اتالیق اور فوجی استاد مقرر کیے۔ انہیں ہر قسم کے سامان حرب اور جدید اسلحہ سے آراستہ کرنے کے لیے بے دریغ روپیہ خرچ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نئے تجربہ کو کامیاب بنانے میں علی مردان کا نصف سے زیادہ خزانہ خالی ہو گیا۔ اور امرائے دربار نے دبے الفاظ میں اس بیکار مہم پر روپیہ ضائع کرنے سے منع بھی کیا مگر علی مردان خان نے شہزادی کی کسی خواہش کو روکنا پسند نہ کیا۔ گیتی آرا کے فوجی اسکول میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے والی عورتوں کی تعداد بتدریج بڑھتی رہی۔ کچھ عرصے بعد بارہ ہزار تربیت یافتہ اور اسلحہ جنگ سے لیس زنانہ فوج شہزادی کے اشارۂ ابرو پر کٹ مرنے کے لیے

تیار موجود تھی۔ شہزادی اپنی فوج کی تمام ضروریات کا خود خیال رکھتی اور اپنا زیادہ وقت ان کی تنظیم میں صرف کرتی۔ وہ ہفتے میں کئی دفعہ ان کے دستوں کا معائنہ کرنے کے لیے خود جاتی اور ان کی جنگی مشقوں میں بڑے جوش وانہماک کیساتھ حصہ لیتی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ علی مردان خان کا انتقال ہو گیا۔ مردانہ فوج نے عورت کی کمان میں رہنے سے انکار کر دیا اور اس کے چچا نے تخت پر قبضہ کر لیا وزیر اعظم نے تمام امرائے دربار سمیت نئے حکمران کی اطاعت قبول کر لی۔ یہ خطرناک صورت حال دیکھ کر شہزادی نے وزیر اعظم کو نہایت سخت لہجے میں لکھا کہ وہ نمک حرامی کا ثبوت نہ دے اور اس کا حق غصب کر کے خانہ جنگی کا باعث نہ بنے کیونکہ جب وہ زندہ ہے تو کوئی دوسرا شخص علی مردان کے تاج وتخت کا وارث نہیں بن سکتا۔ وزیر اعظم نے جواب میں لکھا کہ زابلستان پر کبھی کسی عورت نے حکومت نہیں کی اور نہ اب ایسا ہو سکے گا۔ شہزادی کو عورتوں کی فوج پر بھروسہ کر کے اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ وزیر اعظم کے اس گستاخانہ جواب سے شہزادی کو سخت غصہ آیا اور اس نے جنگ کی باقاعدہ تیاری شروع کر دی۔ اس نے مزید وقت ضائع کیے بغیر زنانہ فوج کے ساتھ قلعے پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ تاریخ نے شاید پہلی اور آخری مرتبہ عورتوں کو اس طرح مردوں کے مقابل صف آرا دیکھا۔ تین گھنٹے کی خونریز جنگ کے بعد مردانہ فوج کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں تیرہ عورتیں قتل ہوئیں اور بے شمار مرد سپاہی کام آئے۔

فتح کے بعد شہزادی گیتی آرا نے تخت حکومت پر قدم رکھا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت امیر تیمور کا بیٹا میراں شاہ سربر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے جب شہزادی کی حیرت انگیز شجاعت، مردانگی، اس کے حسن وجمال اور علم وفضل کے واقعات سنے تو بڑی قدردانی کا اظہار کیا اور شادی کی خواہش ظاہر کی۔ شہنشاہ کا خط پڑھ کر شہزادی نے اپنی مشیروں اور جان نثاروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے رائے دی کہ

میراں شاہ کی قوت سے ٹکرانا یا اس سے دشمنی مول لینا زابلستان کی تباہی اور بربادی کو دعوت دینا ہے کیونکہ شہزادی کی زنانہ اور مردانہ فوج مل کر بھی تیموری سلطنت کا چند گھنٹوں مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ گیتی آرا نے کافی غور وخوض کے بعد نکاح کے لیے چند شرائط پیش کیں۔ جنہیں میراں شاہ نے بخوشی منظور کر لیا۔ سمرقند میں بڑی دھوم دھام سے شادی کی رسوم انجام دی گئیں اور گیتی آرا ایک بہت بڑی سلطنت کی ملکہ بن گئی۔ میراں شاہ کے حرم میں داخل ہونے کے بعد گیتی آرا اپنے خاوند کی دست راست ثابت ہوئی اور انتظام وانصرام سلطنت میں شہنشاہ ہمیشہ اسی کی صائب رائے کو مقدم رکھتا تھا۔ میراں شاہ خود کہا کرتا تھا کہ اگر گیتی آرا نہ ہوتی. تو وہ بہت پہلے ہلاک ہو چکا ہوتا۔ گیتی آرا نے جہاں سلطنت تیموری کا انتظام درست کیا وہاں عورتوں کی عام تعلیم کے لیے بہت وسیع انتظامات کیے۔ جگہ جگہ درسگاہیں اور مدرسے قائم کیے۔ حدود مملکت میں اسلامی قانون نافذ کرایا اور اس پر پوری سختی سے عمل کرایا۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ حالت ہوگئی کہ کوئی شخص شرعی احکام کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی جیب خاص سے ملک میں عربی مدارس کا ایک جال بچھا دیا جہاں ہزاروں طلبہ شاہی خرچ پر دینی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گیتی آرا بیگم نے رفاہ عامہ کے کاموں کی طرف توجہ دی تو کئی نئی سڑکیں اور پل تعمیر کرائے۔ بیماروں کے لیے ایک بہت بڑا ہسپتال قائم کیا۔ بیکاروں کے لیے کسب معاش کا بندوبست کیا۔ وہ اپنے خاوند کے مزاج پر اس طرح حاوی ہو چکی تھی کہ میراں شاہ اس سے مشورہ کیے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا تھا۔ گیتی آرا بیگم بھی امور سلطنت میں ہاتھ بٹانے کے علاوہ اپنے شوہر کی بے پناہ خدمت کرتی تھی۔ حرم کی چار دیواری میں وہ ایک نیک، وفا شعار، خدمت گزار اور سلیقہ شعار بیوی تھی۔ گیتی آرا بیگم نے تھوڑے ہی عرصے میں نہ صرف سلطنت کی کایا پلٹ کر رکھ دی بلکہ خود میراں شاہ کے مزاج میں بھی حیرت انگیز انقلاب برپا کر

دیا۔ وہ برفانی راتوں کی ناقابل برداشت سردی میں سمرقند کے بازاروں، گلیوں اور مضافات میں رعایا کی تکالیف معلوم کرنے کے لیے گھومتا رہتا اور ہر دکھی شخص کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ گیتی آرا بیگم کی صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا۔

گیتی آرا بیگم کی زندگی رزم و بزم۔ جلوت و خلوت۔ حرم اور میدان جنگ کے اتصال کی ایک انوکھی کہانی ہے۔ وہ نہایت دلیر، جنگجو اور بہادر تھی۔ علوم و فنون کا مجسمہ تھی مگر باپ کی زندگی میں ایک نیک باعصمت اور سعادت مند بیٹی تھی۔ اس نے اپنی قابلیت اور صلاحیت سے باپ کی زندگی کے اس خلا کو پورا کر دیا جو اولاد نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو چکا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی ناانصافی اور ظلم کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا جو مسئلہ دلائل اور پند و نصائح سے حل نہ ہو سکا اسے میدان جنگ میں نوک شمشیر سے حل کر کے تاریخ عالم کو ایک حیرت انگیز تجربہ بخشا۔ ایک عظیم الشان سلطنت کی ملکہ بننے کے بعد وہ ایک لائق، وفاشعار اور اطاعت گزار بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے میراں شاہ ایسے اکھڑ اور ضدی مزاج کے شخص کو حلم و عفو کے سانچے میں ڈھال دیا۔

کیا آج کی وہ خواتین جو سیم و زر کی جھنکار سے ہی مدہوش ہو جاتی ہیں۔ معمولی سا اقتدار انہیں فرعون بے سامان بنا دیتا ہے اور علم و فضل کی ذرا سی چاشنی انہیں اعتدال کی حدود سے کہیں دور لے جاتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو کائنات عالم کا محور سمجھ کر یوں بات کرتی ہیں جیسے ان سے پہلے اور ان کے بعد دنیا میں کوئی دوسرا نہیں۔ آج نگاہیں ان خواتین کی منتظر ہیں جو معراج کمال پر پہنچ کر بھی نخوت و تکبر اور غرور و پندار سے کوسوں دور تھیں۔ قدرت انہیں جتنا بلند کرتی تھی وہ اتنا ہی جھکنا سیکھ جاتی تھیں۔ وہ اپنی ذات کو بھول کر دوسروں کے لیے جینا اپنا ایمان سمجھتی تھیں۔ خدمت کرنا ان کا مقصد حیات تھا اور دوسروں کے غم اپنے دل میں سمو لینا ان کا عیش تھا۔

ملکۂ ہند بیگم سلطان ناصر الدین محمود

ایک لاڈلی شہزادی جس نے ملکہ بننے کے بعد ایک کنیز کی طرح اپنے درویش خاوند کی خدمت کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ جس نے قصرِ شاہی کے اندر فقر و استغنا کی قندیلیں روشن کر کے دورِ اوّل کی مسلمان خواتین کی یاد تازہ کر دی۔

اس سادہ منش اور شوہر پرست ملکہ کی ابتدائی زندگی کے حالات ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو کر رہ گئے ہیں اور تاریخ کے اوراق اس پردہ نشین اور باعصمت خاتون کی عظمتِ کردار کو اس وقت کے معاشرتی حالات کی وجہ سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ تذکروں میں اس نیک دل ملکہ کا ذکر کہیں کہیں سلطان ناصر الدین محمود کے حالات میں نہایت مختصر طور پر کیا گیا ہے۔ یہ الغ خان اعظم کی بیٹی تھیں جو بعد میں سلطان غیاث الدین بلبن کے نام سے مشہور ہوئے۔ بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ سلطان ناصر الدین کی یہ مثالی اہلیہ شاہی خاندان کی چشم و چراغ تھی اور اس نے شہزادیوں کی طرح بڑے ناز و نعم اور لاڈ پیار سے پرورش پائی۔ اس کے والد اپنی نیک سیرت بیٹی کو بہت چاہتے تھے اور اس کے بلند اوصاف سے بہت متاثر تھے۔ جب شمس الدین التمش کے بعد ناصر الدین محمود ہندوستان کے تخت سلطنت پر جلوہ افروز

ہوئے تو ان کی شادی اسی خاتون سے ہو چکی تھی۔ غیاث الدین بلبن نے بیاہ کے وقت سات کروڑ روپے کا بیش قیمت جہیز اپنی ہونہار لڑکی کو دیا۔ اور بڑی دھوم دھام اور شاہانہ شان وشوکت سے رخصت کیا۔ تاریخ ہند میں سلطان ناصر الدین کو بنوامیہ کے مشہور درویش خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کا ہم مرتبہ خیال کیا جاتا ہے۔ وہ نہایت رحمدل، منصف مزاج، عادل اور عفو وکرم کا پیکر تھے۔ ان میں مطلق العنان حکمرانوں کی سی کوئی بات نہ تھی۔ وہ تاجدار اقلیم ہند ہوتے ہوئے بھی انتہائی خدا پرست، نیک دل، زاہد و عابد اور ہر لحظہ خدا سے ڈرنے والے درویش منش انسان تھے۔ چونکہ ناصر الدین کی ذاتی آمدنی بے حد قلیل تھی۔ اس لئے وہ اپنی روٹی خود کما کر کھاتے تھے۔ وہ قرآن مجید لکھ کر اور ٹوپیاں بنا کر بسر اوقات کرتے۔ شاہی محل ہر قسم کے سامانِ عیش وعشرت اور اسباب آرائش وزیبائش سے بالکل خالی تھا۔ امور سلطنت سے فراغت کے بعد بادشاہ کا تمام وقت محنت مشقت اور زہد وعبادت میں بسر ہوتا تھا۔ شادی سے قبل ملکہ نے لاڈلی شہزادیوں کی طرح پرورش پائی تھی مگر ملکہ کا خطاب پاتے ہی زندگی آرام وسکون اور راحت ومسرت کے لوازمات سے یکسر محروم ہوگئی۔ بادشاہ کے شاہی محل میں ایک بھی لونڈی یا کنیز نہ تھی۔ اس لئے ملکہ کو کئی قسم کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ گھر کے تمام کام کاج اپنے ہاتھ سے انجام دیتی تھی بلکہ جھاڑ پونچھ اور معمولی صفائی کا کام بھی ملکہ کو خود ہی کرنا پڑتا تھا اور اسے ایک لحہ کے لئے فرصت نصیب نہ ہوتی تھی۔ ذرا سوچئے کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی کو ایسے ماحول میں اپنے درویش صفت اور غریب طبع خاوند سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ ان حالات میں ایک زاہد و عابد خاوند کے ساتھ ایک معمولی لڑکی کے لئے زیادہ دیر تک ساتھ دینا مشکل ہو جاتا ہے۔

آپ کے لئے شاید یہ بات باعث حیرت ہو کہ ان تمام باتوں کے باوجود ملکہ کو

سلطان ناصرالدین سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ انتہائی نیک سرشت اور بے نظیر بیوی تھی۔ سلطان کو اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاتی، خود ان کا بستر بچھاتی اور نصف رات تک ان کے پاؤں دبانے میں مصروف رہتی۔ آج ہماری معمولی عورتیں بھی گھر کے کام کاج کو مردوں کی غلامی سے تعبیر کرتی ہیں اور ان کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا بھی مشکل ہوتا ہے مگر سلطان ناصرالدین کی یہ قابل فخر بیوی ان کے کپڑے تک خود دھوتی تھی۔ اور خود ہی برتن صاف کرتی تھی اور دنیا اسے ملکہ ہند کے نام سے یاد کرتی تھی۔ ایک دن اتفاق سے روٹی پکاتے ہوئے اس نازک اندام ملکہ کے ہاتھ بری طرح جل گئے۔ پھپھولوں کی تکلیف برداشت نہ ہو سکی تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلے اور حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ خدا نے یوں تو شہنشاہ کی بیوی بنایا ہے مگر کام کے لئے ایک کنیز بھی نہیں دی سلطان سامنے بوریئے پر قرآن مجید کی تلاوت میں مصروف تھے۔ ملکہ کو اس طرح زاروقطار روتے دیکھ کر وجہ پوچھی۔ ملکہ نے بڑے ادب سے کہا کہ جہاں پناہ! ہاتھ جل گئے ہیں۔ تکلیف ناقابل برداشت ہے۔ اگر ایک کنیز عنایت فرما دیں تو بڑی مہربانی ہوگی اگر یہ ممکن نہیں تو مجھے کوئی شکایت نہیں۔ میں اپنی حالت پر مطمئن اور راضی ہوں سلطان نے جواب دیا۔ بیگم! میں ہر وقت آخرت کے خوف سے بے تاب رہتا ہوں۔ اگرچہ میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں۔ مگر دنیا میں عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سے نیک، خدا ترس اور دیانت دار لوگ طرح طرح کے مصائب و آلام میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر بے حیا اور بد طینت لوگ جو ہر وقت گناہوں اور عیوب میں غرق رہتے ہیں دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر اس سے انکار ممکن نہیں کہ موت کے بعد دوسری زندگی یقینی ہے۔ وہاں ہر نیک و بد کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ اگر ہم نے اس چند روزہ فنا پذیر زندگی میں اپنی خواہشات کی پیروی نہ کی تو خدا کے حضور میں شرمسار نہیں ہونا پڑے گا۔

یادرکھو! بلند مرتبہ لوگوں کی ادنیٰ سی بھلائی دوسروں کی بھلائیوں سے اور ادنیٰ سی برائی دوسروں کی برائیوں سے زیادہ بھاری ہیں۔ تم ایک نیک دل عورت ہو اس لئے صبر کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ہم خدا کی ناشکری کے جرم میں پکڑے جائیں۔ تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ میں رعیت کا نگہبان اور محافظ ہوں۔ مجھے اپنے فرائض کی انجام دہی سے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ مزدوری کرتا ہوں مگر اجرت بہت کم ملتی ہے۔ لونڈی کیسے خریدوں۔ سلطنت کا خزانہ، رعایا کی فلاح و بہبود اور ان کی حفاظت پر صرف ہوتا ہے۔ اس پر نہ میرا حق ہے اور نہ تمہارا۔ میں تمہاری خاطر کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ اگر رعایا کی ہر عورت کو یہ سہولت مل سکے تو میں تمہیں بھی کنیز مہیا کر سکتا ہوں۔

نیک نفس بیوی نے اظہار ندامت کے طور پر خاموشی سے سر جھکالیا اور پھر بڑے ادب سے کہا۔ عالیجاہ! میرا مقصد ہرگز شکایت کرنا نہ تھا بلکہ اضطراب کے عالم میں یہ گستاخی سرزد ہوئی ہے۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے دنیا کی کسی نعمت کی ضرورت نہیں۔ میں ہر حال میں خوش وخرم اور اللہ سے اپنی غلطی کے لئے معافی کی خواستگار ہوں۔

اگرچہ طبقات ناصری کے انگریز مترجم ریورٹی نے ان واقعات کی بناء پر چند مفروضات قائم کر کے شبہ کا اظہار کیا ہے۔ مگر تاریخی حقائق کے سامنے اس کے مفروضات تنگ فطری اور تعصب کے سوا اور کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

سلطان ناصر الدین محمود وہ بادشاہ تھا جس کا دل شراب معرفت اور یاد الٰہی کے نشے میں سرشار رہتا تھا۔ آنحضرت ﷺ سے اتنی محبت تھی کہ وضو کئے بغیر نام لینا پسند نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ وضو سے نہ تھے اور انہوں نے ایک سرکاری ملازم محمد کو بلانا چاہا مگر اسے تاج الدین کہہ کر پکارا۔ خادم نے حاضر ہو کر حیرت سے پوچھا کہ حضور! آج آپ نے خلاف معمول مجھے تاج الدین کے نام سے کیوں یاد فرمایا تو جواب دیا کہ

بھئی اس وقت بے وضو ہوں۔ ایسی حالت میں تمہارا مقدس نام کیسے لے سکتا ہوں۔

ایسے شخص کے حرم میں اس فرشتہ خصلت ملکہ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ نیک اور وفا شعار بیوی بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے گھروں میں فرشتوں کا تقدس اور حوروں کی پاکیزگی نیک بیوی کی صورت میں جلوہ افروز ہو۔ ایسے گھرانے ہمیشہ کردار و سیرت کے نور سے منور رہتے ہیں۔

مسلمان عورت کے لئے دنیا میں ایسا ہی کردار آئینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج کے دور میں ہم اس عورت سے مخاطب ہیں جو نہ کسی بادشاہ کی بیٹی ہے اور نہ کسی سلطنت کی ملکہ ہے۔ مگر پھر بھی کبر و نخوت کی نحوست ہر وقت اس پر چھائی رہتی ہے۔ وہ اپنے خاوند کے عمر بھر کے احسانات اور زندگی بھر کی خدمات کو ایک لمحہ میں فراموش کر دیتی ہے۔ اس وقت وہ احسان فراموشی اور ناشکری کا چلتا پھرتا مجسمہ نظر آتی ہے خاوند کے اچھا یا برا ہونے کا اس کے نزدیک ایک ہی معیار ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک اس کی خواہشات کی پیروی کرتا ہے۔ حالانکہ اسلام میاں بیوی دونوں کو اپنی نفسانی خواہشات کی غلامی سے آزاد ہو کر اللہ کی رضا پر کاربند رہنے کا سبق دیتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ملوکیت اور شہنشاہی کا منحوس دور تھا مگر اس وقت بھی ایسی نیک اور پاک سیرت خواتین موجود تھیں جو بظاہر شہزادیاں تھیں مگر ان کی سادگی، صبر و توکل قناعت اور نیک نفسی درویشی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ وہ ہر آزمائش کی کسوٹی پر پورا اترتی تھیں۔

کیا آج ایک غریب اور مفلس عورت بھی صبر و توکل کے معاملے میں ہندوستان کی اس ملکہ کا مقابلہ کر سکتی ہے، اگر نہیں تو ہمیں سوچنا چاہئے کہ وہ کون سا جوہر حیات تھا جسے گم کر دینے کے بعد آج ہم ایک سچے مسلمان کی تمام خصوصیات اور اوصاف سے محروم ہو چکے ہیں۔

رضیہ سلطانہ

> ''رضیہ بزرگ، عقلمند، عدل شعار، مخیّر اور کریم ہونے کے علاوہ علم دوست، رعیّت پرور، جفاکش، بہادر، رحمدل اور غریب نواز تھی۔ (منہاج السراج)

سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۳۶ء میں وفات سے قبل اپنی بڑی بیگم کی صاحب زادی رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔

کہتے ہیں کہ جب رضیہ کو جانشین نامزد کیا گیا تو اسی زمانے میں بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ اپنی لڑکی شریفہ کو اپنا خلیفہ بنانے کے متعلق سوچ رہے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر کچھ اور عورتیں اس طرح کی ہوتیں تو عورتیں مردوں پر سبقت لے جاتیں۔ اگر عورت کو خلافت اور مشائخ کا سجادہ دینا مناسب ہوتا تو میں بی بی شریفہ کو دیتا۔

ترک امراء اور روٗسائے دربار نے ایک نوعمر لڑکی کی اطاعت میں رہنا گوارا نہ کیا اور التمش کی وفات کے بعد اسے ولی عہدی سے معزول کر کے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔ مگر وہ بے حد نالائق اور عشرت پسند ثابت ہوا۔ وہ خود لہو ولعب میں مصروف رہتا اور اس کی جابر اور ظالم ماں ترکان خاتون امور سلطنت انجام دیتی تھی۔ صوبوں کے حاکم اور بڑے بڑے امراء اس کے ظلم وتشدد سے تنگ آ گئے تو ہر طرف

بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے۔

ترکان خاتون اور اس کے بیٹے رکن الدین فیروز نے رضیہ کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے اسے قتل کر دینے کی سازش کی۔ جو خوش قسمتی سے کامیاب نہ ہو سکی۔ رضیہ ان دونوں مسجد قوت الاسلام کے قریب ایک محل میں رہتی تھی جو دہلی میں مشکِ فیروزی کے نام سے مشہور تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر رضیہ نے اپنی سوتیلی ماں کے مظالم کے خلاف امرائے سلطنت سے امداد و اعانت کی درخواست کی۔ اسی اثناء میں پنجاب کے امراء نے رکن الدین کے خلاف بغاوت کر دی۔ بادشاہ ان کی سرکوبی کے لئے پنجاب روانہ ہوا تو بعد میں دہلی کے امراء نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا اور واپسی پر امراء نے اسے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اس کے بعد ۱۲۳۹ء میں رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رضیہ اپنی سوتیلی ماں کے مظالم سے اس حد تک تنگ آ چکی تھی کہ جب رکن الدین سلطنت سے باہر گیا تو ایک روز جب لوگ نماز جمعہ کے لئے جمع ہو رہے تھے رضیہ نے لوگوں کو اپنے عظیم المرتبت باپ، التمش کی وصیت یاد دلائی اور ان سے امداد کی درخواست کی۔

یہ بھی مشہور ہے کہ رضیہ نے لوگوں سے وعدہ کیا کہ اگر اسے حکومت کرنے کا موقع دیا گیا اور اس کی حکومت مردوں سے بہتر ثابت نہ ہوئی تو بے شک اس کا سر قلم کر دیا جائے چنانچہ دہلی کے باشندوں اور امرائے سلطنت نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر کے حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ رکن الدین اور ترکان خاتون دونوں گرفتار کر لئے گئے۔

مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ رضیہ امور حکومت پر بہت عبور رکھتی تھی۔ باپ نے اپنی زندگی ہی میں اسے اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا اور فنون حرب میں ماہر بنانے کے لئے بہترین اتالیق مقرر کئے تھے۔ رضیہ کے عہد حکومت کے ایک بزرگ مؤرخ لکھتے ہیں کہ رضیہ بزرگ، عاقل، عدل گستر، رعیت پرور، علم دوست،

نیک دل اور بہادر حکمران تھی۔ اور اس میں تمام شاہانہ اوصاف موجود تھے۔

رضیہ کی قابلیت اور صلاحیت کو دیکھتے ہوئے التمش مرحوم نے اپنے کئی بیٹوں کی موجودگی میں اسے اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ ابتداء میں رضیہ سلطانہ پردے میں رہ کر تمام ملکی اور سیاسی فرائض انجام دیتی رہی۔ اس نے اپنی قابلیت، لیاقت اور معاملہ فہمی کی دھاک بٹھادی۔ یقیناً وہ ایک بے حد کامیاب حکمران ثابت ہوتی مگر امراء دربار کی سازشوں اور فتنہ انگیزیوں نے اسے ایک پل چین سے بیٹھنے کی مہلت نہ دی۔ رضیہ نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی ملک سے طوائف الملوکی، سرکشی اور فتنہ پروری کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنی خداداد لیاقت کی مدد سے دریائے سندھ سے لے کر خلیج بنگال تک پوری مملکت میں امن وامان قائم کیا۔ مگر جلد ہی ترک امراء اور فوجی افسروں نے رضیہ کے خلاف فتنے اٹھانا شروع کر دیئے۔

اپنے خاندان کی حکومت کو خطرے میں دیکھ کر رضیہ سلطانہ کو مجبوراً پردے سے باہر آنا پڑا تاکہ وہ ان سرکش اور مغرور ترک امرائے سلطنت کو محسوس کرادے کہ رضیہ ایک کمزور پردہ دار عورت نہیں جو ان کے ہاتھوں میں کٹ پتلی کی طرح کھیلنے پر آمادہ ہو سکے گی بلکہ وہ سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی ہے جو مردوں کی طرح ڈٹ کر ان کی سازشوں کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ مگر یہ حکمت عملی رضیہ کے زوال کا باعث ہوئی کیونکہ دشمنوں نے اس کی بے پردگی کو خوب خوب اچھال کر ہر طرف بدنام اور رسوا کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ دہلی کے لوگ رضیہ کے عدل وانصاف اور بلند کردار کے گرویدہ تھے اس لئے وہاں کوئی سازش کامیاب نہ ہوسکی۔ چنانچہ دشمن امراء نے ملک عزالدین کبیر خان حاکم لاہور کو اکسا کر بغاوت کرادی۔

۱۲۴۰ء میں رضیہ خود مقابلے کے لئے میدان جنگ میں نکلی۔ ملک کبیر خان شاہی فوجوں کا مقابلہ نہ کرسکا اور اس نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیئے۔ اس فتنے کی سرکوبی کے بعد ابھی وہ دہلی واپس پہنچی ہی تھی کہ ملک اختیار الدین حاکم بھٹنڈا نے

بغاوت کردی رضیہ فی الفور بغاوت فرد کرنے کے لئے بھٹنڈا پہنچی مگر جنگ شروع ہونے سے قبل ہی شاہی فوجوں میں پھوٹ پڑ گئی اور رضیہ کا وفادار جرنیل امیر جلال الدین یاقوت قتل کر دیا گیا۔ سازشی امراء نے فوراً رضیہ کو گرفتار کر کے ملک اختیار الدین التونیہ کے سپرد کر دیا۔ رضیہ کے لئے یہ بات بیحد تکلیف دہ تھی کہ وہ ایک ایسے شخص کی قیدی بن کر رہے جو ایک معمولی غلام تھا اور اس کے باپ التمش نے اسے آزاد کر کے اس بلند منصب تک پہنچایا تھا۔

ادھر دہلی کے بااثر امراء نے اس سازش کے بانی ملک اتیگن کے اشارے پر التمش کے تیسرے فرزند بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا دیا اور خود نائب السلطنت بن گیا۔ مگر بہرام نے جلدی ہی اسے قتل کرا دیا۔ اس وقت رضیہ سلطانہ بھٹنڈے کے قلعے میں قید تھی اور ملک التونیہ کی تمام امیدیں حالات بدلتے ہی خاک میں مل گئیں۔ اسے اس بغاوت کے صلے میں کچھ نہ ملا تو اس نے رضیہ سلطانہ سے باقاعدہ سمجھوتہ کر کے شادی کر لی اور اگست ۱۲۴۰ء میں فوج جمع کر کے دہلی پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں التونیہ اور رضیہ کو شکست فاش ہوئی اور وہ دونوں ایک نواحی جنگل میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ رضیہ کی قبر دہلی میں بلبلی خانہ کے اندر بتائی جاتی ہے اور اب یہ قبر رجی بجی کی خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔

بعض مؤرخین نے رضیہ سلطانہ کے کردار پر ناروا حملے کئے ہیں اور امیر جمال الدین یاقوت کا نام لے کر اس پاک دامن خاتون کو بدنام کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ حالانکہ اس دور کے تمام تذکرے ان خرافات سے بالکل خالی ہیں۔ اس قسم کے تمام واقعات رضیہ کی وفات سے کم وبیش چار سو سال بعد لکھے گئے ہیں۔ جو ہرگز مستند نہیں ہیں۔

برطانوی دور حکومت میں کئی مؤرخین نے صدیوں بعد لکھے ہوئے تذکروں طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ وغیرہ پر انحصار کر کے اس افسانے کو خوب اچھالا اور رضیہ ایسی باعصمت خاتون پر بدنامی کا پردہ گرا دیا۔ اس طرح ابن بطوطہ نے بھی ان سنی سنائی باتوں کو اپنے سفرنامے میں نقل کر دیا۔ اس افسوسناک حرکت میں ہندو مصنفین

پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے زیب النساء ایسی پاکیزہ کردار عورت کی طرح رضیہ کے حقیقی خدوخال چھپا دیئے۔

رضیہ کے ہم عصر مورخ منہاج السراج کا بیان ہے کہ رضیہ پردہ کرنے کے بعد ہمیشہ ہاتھی پر سوار ہوتی تھی اور یاقوت اس کی تخت نشینی کے وقت ایک باعزت درباری تھا جسے رضیہ نے محض ترکوں کا زور توڑنے کے لئے آگے بڑھایا تھا تاکہ درباری امراء میں توازن اقتدار قائم رہ سکے اور وہ کسی حکمران کو بے بس و مجبور کھلونا نہ بنا سکیں۔اس کے عہد میں جتنے افسوسناک واقعات پیش آئے۔ان کی ذمہ داری رضیہ کے کردار پر ہرگز عائد نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذمہ دار ہوس پرست ترک امراء تھے۔

رضیہ نہایت دلیر اور بہادر عورت تھی۔اپنے عہد میں وہ عدل و انصاف کا نشان خیال کی جاتی تھی۔اپنے عہد حکومت میں بھی اس نے صوم و صلوٰۃ کی پابندی ترک نہیں کی۔اس نے محتاجوں، فقراء اور مساکین کا ایک رجسٹر تیار کرا رکھا تھا جس کے مطابق انہیں ہر قسم کی امداد و اعانت ملتی تھی۔اس کے دور حکومت میں ملک بہت خوشحال تھا اور اس نے رفاہ عامہ کے کئی اچھے کام انجام دیئے۔

اگرچہ رضیہ سلطان ایسی عظیم عورت کو وقت اور حالات نے ایک ایسی کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا جس کا مائیہ خمیر ہی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے اٹھایا گیا تھا۔تاہم اس نے اپنی مستقل مزاجی اور فراست سے تاریخ میں اپنے لئے ایک باعزت مقام پیدا کر لیا۔یہ حقیقت ہے کہ اگر رضیہ سیاسی جھمیلوں میں گرفتار ہو کر امور سلطنت انجام دینے کی ذمہ داری قبول نہ کرتی تو اس کی بے پناہ قابلیت اور صلاحیت اپنی عظمت کا لوہا منوانے کے لئے کوئی دوسرا راستہ نکال لیتی۔رضیہ کی زندگی میں جہاں بہترین کردار کی جھلک نظر آتی ہے۔وہاں ہماری خواتین کے لئے عبرت کا سبق بھی پوشیدہ ہے جسے ہر سلیم العقل خاتون اچھی طرح سمجھ سکتی ہے۔

چوچک بیگم

ایثار و وفا کا وہ مہکتا ہوا پھول جس کی عنبر بار نکہت سے آج بھی آئینِ وفا کے اوراق گلستاں بن کر دکھائی دیتے ہیں۔ایک وفادار شہزادی جس نے غربت و افلاس کے عالم میں بھی اپنے اندھے شوہر کا ساتھ نہ چھوڑا۔

میرزا شاہ حسین حاکم سندھ کی نورِ نظر تھی۔سندھ کے تاریخی شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئی جب سرزمین ہند پر شہنشاہ بابر کا پرچم لہرانے لگا۔اور بے شمار لوگ مطیع فرماں بردار ہو گئے تو سندھ کے حاکم میرزا شاہ حسین نے مغلیہ خاندان سے اپنے تعلقات استوار کرنے کے لئے اپنی بیٹی چوچک بیگم کی شادی بابر کے بیٹے کامران میرزا سے کردی۔بابر کی وفات کے بعد ہمایوں تخت نشین ہوا تو اس کے دونوں بھائیوں عسکری اور کامران میرزا نے اسے تاج و تخت سے محروم کرنے کے لئے کئی شورشیں برپا کیں۔ ہمایوں نے پہلے تو ان دونوں کو نرمی اور احسان و مروت سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی مگر جب یہ کسی صورت فتنہ انگیزیوں سے باز نہ آئے تو تنگ آ کر اس نے دوبارہ قبضہ کے بعد ۹۶۰ھ میں کامران کو اندھا کر دیا تا کہ وہ عملی طور پر سازش میں شریک نہ ہو سکے،عتاب شاہی نازل ہونے اور آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد

کامران کو عسرت و افلاس اور محتاجی نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ چنانچہ اس نے بھائی کی آنکھوں سے بہت دور حجاز مقدس میں قیام پذیر ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ سفر حجاز پر روانہ ہونے سے قبل وہ سیدھا اپنے خسر میرزا شاہ حسین کے پاس ٹھٹھہ میں پہنچا تاکہ باقی زندگی اطمینان سے بسر کرنے کے لئے وہ اپنے خسر سے امداد و اعانت حاصل کر سکے۔ شاہ حسین نے اسے بے بسی اور محتاجی کے عالم میں اتنے طویل اور کٹھن سفر پر روانہ ہونے سے منع کیا۔ مگر کامران نے یہ کہہ کر خسر کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا کہ اب میرا اس ملک میں رہنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے چوچک بیگم نے جب اپنے شوہر کا عزم صمیم دیکھا تو وہ بھی ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ جب شاہ حسین کو معلوم ہوا کہ اس کی ناز پروردہ بیٹی بھی اس پر آشوب سفر پر روانہ ہونے کا فیصلہ کر چکی ہے تو وہ سخت پریشان ہوا۔ اسی خدشہ کے پیش نظر اس نے میرزا کامران کو بھی جانے سے منع کیا تھا۔ اپنی بیٹی کے اس فیصلے سے آگاہ ہوتے ہی شاہ حسین نے شہزادی کو بلا کر ہر ممکن طریقے سے سمجھایا کہ وہ اس اندھے محتاج شخص کے ساتھ غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ ترک کر دے۔ باپ نے چوچک بیگم سے کہا کہ آخر تمہارے باپ کے گھر میں کس چیز کی کمی ہے، عیش و آرام ہے۔ مال و دولت کی فراوانی ہے۔ دنیا کی ہر نعمت موجود ہے اور وہ عمر بھر شہزادیوں طرح عیش و مسرت کی زندگی بڑے اطمینان سے بسر کر سکتی ہے آخر وہ کیوں کامران کے ساتھ اپنی زندگی خراب کر رہی ہے جب کہ اس کا مستقبل بھی بالکل ختم ہو چکا ہے اور اب اس کے سنبھلنے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ مگر چوچک بیگم نے اپنا فیصلہ بدلنے سے صاف انکار کر دیا۔ شاہ حسین یہ صورت حال دیکھ کر بہت مضطرب ہوا۔ چوچک بیگم کی ماں کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا کیونکہ سب جانتے تھے کہ دوبارہ چوچک بیگم ان سے نہ مل سکے گی چنانچہ باپ نے خاندان کے تمام لوگوں اور رشتہ داروں کو بلا کر کہا کہ وہ کسی نہ کسی طرح چوچک بیگم کو کامران

کے ساتھ نہ جانے پر آمادہ کریں مگر سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ اس وفا شعار شہزادی نے اپنے اندھے خاوند کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا اور خاموشی سے ماں باپ کو سلام کر کے کامران کے ساتھ روانہ ہو گئی۔

شاہ حسین کو امید تھی کہ شاید ساحل سمندر پر جا کر چوچک بیگم اپنے وطن اور عزیزوں اور رشتہ داروں سے جدائی کی کلفت پوری طرح محسوس کرے گی اور واپس آ جائی گی مگر وہ مجسمہ ایثار و وفا سرزمین وطن کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی جہاز پر سوار ہو گئی شاہ حسین نے پھر اپنے چند معتمد آدمیوں کو بھیجا کر وہ چوچک بیگم کو اب بھی واپس آنے پر رضامند کر لیں، مگر انہیں پھر مایوسی ہوئی اور شہزادی اپنی ضد پر اڑی رہی آخر تنگ آ کر شاہ حسین خود جہاز پر پہنچا کیونکہ اس کی شفقت پدری اسے کسی کل چین نہ لینے دیتی تھی شاہ حسین نے بڑی نرمی اور لجاجت کے ساتھ اسے اپنے بڑھاپے کا واسطہ دیا اور اپنا فیصلہ بدلنے پر سخت مجبور کیا۔ باپ نے میرزا کامران سے بھی کہا کہ وہ ٹھٹھ کے نواح میں اسے بڑی سے بڑی جاگیر دینے پر آمادہ ہے اور عمر بھر کے لئے اس کی کفالت بھی کرے گا بشرطیکہ وہ سفر حجاز کا ارادہ ترک کر دے۔ اگر وہ بہر صورت جانا ہی چاہتا ہے تو چوچک بیگم کو ساتھ لے جانے سے انکار کر دے اس کے عوض شاہ حسین اپنی استطاعت سے بڑھ کر مال و دولت دینے پر تیار تھا۔ کامران نے یہ معاملہ چوچک بیگم کی مرضی پر چھوڑ دیا اور کہہ دیا کہ میں نے پہلے بھی اسے مجبور نہیں کیا اور اب بھی میری طرف سے اسے اجازت ہے کہ وہ چاہے تو اپنے والدین کے پاس رہے۔ باپ پھر بیٹی کی طرف متوجہ ہوا اور اسے اپنا فیصلہ بدل دینے کے لئے کہا۔

چوچک بیگم نے جواب دیا۔

اے باپ! آپ کی حکم عدولی سے خود مجھے بھی بہت افسوس ہو رہا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں میں کسی صورت اپنے مصیبت زدہ خاوند کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر میں نے

ایسا کیا تو لوگ نہ صرف میرے منہ پر تھوک دیں گے بلکہ آپ کے معزز نام کو بھی بٹہ لگے گا۔ ذرا سوچئے کہ لوگ کیا کہیں گے۔شاہ حسین کی بے غیرت اور بے وفا بیٹی نے مصیبت کے وقت اپنے مجبور خاوند کو دغا دی اور اسے مصائب و آلام کے حوالے کر کے خود عیش و عشرت کی زندگی قبول کر لی۔ جب میرزا کامران خوشحال تھا اور اس کے بادشاہ بننے کی امید تھی تو آپ نے اپنی خوشی سے مجھے اس کے حوالے کر دیا۔اب وہ خستہ حال اندھا، غریبی، افلاس اور مصائب و آلام میں گرفتار ہے اور اس وقت بھری دنیا میں کوئی اس کے ٹوٹے ہوئے دل کو تسلی دینے والا بھی نہیں تو آپ اس سے جدا ہونے کا حکم دے رہے ہیں حالانکہ وہ میرا خاوند ہے۔ میں آپ ایسے غیرت مند باپ کی بیٹی ہوں میری رگوں میں آپ کا خون گردش کر رہا ہے۔ میں ایسے وقت میں اپنے خاوند کو چھوڑ دوں۔ مجھے بتائیے کہ یہ کس مذہب کی تعلیم ہے اور کون سے ملک کا قانون ہے کہ جب خاوند خوشحال اور صاحب اقتدار ہو۔عورت اس وقت تو اس کی خوشیوں میں حصہ دار بنی رہے مگر جب اس کا ستارہ گردش میں آجائے اور دنیا کے سب لوگ اس کا ساتھ چھوڑ جائیں تو بیوی جو ایسے وقت پر خاوند کا واحد سہارا ہوتی ہے وہ بھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لے۔اپنی وفا شعار اور نیک دل بیٹی کی یہ گفتگو سن کر شاہ حسین کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے اب وہ بالکل لاجواب تھا۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی باقی نہ رہا تھا۔فرض شناس بیٹی نے اس کی غیرت و حمیت اور انسانیت کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا تھا۔وہ اپنی بیٹی کی محبت میں اندھا ہو کر میاں بیوی کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔آخر شاہ حسین نے بہت سی دولت اور ضروری سامان دے کر دونوں کو نم آلود آنکھوں سے رخصت کیا۔ یہ نیک دل عورت چار سال بعد ۹۶۴ھ میں حجاز میں انتقال کر گئی۔وہ دوبارہ اپنے ماں باپ سے نہ مل سکی اور آخر دم تک اپنے اندھے خاوند کی خدمت میں مصروف رہی۔

چوچک بیگم کی یہ کہانی کتنی سادا اور دل کو متاثر کرنے والی ہے۔ ہمارے دور کی معزز و محترم بیگمات اور بہنوں کو غور کرنا چاہیئے کہ شہزادی چوچک بیگم اور ان کے درمیان کون سی خلیج حائل ہے، چوچک بیگم اسی نسوانی جوہر کا دوسرا نام تھا جو عورت کو اوج ثریا کے لئے باعث رشک بنا دیتا ہے۔ عورت کی بلندی اور عظمت کا راز اسی جوہر میں پوشیدہ ہے اور اسلام کی تعلیم اسی جوہر کو نمایاں کرتی ہے۔ اسی جوہر پر مشرق ہمیشہ ناز کرتا رہا ہے۔ وفا و ایثار کا یہ جوہر مشرق کی عظمت اور ناموس کا امین رہا ہے جس کی حفاظت کرنا ہر مسلمان عورت کا فرض ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ شہزادی چوچک بیگم کو کتنی بڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ اس کے ایک طرف پر آسائش اور عیش و آرام کی زندگی تھی، ماں باپ اور عزیز و اقارب کی محبت کے بندھن تھے اپنے وطن کی الفت تھی۔ دوسری طرف ایک ان دیکھی منزل، مصائب و آلام سے بھرپور کٹھن سفر اور مفلسی کا مارا ہوا، ایک محتاج اور بدنصیب اندھا خاوند تھا جو خود اٹھ کر پانی کے چند گھونٹ پینے کے قابل بھی نہ تھا۔ اسے دو چیزوں میں ایک کو منتخب کرنا تھا۔ مگر چوچک بیگم نے ایک مسلمان عورت کی طرح فرض کو محبت پر ترجیح دی۔ اس نے اپنا مفلس اور اندھا خاوند چن لیا تو سب بیڑیاں اور زنجیریں کٹ کر گر گئیں۔ پھر کوئی طاقت اس کا فیصلہ نہ بدل سکی۔

خدا کرے کہ ہماری بہنیں چوچک بیگم کی زندگی سے بلند کرداری کا یہ سبق حاصل کریں اور مشرق کی ان مقدس روایات کے چراغوں کو اپنے خوں سے روشن رکھیں تا کہ یہاں کبھی اندھیرا نہ پھیل سکے۔

چاند بی بی

چاند بی بی ایک نیک دل، نیک نیت، مخلص، خداترس، عابدہ، پرہیزگار، سیاست اور علم سپہ گری کی ماہر ملکہ تھی۔ خودداری اور شجاعت اس کے دو بہت بڑے اوصاف تھے۔

چاند بی بی احمد نگر کے بادشاہ کی بیٹی تھی۔ اس کا تذکرہ مشہور مغل شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں ملتا ہے۔ چاند بی بی کی شادی بیجاپور کے والی سلطان علی عادل شاہ سے ہوئی لیکن تھوڑا عرصہ بعد سلطان عادل شاہ فوت ہوگیا اور چاند بی بی بیوہ ہوگئی۔ ادھر احمد نگر میں اس کا بھائی جو نظام شاہی خاندان کا حکمران تھا وفات پا گیا اور چاند بی بی کو اپنے نابالغ بھتیجے کی سرپرست بھی بننا پڑا۔ چنانچہ وہ بیجاپور سے احمد نگر واپس آ گئی اس وقت شہنشاہ اکبر کا ستارہ عروج پر تھا اور برصغیر پاک وہند کے ہر گوشے میں اس کا پرچم اقبال لہرا رہا تھا۔ بنگال، پنجاب، سندھ، کابل، سرحد، سوات، کشمیر بلوچستان اور قندھار وغیرہ اس کی قلمرو میں شامل ہو چکے تھے۔ اب اس نے دکن کی طرف توجہ دی اور ۱۵۹۵ء میں شہزادہ مراد کو احمد نگر فتح کرنے کے لئے ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ کیا۔ برار پر پہلے ہی اکبر کا قبضہ ہو چکا تھا اور چاند بی بی نے اس کا دفاع ممکن نہ سمجھتے

ہوئے اس پر مغلوں کا قبضہ تسلیم کر لیا تھا۔ مغلیہ فوج نے چاروں طرف سے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا مگر چاند بی بی کی خودار طبیعت نے اکبر کی اطاعت قبول کرنا گوارا نہ کیا اور وہ پاک و ہند کی اس عظیم الشان سلطنت سے ٹکرانے کے لئے کمر بستہ ہو گئی۔ چند دن بعد مغل فوج نے قلعے پر خوفناک گولہ باری شروع کر دی جس سے قلعہ کی فصیل کا ایک حصہ منہدم ہو گیا۔ چاند بی بی بڑی جرأت اور شجاعت کے ساتھ اس شگاف کے سامنے کھڑی رہی اور تمام رات وہاں موجود رہ کر اپنی نگرانی میں شگاف بند کرایا۔ اس نے قلعہ کی دیوار پر ہر جگہ توپچی متعین کر رکھے تھے جن کی کمان وہ خود کر رہی تھی۔ مشہور ہے کہ ایک موقع پر مغل فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے چاند بی بی کی محصور فوج کے پاس سیسہ کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ تو چاند بی بی نے فوراً تانبے کی گولیاں بنانے کا انتظام کیا۔ جب وہ سٹاک بھی ختم ہو گیا تو سونے اور چاندی کی گولیاں تیار کرائیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقصد کے لئے چاند بی بی نے اپنا تمام زیور اور نقد روپیہ گولیاں ڈھالنے والوں کے سپرد کر دیا مگر شکست قبول نہیں کی۔ آخر حملہ اور فوج کو بری طرح سے پسپا ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا اور شہزادہ مراد نامرادی کے داغ سینے میں چھپائے واپس جانے پر مجبور ہو گیا تاریخ کی یہ بے نظیر فتح ایک الوالعزم اور شیر دل عورت کی استقامت اور شجاعت کی زندۂ جاوید مثال ہے۔ ورنہ شہنشاہ اکبر کی عسکری قوت کے سامنے چاند بی بی کی کیا حیثیت تھی۔ یہ صرف اس کا جذبہ صادق تھا کہ اس نے اتنی بڑی طاقت کو ذلت آمیز شکست دے کر اکبر اعظم کا سر شرم و ندامت سے جھکا دیا۔

دوسری بار شہنشاہ اکبر نے شہزادہ دانیال کو اس مہم پر روانہ کیا۔ اس وقت احمد نگر اندرونی سازشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا اور چاند بی بی کی فوج میں کئی نمک حرام پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے کئی امراء جن میں وزیر سلطنت حامد خاں بھی شامل تھا بظاہر چاند بی بی کے وفادار تھے مگر در پردہ وہ برار پر مغلوں کا قبضہ تسلیم کرنے کی وجہ سے چاند بی بی

کے دشمن بن گئے تھے۔ حامد خاں نے سلطانہ سے غداری کی اور ایک روز اپنے ہاتھ سے تلوار کا بھرپور وار کر کے اسے شہید کر دیا۔ دوسری مرتبہ جب شہزادہ دانیال نے حملہ کیا تو عزم واستقامت کی وہ مضبوط فصیل گر چکی تھی جسے لوگ چاند بی بی کے نام سے جانتے تھے۔ چنانچہ معمولی سی جھڑپ کے بعد احمد نگر مغل فوج کے حوالے کر دیا گیا۔

چاند بی بی کا کردار اگرچہ رضیہ سلطانہ کی طرح سیاسی حیثیت رکھتا ہے مگر ہمارا تعلق اس کی زندگی کے اس پہلو سے ہے جو حریت وحمیت، خودداری اور غیرت، شجاعت وشہامت اور جرأت واستقامت سے عبارت ہے۔ یہی وہ بلند اوصاف ہیں۔ جن کی بدولت اس کی بے داغ سیاسی زندگی تاریخ کے صفحات پر منفرد انداز میں جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اگر وہ ان اوصاف سے محروم ہوتی تو احمد نگر کی مختصری فوج چند گھنٹے بھی اکبری افواج کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ اور تاریخ کے اوراق اس کے ذکر جمیل سے خالی ہوتے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ چاند بی بی بہت دیندار اور خدا ترس خاتون تھی اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرتی تھی۔

ملکہ نور جہاں

جس کے گرد رنگین قصوں اور دلچسپ رومانی کہانیوں کا جال اس طرح بن دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس وقت خود زندہ ہوتی تو اپنے الف لیلوی کردار کو دیکھ کر اس کا سر شرم و ندامت سے جھک جاتا۔ اصل نور جہاں اس افسانوی دنیا سے بہت دور بستی ہے، وہ ایک وفاشعار بہادر، دانش منداور عفت مآب خاتون تھی۔ یہی وہ خاتون تھی جس نے شہنشاہِ جہانگیر کو شہرتِ دوام کی دولت بخشی۔ جس نے تادمِ مرگ اپنے شوہر کی بڑی جانسوزی سے خدمت کی اور اس کے مرنے کے بعد بھی پروانہ وار اس کے مدفن کا طواف کرتی رہی اور اس کی یاد کو اس طرح خشت و سنگ کے خوبصورت پیکر میں ڈھال دیا کہ آج بھی ہزاروں ہاتھ اس کی مغفرت کے لیے اٹھتے ہیں۔ خاکِ لاہور پر جہانگیر اور نور جہاں کے مقبرے اس کی عصمت مآبی اور پاک دامنی کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔

نور جہاں کا اصل نام مہر النساء تھا۔ اس کا ایرانی نژاد باپ غیاث بیگ اکبر کے

عہد میں وارد ہندوستان ہوا۔ شہنشاہ اکبر نے غیاث بیگ کی قابلیت اور صلاحیت سے متاثر ہو کر شعبہ مالگزاری میں معقول مشاہرے پر ملازم رکھ لیا جہاں اس نے بڑا نام پیدا کیا۔ جب نور الدین جہانگیر تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے غیاث بیگ کو اعتماد الدولہ کا خطاب دے کر وزیر مال مقرر کر دیا اور اس کے بیٹے آصف خاں کو بھی بہت بڑے عہدے پر مامور کیا۔ مہر النساء جو بعد میں نور جہاں کے لقب سے مشہور ہوئی برصغیر کی تاریخ میں پہلی ملکہ ہے جسے بے پناہ شہرت نصیب ہوئی۔ اور کوئی شخص اس کے نام سے ناواقف نہیں رہا۔ یہ فقید المثال شہرت پاک و ہند کی کسی دوسری ملکہ کو کبھی نصیب نہیں ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر غیر ذمہ دار مؤرخین نے صدیوں بعد جو تذکرے سپرد قلم کئے ان میں بے شمار ایسی سنی سنائی اور بے سروپا روایات کو جمع کر کے قصوں اور کہانیوں کی شکل دے دی جو کسی بھی تاریخی معیار کی کسوٹی پر پرکھنے سے جھوٹی ثابت ہو سکتی ہیں۔ ان جھوٹے افسانوں اور سینہ بسینہ منتقل ہونے والے رنگین قصوں نے عوام میں بڑی مقبولیت حاصل کی اور آخر دیار ہند کی اس مدبر علم دوست، وفا شعار اور بہادر خاتون کی شخصیت ان افسانوں میں گم ہو کر رہ گئی اور آج ہم اس الف لیلوی نور جہاں کو جانتے ہیں۔ جس کا ایک شرابی اور آوارہ منش بادشاہ سے ایسا تعلق تھا جسے جہانگیر کے باپ اکبر نے سخت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور مہر النساء کی شادی اپنے ایک سردار شیر افگن سے کر کے اسے بنگال کا صوبیدار مقرر کر دیا مگر وہ جہانگیر کے ایماء پر قتل کر دیا گیا۔ کیونکہ جہانگیر بدستور مہر النساء سے تعلق قائم کئے ہوئے تھا۔ شیر افگن کی موت کے بعد جہانگیر نے نور جہاں کو اپنے حرم میں شامل کر لیا۔ یہ اور اسی قسم کے کئی بدنام قصے نور جہاں کی زندگی سے وابستہ ہیں جنہیں اگر تاریخی حقائق کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ مبالغہ آرائی اور دروغ بافی کا ایک مکروہ گورکھ دھندا ثابت ہو جاتا ہے۔ جدید ترین تاریخی تحقیقات سے بھی یہ بات پایہ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ تذکرہ نگاروں

کی تخلیق کی ہوئی یہ افسانوی نور جہاں حقیقی نور جہاں کا بالکل الٹ ہے، اس قسم کے جتنے مبالغہ آمیز قصے اس کی ذات سے منسوب کیئے گئے ہیں سب من گھڑت اور بازاری جھوٹ ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب یہ افسانے عالم گیر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس مظلوم کی عصمت وعفت پر جو بہتان باندھے گئے ہیں انہیں حقیقت سمجھ کر پردۂ سیمیں پر بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ درحقیقت یہ تمام افسانے ان کے بہت بعد میں پیدا ہونے والے مورخین کی تخلیق ہیں۔ خصوصاً نور جہاں اور جہانگیر سے متعلق خفی خاں نے منتخب اللباب اور سجان رائے نے خلاصتہ التواریخ میں بہت غلط فہمیاں پھیلائی ہیں حالانکہ اقبال نامہ جہاں گیری اور تزک جہانگیری ایسی کتب میں ان افسانوں کا کہیں ذکر نہیں۔

یہ درست ہے کہ مہر النساء کی پہلی شادی علی قلی خاں عرف شیر افگن سے ہوئی۔ جو ۱۶۰۷ء میں قتل ہو گیا۔ شہنشاہ جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا تو علی قلی خاں ان دونوں بروان کا حاکم تھا۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ بنگال کے پٹھان سردار دور ہونے کی وجہ سے عموماً سرکشی پر آمادہ رہتے تھے۔ خصوصاً وہاں کا حاکم قطب الدین کو کہ ہمیشہ اس کوشش میں رہتا تھا کہ کسی طرح خود مختار سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ شہنشاہ جہانگیر کو حاکم بردوان علی قلی خاں عرف شیر افگن سے یہ توقع تھی کہ وہ اس قسم کی سرکشی کو فوراً دبا دے گا۔ مگر شیر افگن دانستہ صورت حال کو نظر انداز کر رہا تھا بلکہ کچھ عرصہ بعد جہانگیر کو اطلاع ملی کہ وہ خود بھی بغاوت پر آمادہ ہے۔ شہنشاہ نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے قطب الدین کو ہی اس کام پر معمور کیا کہ وہ صحیح صورت حال سے دربار کو آگاہ کرے جب قطب الدین شیر افگن کی حدود میں پہنچا تو شیر افگن نے اس پر حملہ کر دیا۔ قلب الدین کے ساتھی بھی طیش میں آ گئے اور انہوں نے شیر افگن کو قتل کر دیا۔ جب جہانگیر کو ان دونوں کی موت کا علم ہوا تو اسے بہت افسوس ہوا۔ ان

حالات میں جہانگیر پر یہ الزام لگانا کہ اس نے مہرالنسا کے لئے شیر افگن کو قتل کیا، بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مستند کتب تاریخ میں اس بات کا بھی کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ جہانگیر نے مہرالنساء کی بیوگی سے پہلے کبھی اسے دیکھا تھا۔ شیر افگن کے قتل کے بعد مہرالنسا کے باپ اعتمادالدولہ نے اپنی بیٹی کو شہنشاہ اکبر کی بیوہ اور جہانگیر کی سوتیلی ماں سلیمہ بیگم کے پاس خدمت گذاری کے لئے بھیج دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہانگیر نے ۱۶۱۱ء میں مہرالنسا کو پہلی مرتبہ جشن نوروز میں دیکھا۔ اس وقت شیر افگن کو مرے چار سال گزر چکے تھے۔ مہرالنساء چونکہ بے حد حسین وجمیل، خوش اطوار، سلیقہ منداور ذہین خاتون تھی۔ جہانگیر اس کی اچھی عادات اور عمدہ خصائل سے بہت متاثر ہوا۔ دو ماہ بعد شہنشاہ نے اس سے شادی کر لی۔ شادی کے موقع پر اسے نور محل اور بعد میں نور جہاں کا خطاب دیا گیا یہ خطاب اب اس کا نام بن چکا ہے اور دنیا اسے مہرالنسا کی جگہ نور جہاں کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہانگیر سے نورِ جہاں کی شادی کا واقعہ قطعاً غیر معمولی اور پراسرار حالات کا نتیجہ نہ تھا جسے رنگ آمیزی کے ساتھ ایک رومانی افسانہ بنادیا گیا ہے۔ اگرچہ شراب جہانگیر کی ایک کمزوری بن گئی تھی مگر وہ امرائے دربار اور رعایا کو اس لعنت میں گرفتار ہونے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ نور جہاں نے اس کے حرم میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کی مے نوشی کی عادت کو قابو میں لانے کی تدبیریں کرنے لگی۔ کثرت سے تلخ اور تیز شرابیں استعمال کرنے کی وجہ سے جہانگیر کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور اس کا جگر بھی متورم ہوتا جارہا تھا مگر نور جہاں ہر ممکن کوشش کرتی تھی کہ اگر شہنشاہ یہ عادت ترک نہیں کر سکتا تو کم از کم اعتدال پر قائم رہے وہ اس کے کھانے پر بھی کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ کیونکہ اسے جہانگیر کی صحت کا بہت خیال رہتا تھا۔

نور جہاں اپنی لیاقت اور دانشمندی کی بدولت جہانگیر کے دل و دماغ پر اس

طرح حاوی ہو چکی تھی کہ درحقیقت وہی سلطنت کے سیاہ و سپید کی مالک تھی مگر نور جہاں نے کبھی شہنشاہ کو دانستہ غلط رائے نہیں دی اور نہ کوئی ایسا اقدام کیا جس سے کے استحکام کو نقصان پہنچنے کا خطرہ لاحق ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ جہانگیر اسے بہت عزیز رکھتا تھا۔ اور اس پر بے پناہ اعتماد کرتا تھا۔ میاں بیوی کی یہ باہمی محبت اور موانست ہی رنگا رنگ افسانوں کی وجہ بن گئی اور داستان پسند لوگوں نے اس کو کئی قسم کے قصوں میں منتقل کر دیا۔

نور جہاں اس برصغیر کی پہلی ملکہ تھی جس کا نام شہنشاہ کے ساتھ رائج الوقت سکوں پر کندہ ہوا۔ اس سے پہلے یا بعد میں برصغیر پاک و ہند کی کسی ملکہ کو یہ عزت نصیب نہیں ہوئی اس کے علاوہ جہانگیر نے بھاری اشرفیوں کا نام ہی ''نور جہانی'' رکھا تھا۔ ۱۶۱۹ء میں نور جہاں نے فتح پور سیکری میں شکار کھیلتے ہوئے بندوق کی پہلی ہی گولی سے شیر کو مار ڈالا تو بادشاہ بہت خوش ہوا۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس سے نور جہاں کی شجاعت اور دلیری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نور جہاں عقلمندی و فراست اور ذہانت و دانش مندی میں اپنی مثال آپ تھی۔ اکثر انتہائی نازک مواقع پر اس نے ایسی حاضر دماغی اور دانشمندی کا ثبوت دیا کہ آج بھی سن کر حیرت ہوتی ہے۔ ایک دفعہ شہنشاہ اور ملکہ کابل جا رہے تھے۔ آصف خاں لشکر کا ایک بہت بڑا حصہ لے کر دریا کے پار اتر گیا۔ مگر شہنشاہ جہانگیر اور نور جہاں تھوڑی سی فوج کے ساتھ پیچھے رہ گئے۔ مہابت خاں نے اپنے سپاہیوں کی مدد سے کشتیوں پر قبضہ کر کے جہانگیر کو حراست میں لے لیا۔ مگر ملکہ نور جہاں کسی طرح دریا کے پار پہنچ گئی اور آصف خاں کو مقابلے کے لئے بھیجا مگر اس نے شکست کھائی۔ نور جہاں نے بڑی عقلمندی اور ہوشیاری سے مہابت خاں کا زور توڑ دیا اور وہ ڈر کے مارے بھاگ گیا۔ اس طرح لائق ملکہ نے اپنے شوہر کو بچا لیا۔

۱۶۲۷ء میں جہانگیر کی صحت بہت خراب ہوگئی ملکہ نور جہاں پہلے بھی ایک مرتبہ اسے کشمیر لے گئی تھی اور وہاں اسے کافی افاقہ ہوگیا تھا۔اب دوسری بار وہ پھر جہانگیر کے ساتھ کشمیر گئی مگر جہانگیر کے دن پورے ہوچکے تھے۔اس لئے کوئی فرق نہ پڑا بلکہ بیماری شدت اختیار کرگئی۔نور جہاں نے ان ایام میں اس کی بے پناہ خدمت کی۔وہ ہر وقت تیمارداری اور دیکھ بھال میں مصروف رہتی تھی۔مگر اب جہانگیر کی مسیحائی نور جہاں کے دائرہ اختیار میں نہ تھی۔چنانچہ ۷ نومبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر پیر پنجال کے قریب اس دارفانی سے رخصت ہوگیا۔نور جہاں ابھی اس صدمے سے سنبھلنے نہ پائی تھی کہ اس کے بھائی آصف خاں نے ملکہ کو حراست میں لے کر سازشیں شروع کردیں۔مگر اب نور جہاں کی دلچسپی کا کیا سامان باقی رہ گیا تھا۔اس کی تمام عظمت و شوکت اپنے خاوند کے ساتھ رخصت ہوچکی تھی۔اب وہ دوسروں کے رحم و کرم پر تھی۔آصف خاں کی کوششوں سے شاہ جہاں تخت پر بیٹھا اور اس نے نور جہاں سے بڑا اچھا سلوک کیا۔اس نے فیاضی سے کام لیتے ہوئے نور جہاں کے لئے معقول پنشن مقرر کردی۔جہانگیر کی موت کے بعد نور جہاں کا دل دنیا سے اچاٹ ہوچکا تھا۔اس نے آخری عمر میں لاہور کے کسی علاقے میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔وہ بڑی سادہ اور خاموش زندگی بسر کرتی تھی۔اسے وظیفہ کی جتنی رقم ملتی وہ سب صدقہ و خیرات اور حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف کردیتی تھی۔قیام لاہور کے دوران اس کی ایک ہی مصروفیت ہوتی تھی وہ اپنی ذاتی نگرانی میں شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ بنوانے میں مصروف رہتی تھی۔پاکستان کی یہ خوبصورت عمارت اپنی دلکشی، دلآویزی اور حسن و جمال کے لئے نور جہاں کے پاکیزہ ذوق کی رہین منت ہے۔اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے باپ اعتمادالدولہ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا جو اس کی تعمیری صلاحیتوں اور جدتوں کا زندہ ثبوت ہے۔یہ مقبرہ نور جہاں کے حسین اور خوبصورت ذہن کی مکمل

تصویر ہے جس کی نظیر پورے مغل فن تعمیر میں نہیں ملتی۔ جہانگیر کی وفات کے بعد نور جہاں اٹھارہ برس تک زندہ رہی مگر وہ اپنے لئے کوئی مقبرہ تعمیر نہ کرا سکی۔ آج وہ جہانگیر کے حسین وجمیل اور خوب صورت مقبرے کے پہلو میں ایک شکستہ حال اور بوسیدہ سی قبر میں دفن ہے جہاں قدم رکھتے ہی زندگی کی بے ثباتی کا احساس دل و دماغ کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔ نور جہاں کی خاموش، تاریک اور ویران سی قبر سوچنے والوں کے لئے ایک درس عبرت ہے اور ان لوگوں کے لئے نشان ہدایت جو دنیا کی عظمت و شوکت اور چند روزہ زندگی کی قصر نازک کی آرائش و زیبائش کے لئے ہر بڑے سے بڑے گناہ اور بدترین ذلت کو گلے لگا لیتے ہیں اور اس دن کو بھول جاتے ہیں جب وہ خود مٹ جائیں گے مگر ان کے گناہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

نور جہاں کی شاہانہ حشمت و شوکت تو قصۂ پارینہ بن کر تاریخ کے اوراق میں دفن ہو چکی ہے۔ مگر اپنے شوہر سے اس کی محبت، وفاداری اور خدمت گزاری آج بھی اس کے لئے دلوں میں احترام کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔

شہزادی زیب النساء

ایک زاہد و عابد باپ کی پرہیزگار اور متقی بیٹی جو علم و فضل کا سرچشمہ بن کر انسانی قلوب کو سیراب کرتی رہی جو عصمت و عفت اور شرم و حیاء کا پیکر بن کر زندہ رہی، خدا اور اس کے رسول ﷺ کی محبت جس کا زیور حیات تھی۔

زیب النساء نام تھا بعض روایات کے مطابق زبیدہ بیگم کے نام سے مشہور تھیں۔شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی لخت جگر تھیں۔عالمگیر کی ایرانی بیگم والرس بانو بیگم کے بطن سے تھیں۔صحیح تاریخ پیدائش کا تعین نہیں ہوسکا ایک غیر معتبر روایت کے مطابق پیدائش ۱۶۳۸ء کے لگ بھگ ہے۔

شہنشاہ عالمگیر نے اپنی ہونہار نور نظر کی تعلیم و تربیت کے لئے وقت کے مایۂ ناز علماء کو مامور کیا تھا۔شہزادی نے کم سنی میں روشن آراء بیگم سے قرآن حفظ کیا۔شہنشاہ عالمگیر نے جب اپنی معصوم اور ننھی بیٹی سے قرأت کے ساتھ قرآن کریم سنا تو بے حد مسرور ہوئے اور زیب النساء کو تین ہزار اشرفیاں انعام میں دیں۔اس دور کے نامور عالم ملا جیون سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ملا جیون اورنگ زیب عالمگیر کے بھی استاد رہ چکے تھے شہزادی زیب النساء اعلیٰ پایہ کی خوشنویس تھیں وہ نستعلیق، نسخ اور شکست وغیرہ ہر قسم کے خطوط لکھنے میں مہارت تامہ رکھتی تھیں۔شعر و ادب پر بھی بہت عبور حاصل تھا کیونکہ وہ خود ایک باکمال اور قادر الکلام شاعرہ تھیں۔زیب النساء کے

پاس ایک نہایت عمدہ لائبریری بھی تھی جس میں کئی بیش قیمت اور نادر علمی کتب تھیں۔ وہ لائبریری ان کے بلند علمی اور ادبی ذوق کی آئینہ دار تھی۔ وقت کے مشاہیر علماء اور شعراء ان کے آستانے پر حاضر ہوا کرتے تھے۔ شہزادی زیب النساء کو علم وفضل سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ انہوں کے عمر بھر شادی نہیں کی۔ ان کی پاکیزہ اور بے داغ زندگی کے اس خلاء سے بعض متعصب ہندو مؤرخیں نے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس باعصمت پردہ نشین خاتون کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ شہنشاہ عالم گیر سے متعصب ہندو مؤرخین کو خدا واسطے کا بیر ہمیشہ رہا ہے کیونکہ خاندان مغلیہ کا وہ پہلا اور آخری فرمانروا تھا جس نے شرعی احکام اور اسلامی اصولوں کو سیاسی مصلحتوں اور شاہی خودغرضیوں پر قربان کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ انہیں اسلام سے والہانہ عشق تھا۔ جہاں ان کی اپنی زندگی تقوے وطہارت سے مزین تھی وہاں وہ امور سلطنت میں بھی شعائر اسلامی کو دوسری تمام باتوں پر فوقیت دینے کے عادی تھے۔ شہنشاہ عالم کا یہی قصور تھا جو ہندوؤں کے نزدیک آج تک ناقابل معافی ہے۔ انہوں نے موحد ہوتے ہوئے ان کے معبدوں اور بت خانوں میں حاضری نہیں دی اور ان کی مشرکانہ رسوم میں شرکت نہیں کی۔ انہوں نے دربار شاہی اور قصر حکومت کو ہر قسم کے سامان لہو ولعب سے پاک کر دیا۔ اور حکومت کو صحیح اسلامی رنگ دینے کی کوشش میں زندگی صرف کر دی۔ اسی وجہ سے ہندو مؤرخ انہیں تنگ نظر کٹر، متعصب اور ہندو جاتی کا دشمن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اسی ذہنی عداوت اور مخاصمت کی وجہ سے شہنشاہ کی عفیفہ اور پاکباز بیٹی ان مؤرخین کی بے بنیاد افسانہ طرازیوں کا شکار ہوئی اور ان بداندیشوں نے اس زاہدہ اور عابدہ خاتون کو زبردستی ایک شخص عاقل سے وابستہ کر کے بدنام کرنے کی کوشش کی جسے ایک انصاف پسند ہندو مؤرخ مسٹر جادو ناتھ سرکار نے پوری طرح بے نقاب کیا ہے۔ انہوں نے مستند تاریخ حوالوں سے اس کذب بیانی کی واضح الفاظ میں

پرزور تردید کی ہے پٹنہ کالج کے اس مشہور مؤرخ نے تیس برس کی مکمل تحقیق کے بعد شہزادی زیب النساء کے متعلق لکھا ہے کہ شہزادی سے متعلق یہ ناپاک افسانے انیسویں صدی کے اردو افسانہ نگاروں کی اختراع وایجاد ہیں ورنہ عاقل خاں کا یہ واقعہ کسی مستند اور قابل اعتماد تاریخ میں مذکور نہیں بلکہ تاریخی شواہد سرے سے اس کی نفی کرتے ہیں حتی کہ مغربی مؤرخین نے بھی جو کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ شہزادی زیب النساء انتہائی نیک، خدا پرست، پابند شریعت، اور عبادت گزار تھیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ علمی مصروفیات اور زہد وعبادت میں بسر ہوا ہے۔ شہنشاہ عالم گیر ان کے اعلیٰ اوصاف اور بلند کرداری کی وجہ سے انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنی دیندار اور عالمہ بیٹی پر فخر کیا کرتے تھے۔ قصر شاہی میں صرف زیب النساء کو یہ غیر معمولی اہمیت اور حیثیت حاصل تھی کہ شہنشاہ ان کے مشوروں کو بہت قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی اصابت رائے کی تعریف کرتے تھے۔ شہزادی اربابِ علم وفضل کی بہت قدر دان تھیں اور انہیں خطیر رقوم انعام میں دیا کرتی تھیں۔ دیگر زبانوں کی تصانیف کے تراجم ان کا محبوب علمی شغل تھا۔ ان تراجم میں زیب التفاسیر بہت مشہور ہے۔ یہ قرآن مجید کی مشہور تفسیر تفسیر کبیر کا ترجمہ ہے۔ اصل کتاب امام فخر الدین رازی کی تصنیف ہے۔ شہزادی زیب النساء نے اس تفسیر کا ترجمہ کرتے وقت ملا شفیع الدین عرض بیگی سے بہت مدد ملی تھی۔

فی البدیہہ فارسی شاعری میں وہ بے مثل تھیں۔ ان کے اشعار بہت برجستہ اور اثر آفرین ہوتے تھے۔ بعض قدیم کتب میں کئی مقامات پر ان کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ جن سے شہزادی کی قادر الکلامی اور پختہ گوئی کی شہادت ملتی ہے بازار میں ایک دیوان بھی ملتا ہے جو ان کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے مگر وہ تاریخی لحاظ سے مستند نہیں ہے۔

شہزادی زیب النساء کی دانش مندی اور ذہانت کا اندازہ کرنے کے لئے ایک

ہی واقعہ کا ذکر کافی ہے جب اورنگ زیب عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ نے دکن کے قطب شاہی اور عادل شاہی خاندان کو ختم کر کے ان کے علاقے سلطنت مغلیہ میں شامل کر لئے تو فتح کی خوشی میں ایک بہت بڑا جشن منعقد کیا۔ تمام امرائے دربار اور روساے سلطنت نے مبارکبادیں پیش کیں اور نذرانے گزارے لیکن شہزادی زیب النساء خاموش رہی معاً بادشاہ کو خیال آیا تو پوچھا کہ ہماری بیٹی زیب النساء نے ہمیں مبارکباد نہیں دی شہزادی نے حاضر ہو کر کہا کہ عالیجاہ! یہ کون سی خوشی کی بات ہے جو میں مبارک باد پیش کرتی۔ آپ پہلے شہنشاہ تھے ابوالحسن تانا شاہ اور سکندر عادل شاہ ایسے کئی بادشاہ آپ کے تابع فرمان تھے اور لقب شہنشاہ آپ کو زیب دیتا تھا۔ لیکن آپ نے ان سب کی حکومتیں ختم کر دی ہیں اور ان کے علاقے اپنے قلمرد میں شامل کر لئے ہیں اب آپ کا مرتبہ گھٹ کر صرف بادشاہ رہ گیا ہے۔ پہلے آپ ملک الملوک تھے اب صرف ملک رہ گئے ہیں۔ میں کس بات پر مبارک باد دوں۔ عالم گیر، شہزادی کا یہ جواب سن کر بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ زیب النساء جو کچھ کہتی ہے درست ہے۔

شہزادی نے تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ لاہور میں دفن ہوئی ملتان روڈ پر سمن آباد سے ذرا آگے نواں کوٹ میں ایک شکستہ مقبرہ ان کا مدفن بتایا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس مقبرے کا فرش سنگ مرمر اور سنگ اسود کی نقاشی کا ایک نادر نمونہ تھا۔ مگر سکھوں کے عہد حکومت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حضوری باغ میں بارہ دری کی تعمیر کے لئے اس مقبرے کے تمام قیمتی پتھر اکھاڑ لئے۔ لاہور میں میا بائی کا باغ بھی شہزادی زیب النساء کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

خدا کرے کہ ہماری مسلمان بہنیں اس نیک دل اور عصمت مآب شہزادی کے اچھے اوصاف کو اپنا سکیں تا کہ تاریخ عالم اسی طرح ان کی عظمت اور بلند کرداری کے گیت گاتی رہے۔

قلزم ما ایں چنیں گوہر نزاد
ہیچ را در ایں چنیں دختر نزاد

ہماری قوم میں (شرف النساء) ایسی بلند کردار عورت شاید ہی کبھی پیدا ہوئی ہو اور کسی ماں نے شاید ہی ایسی بیٹی کو جنم دیا ہو۔

آں سراپا ذوق وشوق و درد وداغ
حاکم پنجاب را چشم و چراغ

یہ خاتون جو ہر وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہتی تھی فقر وغنا اور عشق وشوق کا مجسمہ تھی پنجاب کے حاکم کی بیٹی تھی۔

تاز قرآں پاک مے سوزد وجود
از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود

اس کی زندگی کی تپش اور حرارت قرآن پاک سے تھی اور ایک لمحہ بھی تلاوتِ قرآن سے فارغ نہ رہتی تھی۔

در کمر تیغ دورد قرآں بدست
تن بدن ہوش وحواس اللہ مست

اس کی کمر میں تلوار اور ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا اور ہر وقت اللہ کی محبت سے سرشار اور بے خود رہتی تھی۔

خلوت و شمشیر و قرآں و نماز
اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز

اس کی زندگی خلوت وتنہائی، تلوار، قرآن اور نماز سے عبارت تھی۔ کیسی مبارک زندگی تھی جو اللہ کی محبت میں بسر ہوگئی۔

برلبِ او چوں دم آخر رسید
سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید

جب اس کا دمِ آخریں قریب آیا تو اس نے بڑے اشتیاق کے ساتھ ماں کی طرف دیکھا۔

گفت اگر از رازِ من داری خبر
سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر

اور کہا آپ کو میری زندگی کے راز کا علم ہے تو اس تلوار اور قرآن مجید کی طرف دیکھیے۔

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائناتِ زندگی را محور اند

یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں اور مسلمان کے لیے زندگی کا محور یہی دو چیزیں ہیں۔

وقتِ رخصت باتو دارم ایں سخن
تیغ و قرآں را جدا از من مکن

آپ سے رخصت ہوتے وقت میں صرف اپنی اس خواہش کا اظہار کرنا چاہتی ہوں کہ اس تلوار اور قرآن کو مجھ سے جدا نہ کریں اور میرے مرنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہنے دیں۔

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ مارا ہمیں ساماں بس است

(مجھے اپنی قبر کے لیے کسی عالیشان مقبرے اور گنبد کی ضرورت نہیں) میری تربت کے لیے یہی سامان کافی ہے کیونکہ مومن کو تلوار اور قرآن کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

عارفۂ ملت شرف النساء بیگم

اٹھارھویں صدی کے اوائل میں جب کہ دولت مغلیہ کی عظمت وسطوت کا آفتاب تیزی سے غروب ہو رہا تھا اور ہر طرف زوال وانحطاط کے منحوس سائے رینگ رہے تھے پنجاب کے وائسرائے نواب عبدالصمد خاں کے گھر میں اپنے دور کی یہ عظیم ترین اور رفیع الشان خاتون پیدا ہوئی جس کی عارفانہ اور مقدس زندگی کے نور سے خاک پنجاب کا ہر ذرہ رشک قمر بن کر چمکنے لگا۔ شرف النساء بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ آپ کے والد نواب عبدالصمد شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کے عہد حکومت میں بخارا سے ہجرت کر کے دلی آئے۔ شہنشاہ نے اس یگانہ روزگار ہستی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی قدر و منزلت سے پیش آئے۔ نواب عبدالصمد اپنی قابلیت اور لیاقت کی بدولت بہت جلد ترقی کر کے پنج ہزاری کے منصب پر پہنچے۔ سیف الدولہ اور دلیر جنگ کے خطابات حاصل کئے۔ آپ اعتماد الدولہ محمد امین خاں بہادر کے ہم زلف تھے اور خواجہ عبداللہ احرار کی اولاد سے ہونے کے باعث گھرانے کے سب لوگ بے حد دیندار متشرع اور خدا پرست تھے۔

۱۷۱۲ء میں فرخ سیر نے نواب عبدالصمد کو پنجاب کا وائسرائے مقرر کر کے بھیجا۔ کیونکہ سکھوں کے ایک مذہبی گورو بندہ بیراگی نے پنجاب کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اور انہیں لرزہ خیز مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ نواب عبدالصمد نے آتے ہی اکتوبر ۱۷۱۳ء میں سکھوں کا مرکز لوہ گڑھ فتح کر لیا۔ اور بندہ بے راگی شکست کھا کر پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ انہوں نے دو سال کے عرصے میں سکھوں کو پے در پے ذلت آمیز شکستیں دیں مگر بندہ بیراگی گرفتار نہ ہو سکا۔ اپریل ۱۷۱۵ء میں نواب نے تیس ہزار فوج کے ساتھ اس کی گڑھی گرداس ننگل کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ آٹھ ماہ تک جاری

رہا۔ آخر سکھوں نے بھوک سے تنگ آ کر ہتھیار ڈال دیئے اور بندہ بیراگی اسی سال دسمبر میں زندہ گرفتار ہو گیا جسے شرف النساء بیگم کے بھائی نواب ذکریا خاں عرف خان بہادر خاں سات سو چالیس قیدیوں کے ساتھ شہنشاہ کے حضور میں دلی لے گئے۔

شرف النساء بیگم کے خاندانی حالات اور اس وقت کی سیاسی فضاء کو سامنے رکھتے ہوئے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ اس مخدرہ عصمت مآب نے کس قسم کے ماحول میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اگرچہ اس سلسلے میں مستند تاریخی روایات موجود نہیں ہیں کیونکہ نواب عبدالصمد کے دیندار خاندان کی خواتین پردہ کی سخت پابند تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس عہد کے مورخین ان کی مستور و محجوب عظمت اور آفتاب و ماہتاب کو شرمادینے والی درخشندگی کو تفصیل کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر منتقل نہ کر سکے۔ مگر اس خاندان کی عظیم ترین دوشیزہ شرف النساء بیگم کے بے نظیر کردار کی پاکیزہ روشنی ایسی تھی کہ حرم کی چار دیواری اسے چھپانے میں ناکام رہی اور اس کا نور چاندنی بن کر دنیائے قلب و نظر پر غیر محسوس طریقے سے اس طرح چھا گیا کہ آج بھی روح اس کی کیفیت آفرینی سے جھوم جھوم جاتی ہے۔ اگرچہ اس وقت شرف النساء کی بے ریا اور پاک زندگی کا بھرپور خلوص ان کے اور عوام کے درمیان پردہ بن کر حائل رہا مگر ایک صدی گزرنے سے قبل ہی وقت کے ہاتھ نے اس پردے کو الٹ دیا اور کئی برسوں کے بعد حکیم مشرق حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے معجز نگار قلم نے اس عارفۂ ملت کی سیرت کا ایک جلوہ دیکھا کر دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر شرف النساء بیگم کی زندگی پوری تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتی تو آج یہ ثابت ہو جاتا کہ برصغیر پاک و ہند کی کوئی بڑی سے بڑی خاتون بھی اس کی عظمت کے سامنے گرد راہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

حالات و قرائن سے جو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شرف النساء نے بچپن ہی سے اسلام کی ٹھوس اور بنیادی تعلیم حاصل کی تھی اور ان کی بصیرت کو قرآنی حقائق و معارف نے خوب روشن کر دیا تھا۔ حصول تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے یقیناً صاحب دل اور حقیقت شناس اساتذہ سے فیض حاصل کیا تھا۔ گھر کی فضاء ہر وقت

ذکر الٰہی اور تسبیح تحمید کے قدسی نغمات سے معمور رہتی تھی۔ قلوب اللہ اور رسول کی بے پناہ محبت سے سرشار تھے احکام الٰہی کی پابندی انہیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ محبوب اور عزیز تھی۔ زندگی سادگی اور استغفاء کی رعنائیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شرف النساء کے باپ اور بھائی ہر وقت سکھوں کے خلاف مصروف جہاد رہتے تھے۔ ان کی شجاعت آموز آنکھوں میں ہر وقت شہادت کی تمنا جھلکتی نظر آتی تھی۔ اس خاندان کا ہر فرد جانتا تھا کہ پانچ دریاؤں کے آغوش میں نشو ونما پانے والا سکھوں کی شوریدہ سری کا فتنہ مسلمانوں اور اسلام کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ تھا کیونکہ نواب عبدالصمد کے پنجاب میں آنے سے قبل سکھوں نے جو قیامت برپا کر رکھی تھی اور بے بس و مجبور مسلمانوں کے خون کو جس طرح ارزاں کر دیا تھا اس سے سب واقف تھے۔ ان حالات سے حرم میں خاموش زندگی بسر کرنے والی عصمت مآب خواتین تک بھی اچھی طرح باخبر تھیں۔ یہ سب عناصر اور احساسات لازمی طور پر شرف النساء کی تربیت میں شامل رہے ہوں گے۔ اس دور کے تاریخی تذکروں سے یہ بات ثابت ہے کہ شرف النساء کو قرآن کریم سے والہانہ عشق تھا۔ اس مومنہ کی پوری زندگی فقر و استغناء کا ایک ایسا شگفتہ پھول تھی جس کی مہک سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا گلستان وجود ہمیشہ بہار بداماں رہے گا اس وقت پنجاب کی کفر و شرک سے معمور فضاء میں شرف النساء کی پرسوز اور دل گداز قرأت مسلمانوں کے لئے حیاتِ نو کا ایک پیغام تھی۔ نواب عبدالصمد کے محل میں نغمہ افلاک بن کر گونجنے والی یہ مقدس آواز اپنے ہر زیر و بم کے ساتھ مسلمانوں کو یہ درس دیتی تھی۔ کہ اگر دنیا میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہو تو زندگی کے اسلوب اس عظیم کتابِ الٰہی میں تلاش کرو جسے تم نے گلدستہ طاق نسیاں بنا رکھا ہے۔ ورنہ یاد رکھو! پنجاب کے یہ خونخوار سکھ تمہاری بے عملی، خدا فراموشی اور اسلام سے بیوفائی کی عبرت ناک سزا بن جائیں گے۔ اللہ کا قہر تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ دستِ قدرت اپنے آئین کے مطابق تمہارا احتساب کرنے کے لئے حرکت میں آنے والا ہے۔ اور یاد رکھو! خدا صرف اس لئے تمہاری مدد نہیں کرے گا کہ تم مسلمان کہلاتے ہو اور مسلمانوں کے

گھروں میں پیدا ہونے کی وجہ سے تمہارے نام مسلمانوں ایسے ہیں کیونکہ وہ صرف ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

شرف النساء تنہائی اور خلوت میں بڑی رقت اور خضوع کے ساتھ تلاوتِ قرآن مجید میں منہمک رہا کرتی تھیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک خوبصورت چبوترہ محل کے ساتھ ہی تعمیر کرایا تھا جس کے اردگرد خوش نما باغات اور حوض بنوائے گئے۔ چاروں طرف سرو کے خوبصورت درخت لگائے گئے جو مغلوں کے فن تعمیر میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ یہ کمرہ پندرہ فٹ آٹھ انچ کی بلندی پر ہے اور اس کا رقبہ تیرہ فٹ دو مربع انچ کے قریب ہے اس چبوترے تک جانے کے لئے کوئی مستقل سیڑھی نہیں بنائی گئی۔ بلکہ آج تک لکڑی کی سیڑھی استعمال کی جاتی ہے۔ یہی وہ تاریخی عمارت ہے جو شرف النساء کی قدسی آواز سے گونجا کرتی تھی۔ جس کی فضاء میں آج بھی ان کی قرأت کے کیف آفرین قرآنی نغمات محفوظ ہیں۔ اس پاکیزہ عمارت کے درودیوار اگرچہ شاہانہ عظمت وشوکت سے محروم ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے ہر ذرے میں عرفان وحقیقت کے کئی تاج محل پوشیدہ ہیں۔ اس کی ہر اینٹ میں الحمراء کا حسن وجمال پنہاں ہے اور اس کے ہر ریزہ سنگ میں شمس وقمر کی آبرو جھلک رہی ہے۔ یہی وہ مختصر سا کمرہ ہے۔ جہاں شرف النساء روزانہ خلوت میں قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتی تھیں۔ بخدا! اس تجلہ تقدس پر دیوانہائے خاص وعام اور کروڑوں شیش محل قربان کئے جا سکتے ہیں۔ دو صدیاں قبل اس جگہ سرو کے دلکش درختوں کی اوٹ میں عرفان وحقیقت کا ایک ایسا چشمہ بہتا تھا جس کے ترنم سے ملائک وجد میں آجاتے تھے اور آسمان کی رفعتوں سے انوار الٰہی سدا بہار پھول بن کر یہاں برستے تھے۔ شاید آپ یہ خیال کریں کہ قرآن مجید سے شرف النساء کا یہ شغف اور بے پناہ ذوق وشوق صرف تلاوت تک محدود تھا اور وہ محض حصول ثواب کے لئے ایسا کرتی تھیں۔ ہرگز نہیں شرف النساء کی زندگی کا جتنا حصہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ وہ اس بات کا شاہد ہے کہ قرآن ان کے جذب دروں میں آباد ہو چکا تھا۔ ان کی زندگی قرآن کے اسرار ورموز اور حقائق ومعارف میں ڈوب چکی تھی۔ قرآن مجید سے شرف النساء کا

والہانہ عشق ایک مومنہ اور مجاہدہ کا عشق تھا۔ وہ واقف اسرار پنہاں تھیں۔ ان کی بصیرت قرآن کے ہر لفظ کی گہرائی کو چھونے کی عادی تھی۔ وہ پیکر عمل تھیں اور جوش کردار کی حسین وجمیل علامت تھیں۔ زندگی بھران کا یہ معمول رہا کہ وہ روزانہ اس چبوترے پر قرآن خوانی کے لئے اس شان سے تشریف لایا کرتی تھیں کہ آنکھوں میں ملائک کی حیا، چال میں حوروں کا تقدس اور چہرے پر ایک باعمل مومنہ کا جلال و جمال محیط ہوتا تھا۔ ان کے پہلو میں ایک مرصع اور زرنگار شمشیر لٹکتی رہتی تھی جوان سے کسی وقت علیحدہ نہ ہوتی۔ کہتے ہیں کہ ہنگامِ تلاوت وہ اس شمشیر کو اپنے سامنے رکھتی تھیں۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اسی طرح خاموش عبادت اور ریاضت میں بسر کردی۔ جب وقت آخر قریب آیا تو رحلت سے پہلے اپنی والدہ ماجدہ کو وصیت کی کہ مجھے اسی چبوترے میں دفن کیا جائے۔ میری یہ دونوں چیزیں جو مجھے عمر بھر محبوب رہی ہیں یعنی قرآن اور تلوار میرے ساتھ دفن کی جائیں۔ آپ کی وفات کے بعد وصیت کے مطابق وہی چبوترہ ان کا مدفن بنا شرف النساء کی خواہش کے مطابق قرآن مجید اور شمشیر قبر کے تعویذ پر رکھ دیئے گئے اور اس چبوترے کے اوپر ایک چھوٹا سا قبہ تعمیر کردیا گیا۔ اس چبوترے کا دروازہ پختہ اینٹوں کی دیوار سے بند کردیا گیا تاکہ اندر جانے کے لئے کوئی راستہ نہ رہے۔ خاک لاہور کو یہ شرف حاصل ہے کہ دوسرے کئی صاحب کرامت بزرگوں اور عظمت مآب شہنشاہوں کے علاوہ اس کے سینے میں شرف النساء ایسی بے نظیر، فقید المثال خاتون آرام فرما ہے۔ شرف النساء کا مقبرہ شالیمار کو جاتے ہوئے دائی انگا کے مقبرے کے شمال میں چند قدم کے فاصلے پر آج بھی موجود ہے۔ جس کے چاروں طرف کثرت سے سرو کے درخت ہونے کی وجہ سے سرو والا مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔ اور بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ عام شاہرہ سے ہٹ کر ایک کونے میں دنیائے اسلام کی ایک ایسی شخصیت محو خواب ہے۔ جس کی مستور عظمت لاثانی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مختصر اور سادہ پختہ مقبرہ انیس فٹ طول اور انیس فٹ عرض کے قطعہ زمین پر تعمیر کیا گیا ہے۔ چھجے سمیت اس کی بلندی ساڑھے اڑتالیس فٹ کے قریب ہے۔ محکمہ آثار قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق یہ مقبرہ دور مغلیہ کی ان تعمیرات کی آخری

کڑی ہے جن کے حسین وجمیل نقوش کو سرو کے درخت دوبالا کرتے ہیں۔ اس مقبرے کے انداز تعمیر سے بھی شرف النساء کی عابدانہ اور عارفانہ زندگی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے وفات کے بعد بھی اپنے تقدس اور حجاب پسندی کو کس طرح پیش نظر رکھا۔ شرف النساء کے بھائی نواب زکریا خاں جو تاریخ پنجاب کی ایک معروف شخصیت تھے۔ اپنے باپ کی وفات کے بعد پنجاب کے وائسرائے مقرر ہوئے اور ۱۷۷۵ء میں فوت ہوئے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اس مقبرے کے باغات اور چشموں کو وسعت دی ہو۔ سید عبداللطیف نے تاریخ لاہور میں ایک خوب صورت باغ اور حوض کی نشان دہی کی ہے۔ مگر اب اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ افسوس ہے کہ شرف النساء کی تاریخ پیدائش اور وفات سے متعلق کوئی قابل اعتماد روایت نہیں ملتی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۷۴۰ء تک قرآن کریم اور مرصع شمشیر بدستور شرف النساء کی قبر کی تعویذ پر موجود رہے۔ مگر جب سکھ باہمی خانہ جنگی کا شکار ہوئے اور پنجاب میں ہر طرف طوائف الملوکی پھیل گئی تو ایک لالچی سکھ نے اس خیال سے شرف النساء کے مقبرے کا دروازہ منہدم کردیا کہ شاید اس میں مال و دولت بند ہو۔ وہاں اس درندہ صفت انسان کو اور تو کچھ نہ ملا۔ وہ اس مخدرہ عصمت کی تاریخی تلوار اور قرآن چوری کرکے لے گیا۔ افسوس ہے کہ اس عظیم خاتون نے اپنی جن دو محبوب چیزوں کو مرنے کے بعد بھی جدا کرنا گوارا نہ کیا، وقت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں لوٹ لیا اور آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ شرف النساء کی یہ تاریخی امانت کہاں گئی۔

اس عالی مرتبت اور اسلام کی عاشق خاتون کے حالات پر صدیوں تک پردہ پڑا رہا۔ مؤرخین نے نواب عبدالصمد اور زکریا خاں کے حالات میں ان کا سرسری سا ذکر کرنے پر اکتفا کیا۔ جس کی وجوہ پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں۔ عرصہ دراز کے بعد حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے پہلی مرتبہ جاوید نامہ میں ان کی عظمت اور بلند کرداری سے پردہ سرکایا تو لوگ شرف النساء کے نام سے قدرے واقف ہوئے۔ علامہ مرحوم نے جس عقیدت اور ارادت کے ساتھ اس عارفہ ملت کا ذکر کیا ہے اس سے شرف النساء کے مرتبہ کا

اچھی طرح انداز ہ ہوسکتا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ کسی ماں نے اس عظمت کردار کی مالک بیٹی جنی ہی نہیں اور ہماری ملت کے بحر پایاب میں آج تک کوئی ایسا موتی پیدا نہیں ہوا۔

شرف النساء کی زندگی ہماری قوم کے لئے پیغام عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اگر ان کے زندگی بھر کے معمول پر غور کیا جائے تو شرف النساء ہمیں ایک بہت بڑی حقیقت سے روشناس کراتی ہیں۔ ان کی زندگی کی تفسیر یہ ہے کہ قرآن مؤمن کا جمال اور تلوار اس کا جلال ہے۔ ایک سچے مسلمان کی زندگی ان ہی دو عناصر سے بنتی ہے شرف النساء ہمیں بتاتی ہیں کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں انسان کی انفرادی زندگی کے معمولی مسائل سے لے کر اجتماعی زندگی کے بڑے بڑے پیچیدہ معاملات تک کے لئے ہدایت موجود ہے۔ ایک اسلامی سوسائٹی میں گدائے بے نوا کی تیرہ و تار جھونپڑی سے لے کر دربار شاہی تک اور بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اور پیدائش سے لے کر موت تک مسلمان کا ہر فعل اور ہر کام قرآن کی حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ قرآن ایک غیر متبدل اور اٹل آئین فطرت ہے جو ہمیں ایک مسلمان کی طرح زندہ رہنے کے اسلوب سکھاتا ہے۔ قرآن مسلمانوں کی عظمت اور سلطنت ہے اور تلوار اس کی محافظ ہے۔ اس حقیقت سے آج بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ کسی ملک کا آئین حکومت کیسا ہی بے نظیر اور مکمل کیوں نہ ہو۔ اگر اس کی حفاظت کے لئے اس ملک کے پاس فوج نہ ہو۔ اور اس قوم کے افراد میں دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ ہو۔ تو وہ چند سال بعد ہی اپنے آئین سمیت تاریخ کے اوراق میں دفن ہو جائے گا کیونکہ دشمن قوتیں اسے کبھی زندہ نہ رہنے دیں گی۔ شرف النساء کی زندگی بھی اسی حقیقت کی آئین دار ہے۔ وہ عرفان حقیقت تک پہنچنے کے بعد ہمیں یہ درس دیتی ہیں۔ کہ اسلام قرآن کی صورت میں دنیائے انسانیت کے لئے ایک رحمت بن کر آیا ہے۔ یہ انسان کی حقیقی آزادی اور عظمت کا علمبردار ہے اور اس کی تعلیم پر عمل پیرا ہو کر ہم ضمیر کائنات کو بدل سکتے ہیں۔ ہم دنیا کو حقیقی مساوات، محبت و اخوت، ایثار و قربانی، شفقت و محبت، ہمدردی و غمگساری، آزادی و

حریت، حق و صداقت اور عدل و انصاف کی جنت بنا سکتے ہیں۔ قرآن پاک کے پیدا کردہ ان بلند اوصاف سے متصف ہو کر ہی ہم خلافت ارضی کے حق دار بن سکتے ہیں۔ یہ اوصاف ایک ایسی طاقت ہیں۔ جو دنیائے قلب و نظر میں انقلاب برپا کر دیتی ہے اور کائنات ہستی کی ہر عظمت اور ہر بلندی مومن کے قدموں پر سجدہ ریز ہو جاتی ہے لیکن دنیا کبھی بدی کی شیطانی قوت سے خالی نہیں رہتی۔ اور یہ طاقت ہر وقت نیکی کو فنا کر دینے کے لئے کمر بستہ رہتی ہے۔ اس لئے مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ بدی کی ہر بڑی سے بڑی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہے۔ اس کے بغیر ظلم و تشدد اور جبر و استبداد کو سرنگوں کرنا ممکن نہیں۔ انسان اس عالم کون و مکان میں صرف نیکی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے لئے نیکی کی حفاظت بھی ناگزیر ہوتی ہے۔ شرف النساء کی زندگی اس مسلک کی طرف عملی اشارہ ہے کہ قرآن اگر بلند ترین اور اکمل ترین زندگی کا نام ہے تو تلوار اس کی حفاظت کا ایک ذریعہ ہے اور یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں۔ اسی طرح اگر مسلمان کی زندگی سے قرآن خارج ہو جائے تو ایک وحشی، درندہ اور ظالم باقی رہ جاتی ہے۔ صرف طاقت جہالت اور جور و استبداد کا نام ہے۔ اگر تلوار کی قوت ہر قید و بند سے آزاد ہو تو وہ صرف ہلاکو اور چنگیز پیدا کرتی ہے۔ ظلم و جور اور سفا کی اس کا قانون ہوتا ہے۔ لیکن اگر تلوار کی قوت قرآن کی زیر سایہ رہے تو تاریخ کا دامن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، حضرت علی المرتضےٰ رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ، صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم اور عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ ایسے حکمرانوں اور فاتحین سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ شرف النساء کی بصیرت نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ صرف تلوار، ہلاکت اور چنگیزی کا نام ہے۔ قہر و تشدد اور ظلم و عدوان کی علامت ہے اور صرف قرآن کی سطحی پابندی کمزوری ہے جو بدی کی طاقتوں کو پائمال کر دینے کی دعوت دیتی ہے۔ مسلمان خیر و شر کی اس دنیا میں اسی صورت زندہ رہ سکتا ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہو قرآن سے وہ انسانی دنیا کو رشک فردوس بناتا جائے، اسے گہوارہ امن

امان میں بدلتا رہے اور تلوار سے اس کی حفاظت کا کام لیتا رہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ تلوار کی طاقت سے دوسروں کو مطیع و فرمانبردار بناؤ۔ اور قرآن سے جبراً ان کے عقائد و مذاہب تبدیل کرو۔ اس قسم کی غلط فہمیاں متعصب اور تنگ نظر مؤرخوں نے پیدا کی ہیں۔ اس مسلک کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کے اعجاز اور اس کی اخلاقی طاقت سے دلوں کو مسخر کرو۔ خود دوسروں کے لئے نمونہ بنو اور ان کے قلب و ذہن کو اللہ کے نور سے اس طرح روشن کرو کہ وہ انسانوں کے سامنے جھکنا چھوڑ دیں۔ صرف اپنے خالق کے مطیع و فرماں بردار بن کر زندہ رہنا سیکھ جائیں۔ پھر تلوار سے ان کی حفاظت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ بدی کی طاقت ان پر عرصہ حیات تنگ کر دے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی قوم نے اپنے بلند اصولوں کو چھوڑ دیا اور اپنے مذہب کو عیش و عشرت، بدکرداری اور بے عملی کا جواز بنالیا تو وہ دونوں طاقتوں سے محروم ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ خود مسلمانوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے جب بھی صرف تلوار پر بھروسہ کیا اور قرآن کی تعلیم کو فراموش کر دیا تو ہم ظلم و ستم کی انتہا تک جا پہنچے۔ اور یہی انتہا ہمارے زوال کا باعث بنی۔ اس کے برعکس جب بھی ہم نے قرآن کی تعلیم کو لغوی بکھیڑوں میں الجھا دیا، اپنی سارئ قوت جامد و ساکت تصوف اور بے روح عبادات پر صرف کرنا شروع کر دی۔ اور تلوار کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا تو بدی کی کوئی نہ کوئی طاقت قہر الٰہی بن کر نازل ہو گئی۔ ہم نہ صرف تباہ و برباد ہوئے بلکہ صدیوں تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہے اور ذلت و نکبت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے۔ ایسا کیوں ہوا۔ صرف اس لئے کہ ہم بھول گئے کہ قرآن اور تلوار دو قوتیں ایک دوسرے کی محافظ ہیں۔ اگر ہم خلوص نیت کے ساتھ قرآن پر عمل پیرا رہیں تو خود قرآن کی ہر آیت ہمیں اس حقیقت سے آشنا کر دیتی ہے کہ مومن دنیا میں کمزور اور بے بس بن کر کبھی زندہ نہیں رہتا۔ وہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ دوسروں کے لئے تر نوالا بن جائے اور دشمن جب چاہیں اسے نیست و نابود کر دیں۔ قرآن جس دین قیم کی تعلیم دیتا ہے اس کی حفاظت بھی ہر مومن پر واجب قرار دیتا ہے اسی کو قرآن کے الفاظ میں جہاد کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا پابندِ فرمان مومن کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا

کہ وہ کبھی تلوار کی طاقت سے محروم ہو جائے۔ کافر اور مومن میں یہی فرق ہوتا ہے کہ کافر کی تلوار ہر قید و بند سے آزاد ہوتی ہے۔ مگر مومن کی تلوار ہمیشہ قرآن کے تابع فرمان رہتی ہے۔ کافر ہمیشہ اسے اپنے ذاتی مقاصد اور اپنی اغراض کے لئے بلا امتیاز انسانی خون سے غسل دیتا ہے مگر مومن صرف اللہ کے لئے تلوار بے نیام کرتا ہے جہاں اس کی ذات بیچ میں آ جائے وہ پچھاڑے ہوئے دشمن کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔

شرف النساء ایک باعمل مومنہ تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کو اسی حقیقت کا آئینہ دار بنا رکھا تھا وہ تاریخ اسلام کی پہلی اور آخری خاتون ہیں جن کی سیرت میں جہاں سادگی، عبادت، ریاضت اور تقویٰ کا پہلو نمایاں ہے۔ وہاں بے پناہ فلسفیانہ گہرائی بھی نظر آتی ہے جس کا درس دینے کے لئے انہوں نے اپنی پوری زندگی کو اسی سانچے میں ڈھال کر ایک زندہ جاوید مثال ہمارے سامنے رکھ دی اور خاموش زبان میں کہا اے مسلمان مردو! دنیا میں عظمت و وقار کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو اپنی دنیا کو قرآن اور تلوار کی رفاقت سے آباد رکھو۔ اگر تم نے ان دونوں کو فراموش کر دیا تو خدا تم کو فراموش کر دے گا اور تم ذلیل و خوار کئے جاؤ گے۔۔۔۔ تاریخ سے پوچھئے۔ کیا شرف النساء کی موت کے تھوڑا عرصہ بعد ایسا نہیں ہوا، سکھوں نے مسلمانوں کی عظمت و شوکت کو نہیں لوٹا۔ ان کے خون سے ہولی نہیں کھیلی اور انہیں ذلیل و خوار نہیں کیا؟

ہماری مسلمان بہنوں کو شرف النساء کے اس نور بصیرت پر فخر کرنا چاہئے۔ جس پر ہزاروں فلسفی، لاکھوں علماء اور فضلاء قربان کئے جا سکتے ہیں۔

غور کیجئے کہ شرف النساء کا نام اور ان کی سیرت مفہوم و معانی کے لحاظ سے کس طرح ہم آہنگ ہے۔

حضرت محل

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں جس کی بہادری اور جرأت نے گلستانِ لکھنؤ کے نرم و نازک پھولوں کو آگ کی چنگاریوں میں تبدیل کر دیا۔ جس کی حریت نوازی نے شامِ اودھ کے حسن و جمال کو شعلوں کا پیرہن عطا کر کے ثابت کر دیا کہ ایک محبّ الوطن اور بہادر عورت عیش و عشرت، نزاکت و لطافت، اور تکلفات کی فضا میں سانس لینے والے رنگیلے مردوں کو توپوں کے آتشیں گولوں کے سامنے سینہ سپر ہونے کے قابل بھی بنا سکتی ہے۔

حضرت محل کا نام امراؤ تھا۔ غدر سے نو سال پہلے دسمبر ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ کے مشہور عیش پرست نواب واجد علی شاہ نے امراؤ کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ اور اپنی اس نئی ملکہ کو حضرت محل کا خطاب عطا کیا۔ شادی سے قبل امراؤ شاہی محل میں رقص و سرود کی تعلیم حاصل کرتی تھی۔ مگر جلد ہی اس سانولی لڑکی کی پرکشش شخصیت نے نواب واجد علی شاہ کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ شادی سے پہلے بھی امراؤ کی زندگی محل کی چاردیواری تک محدود تھی مگر شادی کے بعد وہ ملکہ اودھ کی حیثیت سے شاہی رسوم و آداب کی اور زیادہ پابند بنادی گئی۔ اس طرح وہ بیرونی دنیا سے بالکل بے تعلق زندگی بسر کرتی تھی اور اسے حرم سے باہر کے حالات سے کوئی علاقہ نہ ہوتا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اودھ کے اس رنگیلے اور عیش پرست نواب کو تخت و تاج سے معزول کر کے اس کی

قلم روکر سلطنت برطانیہ میں شامل کرلیا۔نواب واجد علی شاہ ایسے راجہ اندر کے لئے یہ ناقابل برداشت صدمہ تھا کہ انگریزوں نے بیک جنبش قلم اس کی آبادکی ہوئی بزم عیش وطرب کو قبرستان کی ویرانی میں تبدیل کردیا۔اور آنکھ جھپکتے ہی وہ بادشاہ سے ایک بے بس و مجبور کاغذی نواب بن کر رہ گیا۔جس کے تمام اختیارات سلب ہو چکے تھے۔

نواب واجد علی شاہ اپنے حاشیہ نشینوں اور مشیروں سے مشورہ کے بعد اپنا مقدمہ لڑنے کے لئے کلکتہ چلے گئے اور اپنی بیوی حضرت محل اور کم سن لڑکے برجیس قدر کو لکھنو چھوڑ گئے۔واجد علی شاہ ابھی کلکتہ میں ہی مقیم تھے کہ غیر منقسم ہندوستان کے طول وعرض میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔اسی بغاوت سے برصغیر کی جنگ آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔۱۸۵۷ء میں اکثر والیان ریاست نے بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا جس میں انگریزوں کی بھرتی کی ہوئی مقامی فوج بھی شامل ہوگئی۔اس جنگ کا آغاز میرٹھ کی فوجی چھاؤنیوں سے ہوا اور جنگل کی آگ کی طرح یہ بغاوت ہندوستان کے اکثر صوبوں میں پھیل گئی۔

اودھ کا دارالسلطنت لکھنؤ اس وقت نواب واجد علیؒ شاہ کی غیر حاضری کی وجہ سے خالی پڑا ہوا تھا کیونکہ انگریزوں نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے انہیں فوراً ہی نظر بند کردیا تھا۔دربار لکھنو کے بااثر امراء پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے شدید مخالف تھے۔چنانچہ ملکی سیاسیات کا نقشہ اس تیزی سے بدلتے دیکھ کر وہ نواب واجد علی شاہ کی دو بڑی بیگمات کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ بیٹوں میں سے کسی ایک کو تخت پر بٹھانے کی اجازت دیں تاکہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا جاسکے مگر ان دونوں نے صاف انکار کردیا۔آخر نواب شمشیر الدولہ بہادر کے مشورے سے واجد علی شاہ کے کم سن بیٹے برجیس قدر کو تخت نشین کرنے کا فیصلہ ہوا اور نواب حضرت محل کو اس کی سرپرست اور مختار کل تسلیم کرلیا گیا۔حضرت محل پردہ میں رہنے کے باوجود بے حد دلیر، باہمت اور جرأت مند خاتون تھیں۔انہوں نے غیر معمولی

شجاعت کا ثبوت دیتے ہوئے اس فیصلے پر مہر تصدیق ثبت کردی چنانچہ ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو چھ بجے شام قصر خاقان میں مرزا برجیس قدر کی تاج پوشی ہوئی۔ نواب واجد علی شاہ کے تمام ممتاز امراء بڑے بڑے عہدوں پر فائز کر دیے گئے اور حضرت محل نے نائب السلطنت کی حیثیت سے یہ خطرناک کام اپنے ذمہ لے کر زندگی کی بازی لگا دی۔ انہوں نے سب سے پہلے اودھ کے تعلقہ داروں کے نام ایک حکم جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ملکِ آبائی خدا نے اب ہمیں عطا کیا ہے۔ انگریز کافروں کو اس ملک سے ختم کرنا سب کا فرض ہے اس لئے اکٹھے ہو کر ہیلی گارد کی باقی فوج کو قتل کر دیا جائے جو اس لڑائی میں حصہ لے گا اس کا نصف علامہ اسے معاف کر دیا جائے گا۔ یہ فرمان جاری ہوتے ہی لوگوں نے انگریز سپاہیوں اور افسروں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا اور صرف گیارہ دن کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ اودھ کے کسی ضلع میں انگریزی حکومت کا کوئی حاکم موجود نہ تھا اور انگریزوں کی حکومت بھولا بسرا خواب معلوم ہوتی تھی۔ تقریباً تمام اضلاع ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے سے نکل چکے تھے اور اکثر تعلقہ داروں نے دیہات پر قبضہ کر لیا تھا۔

اودھ کے طول و عرض میں اب حضرت محل کی حکومت تھی اور برجیس قدر کے نام کا سکہ چلتا تھا۔ حضرت محل نے حیرت انگیز دانش مندی سے کام لیتے ہوئے ایسے پُر خطر حالات میں سلطنت کے بڑے بڑے عہدے دار مقرر کئے۔ ٹیکس کی وصولی کا معقول انتظام کیا اور اپنی انقلابی فوج کو نہایت اچھے پیمانے پر منظم کیا۔ اگرچہ انگریزی عہد کی لکھے ہوئے تذکروں میں حضرت محل کو ایک بے وقوف، جلد باز اور عاقبت نااندیش عورت کے روپ میں پیش کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حضرت محل کی جرأت، بہادری، وطن پرستی، مستعدی اور نیک نفسی ان دنوں ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک ایسی پردہ نشین عورت جس نے عمر بھر بلا ضرورت باہر قدم نہ نکالا تھا اور ان ہنگاموں سے الگ تھلگ زندگی بسر کی تھی اچانک

اس کے کندھوں پر اس قدر بھاری اور اہم ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ کہ پوری مملکتِ اودھ اس کی قیادت میں ایک بہت بڑی غیر ملکی قوت سے نبرد آزما ہوگئی۔ مشہور ہے کہ حضرت محل پردے میں بیٹھ کر دربار کرتی تھیں اور شاہی فرمان جاری کرتی تھیں بلکہ جنگ کے ایام میں وہ اکثر خود گھوڑے پر سوار ہو کر فوج کے ہر دستے کے پاس جا کر سپاہیوں کی ہمت بندھاتی تھیں۔ اس عرصے میں انہیں شاید ہی کسی دن چند گھنٹے سونے کی مہلت نصیب ہوئی ہو ورنہ پوری مملکت کے نظم و نسق کو سنبھالنا اور فوجوں کی قیادت کرنا ایک ناتجربہ کار عورت کے لئے ناممکن تھا۔ ان ہی دونوں ایک اور مجاہد بزرگ مولوی احمد اللہ شاہ اپنے جان نثاروں سمیت لکھنؤ آ گئے اور انہوں نے انگریزوں کے خلاف علیحدہ محاذ قائم کرلیا۔ ملکہ حضرت محل بڑی دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے برجیس قدر کے ساتھ خود ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہیں اپنا سرپرست بنالیا۔ اس طرح شاہ صاحب ان کے مشیر خاص بن گئے۔ حضرت محل نے یہ قدم محض اس لئے اٹھایا تھا کہ جنگ آزادی کی تحریک دو حصوں میں بٹ کر کمزور نہ ہوجائے مگر بعض بااثر امراء کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ انہوں نے اپنی چودھراہٹ خطرے میں دیکھ کر حضرت محل کے خلاف سازشوں کے جال بچھانا شروع کر دیئے اور آخر اس تحریک کے گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ ۳۱ جولائی ۱۸۵۷ء کو مولوی احمد اللہ شاہ کی قیادت میں انگریزوں کی فوج پر حملہ ہوا۔ انگریز تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے قلعہ بند ہو کر لڑ رہے تھے۔ حضرت محل نے فوج میں اعلان کیا کہ ان کے حکم کے مطابق جنگ جاری رکھو، تنخواہ وہی ادا کریں گی۔ یہ اعلان اس لئے کرنا پڑا کہ بعض غداروں نے فوج میں بددلی پھیلانا شروع کردی تھی۔ حملے کے دن حضرت محل ساری رات محاذ پر انتظام میں مصروف رہیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے آرام نہ کیا۔ اگرچہ حضرت محل کے دیوان خاص کے داروغہ میر واجد علی خاں عرف ممو خاں نے موقع پر غداری کی مگر حضرت محل کی فوج نے یہ مورچہ فتح کرلیا۔ عالم باغ کی لڑائی میں راجہ مان سنگھ نے انگریزوں کو

شکست فاش دی تو حضرت محل نے اسے ایک گراں قیمت رومال اور دوشالہ بطور خلعت عطا کیا۔ اس وقت اسی ہزار کے قریب سپاہی حضرت محل کے جھنڈے تلے لڑ رہے تھے کہ کمپنی کے فوجی افسروں نے خفیہ طور پر سازشی لوگوں کی حوصلہ افزائی شروع کر دی۔ چنانچہ حضرت محل کا ایک افسر مہاراجہ بال کرشن انگریزوں سے جا ملا اور اس نے ملکہ کو غلط مشورے دیکر محاذ جنگ کو بے حد کمزور کر دیا۔ ادھر ممو خاں مولوی احمد اللہ شاہ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھا۔ اس حالت میں ایک گورکھا رجمنٹ نے عالم باغ پر حملہ کر دیا اور حضرت محل کی کوٹھی کو گھیر لیا۔ مگر مولوی احمد اللہ شاہ نے اس حملے کو آگے بڑھ کر خود سنبھالا تا کہ حضرت محل کو نکل جانے کا موقع مل جائے۔ حضرت محل وہاں سے نکل کر محل سرائے حسین آباد آ گئیں۔ شام کو علی رضا کے ذریعے انگریز جرنیل کا پیغام ملا کہ کمپنی حکومت واجد علی شاہ کا علاقہ بحال کر دے گی اور اس کی بادشاہی آپ کے سپرد کر دی جائے گی مگر شرط یہ ہے کہ جنگ بند کر دیں اور فوج کا ساتھ چھوڑ دیں۔ حضرت محل نے یہ پیشکش انتہائی حقارت سے ٹھکرا دی اور صلح نامے پر دستخط سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حضرت محل اپنے چھ ہزار مسلح جانثاروں کے ساتھ شاہجہان پہنچ کر دوبارہ جنگ میں شریک ہو گئیں۔ وہاں سید احمد اللہ شاہ انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ساتھیوں کی غداری کی وجہ سے شاہ صاحب کو شکست ہوئی تو حضرت محل اپنے بیٹے برجیس قدر کے ساتھ دریائے گھاگھرا عبور کر کے نیپال کی طرف چلی گئیں۔ طرح طرح کے مصائب برداشت کئے اور اس پر خطر سفر میں ناقابل بیان تکالیف اٹھائیں مگر انگریزوں کے سامنے ذلت و عجز کے ساتھ سر نہیں جھکایا۔ نیپال کے راجہ نے اگرچہ حضرت محل اور شہزادہ برجیس قدر سے اچھا برتاؤ کیا مگر ان کے باقی تمام ساتھیوں کو گرفتار کرا دیا یا ملک سے باہر نکلوا دیا۔ حضرت محل نے اپنی زندگی کا باقی حصہ بڑی تنگ دستی اور عسرت میں نیپال کے پہاڑی علاقے میں بسر کیا۔ کچھ عرصہ بعد جب حالات اعتدال پر آئے انگریزوں کے ظلم و تشدد کا دور ختم ہوا اور عام معافی کا اعلان

کر دیا گیا۔تو انگریزوں نے حضرت محل اور برجیس قدر کو واپس بلانے کی بہت کوشش کی اور یہاں تک پیشکش کی کہ اگر وہ لکھنو واپس آجائیں تو ان کے شاہانہ احترام کا لحاظ رکھا جائے گا۔ معقول وظیفہ بھی دیا جائے گا اور وہ جہاں پسند کریں انہیں رہنے کی اجازت ہوگی۔ مگر اس غیرت مند اور حریت پرست خاتون نے اس غلام آباد میں واپس آنا منظور نہ کیا اور انگریزوں کی گدائی قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ نیپال میں فوت ہوئیں اور وہیں انہیں دفن کیا گیا۔

حضرت محل کی زندگی خودداری، غیرت مندی، بہادری، عزم واستقلال اور شجاعت کی ایک ایسی تصویر ہے جس کے نقوش کو وقت کا ہاتھ کبھی نہ مٹا سکے گا۔ بلکہ گزرنے والا ہر لمحہ ان نقوش کو اور زیادہ اجاگر کرتا جائے گا۔ حضرت محل اگر چاہتیں تو ان مایوس کن حالات میں انگریز جرنیل کی پیشکش قبول کر کے اپنی اور اپنے بیٹے کی زندگی بچا سکتی تھیں۔ بلکہ حکومت بھی حاصل کر سکتی تھیں۔ مگر ان کی شجاعت اور غیرت نے اپنے جان نثاروں اور تحریک آزادی کے علمبرداروں کو دغا دینا پسند نہ کیا۔ اور انتہائی حقارت کے ساتھ اس سودے بازی کو ٹھکرا دیا۔ وہ جب کہ غریب الوطنی کے ایام میں عسرت و ناداری کی زندگی بسر کر رہی تھیں اس وقت بھی ان کی خودداری نے کاسہ بدست ہو کر انگریزی دربار میں مرحمت خسروانہ کے لئے جانا گوارا نہ کیا بلکہ وطن سے دور ایک اجنبی دیس میں مفلسی کی موت کو ترجیح دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ پردے میں رہ کر عورت کے جوہر نہیں کھلتے مگر حضرت محل کی زندگی اس کی مجسم تردید ہے۔ کیا ہمارے جدید عشرتکدوں نے ایک حضرت محل بھی پیدا کی ہے جو یوں مردانہ وار آگ کے شعلوں سے کھیل کر قوم کی قیادت کر سکے جب کہ موت سامنے کھڑی مسکرا رہی ہو۔

خالدہ ادیب خانم

ایک شعلہ بیان مقررّہ، ایک صاحبِ طرز ادیبہ ایک بالغ نظر مدبّرہ، ایک مجاہدہ جس نے ترک قوم کے ولولوں کو زندگی بخشی، جس کے زورِ بیان نے ان کی امنگوں کو ابھارا، جس کی تحریروں نے مردِ بیمار یورپ کی مسیحائی کی، جس کے مجاہدانہ عمل نے ترکوں کو ایک نئی روایت سے آشنا کیا۔ ایک محبّ الوطن خاتون جو تلوار سے قلم کا اور قلم سے تلوار کا کام لینا جانتی تھی۔ جس کی آتش نوائی تلوار اور قلم دونوں کو زندگی بخشتی رہی۔

خالدہ خانم نام تھا۔ ان کے والدہ عثمان ادیب پاشا سلطان عبدالحمید کے وزیر خزانہ تھے۔ خالدہ نے اپنی دوسری دو روشن خیال بہنوں نگار خانم اور بلقیس خانم کے ساتھ قسطنطنیہ کے رابرٹس کالج میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئیں۔ پانچ سال کی عمر میں تعلیم شروع کی اور ۱۹۰۱ء میں امتیاز کے ساتھ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ریاضیات کے ایک استاد پروفیسر احمد صالح سے شادی ہوئی جس سے دو تین بچے ہوئے۔ جب احمد صالح نے دوسری شادی کر لی تو خالدہ نے طلاق لے کے فوج کے ایک ڈاکٹر خالد بے سے شادی کر لی۔ ان کے دوسرے شوہر جلد ہی انتقال کر گئے۔

خالدہ نے چونکہ ایک علم دوست گھرانے میں پرورش پائی تھی اس لئے بچپن سے ہی انشاء پردازی اور لکھنے پڑھنے کا بہت زیادہ شوق تھا انہوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے افسانہ نگاری شروع کر دی اور جلد ہی ان کا شمار ترکی کے بہترین افسانہ

نگاروں میں ہونے لگا۔ کچھ عرصہ بعد ان کے افسانے یورپ کے اکثر ممالک میں بہت زیادہ مقبول ہوئے علمی اورادبی مصروفیات کے باوجودوہ ہمیشہ قومی اصلاح وترقی کے کاموں میں منہمک رہتی تھیں۔ انہوں نے ترک عورتوں کے حقوق کے لئے بے پناہ جدو جہد کی اور خواتین کی حالت بہتر بنانے کے لئے کئی چھوٹی چھوٹی انجمنیں قائم کیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے اخبارات ورسائل میں بے شمار مضامین لکھےاور ترک قوم کے ہر حلقے میں باعزت جگہ پیدا کرلی۔

جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو ترکوں کی حالت نہایت ابتر ہوچکی تھی اور وہ ایک گرتی ہوئی دیوار خیال کئے جاتے تھے۔ سلطان عبدالحمید اور وزیر اعظم فرید پاشا یورپی اتحادیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح کھیل رہے تھے۔ ترکوں ایسی بہادر اور شجاع قوم کی دیرینہ روایات خاک میں ملتی جارہی تھیں۔ ہر طرف بدنظمی، بے اطمینانی اور تباہی کا دور دورہ تھا۔ ملکی معیشت ڈانواں ڈول تھی۔ عسکری حالت جنگ کے بعد ویسے ہی ناگفتہ بہ ہوچکی تھی اور ترکی حکومت کا وقار عملاً ختم ہوکر رہ گیا تھا۔ تمام مقبوضات ہاتھ سے نکلتے جارہے تھے۔

۱۹۱۸ء میں صورت حال اور زیادہ خراب اور تشویشناک ہوگئی۔ فرانس، برطانیہ، اٹلی اور امریکہ کے جنگی جہاز درۂ دانیال میں داخل ہوگئے جس سے ملک کی سالمیت اور آزادی خطرے میں پڑگئی۔ دشمن فوجوں نے پیش قدمی کرکے قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور قریب تھا کہ دنیائے اسلام کی یہ عظیم الشان سلطنت ہمیشہ کے لئے مٹ جاتی کہ ایک نوجوان ترک فوجی افسر مصطفیٰ کمال پاشا نے ایک طرف دشمن اتحادیوں کو دوسری طرف ملک کی کٹھ پتلی حکومت کو مجاہدانہ عزم کے ساتھ للکارا۔ اس دوران اتحادیوں نے ترکوں پر بے پناہ مظالم کیے خصوصاً سمرنا میں یونانیوں نے مسلمانوں پر اس قدر ظلم و تشدد کیا کہ سارا عالم اسلام تڑپ اٹھا۔ مصطفیٰ کمال نے ترکی کے نوجوان قوم پرستوں کو جمع کرکے منظم کیا۔ اور بڑے نظم وضبط اور تدبر کے ساتھ دشمن کی فوجوں کا مقابلہ شروع

کر دیا۔ ان حالات میں خالدہ خانم ایسی غیور اور محب الوطن خاتون کیسے چین سے بیٹھ سکتی تھی۔ اپنے ملک کو یوں تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھی۔ جب قسطنطنیہ میں قوم پرستوں کو تختہ مشق بنایا گیا تو خالدہ نے شاہی حقوق کی حفاظت اور ملک کی آزادی کے لئے فقید المثال پر جوش تقریریں کیں۔ ان کی بے مثل خطابت سے ملک کے در و دیوار گونج اٹھے۔ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ان کے جلسوں میں شریک ہوئے تھے۔ اور انتہائی احترام و عقیدت کے ساتھ ان کی تقریریں سنتے تھے۔ خالدہ خانم کی آتش نوائی اور شعلہ بیانی نے اتحادیوں کے لئے نہایت مشکل حالات پیدا کر دیئے۔ ترکی کی تمام عورتیں خالدہ خانم کے اشارۂ ابرو پر کٹ مرنے کے لئے تیار تھیں۔ یہ صورت دیکھ کر ترکی کے وزیراعظم فرید پاشا نے ان کی گرفتاری کے لئے وارنٹ جاری کر دیئے۔ خالدہ خانم خوب سمجھتی تھیں کہ اس مشکل اور نازک دور میں ان کی قوم کو بے لوث اور پر جوش کارکنوں کی سخت ضرورت ہے اس طرح قید ہو جانے سے ان کا کام ادھورا رہ جاتا اور وہ اپنی قوم کی کسی خدمت کے قابل نہ رہتیں۔ حکومت اور اتحادی بھی یہی چاہتے تھے۔ جب خالدہ خانم کو اپنی گرفتاری کے احکام کا علم ہوا تو وہ ڈاکٹر عدنان بے کے ساتھ انقرہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں آبنائے باسفورس کو عبور کیا جہاں ہر قدم پر دشمنوں کے جنگی جہاز موجود تھے۔ یہ خطرناک سفر طے کرنے کے بعد وہ دونوں خچر پر سوار ہو کر ناطولیا کے جنگلوں سے گزر کر انقرہ پہنچ گئے۔ انقرہ میں مصطفیٰ کمال پاشا سے ان کی ملاقات ہوئی وہ خالدہ خانم کی صلاحیتوں اور ان کی عظیم شخصیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں خالدہ کو انقلابی حکومت میں ممتاز مقام حاصل ہو گیا۔ مصطفیٰ کمال نے انہیں آزاد ترکی کی پہلی پارلیمنٹ کا رکن نامزد کیا اور اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں جب نئی حکومت مرتب ہوئی تو ترکی کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک عورت وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز ہوئی۔ یہ خاتون خالدہ خانم تھیں۔ خالدہ نے ۱۹۱۷ء میں ہی ایک بہادر اور قوم پرست راہنما ڈاکٹر عدنان

بے سے شادی کر چکی تھیں۔ انقرہ پہنچ کر وہ چیف جج مقرر ہوئے پھر انہیں قسطنطنیہ میں گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا۔ اس دوران خالدہ خانم انقلابی حکومت کی دست راست بن کر ملک کی خدمت میں مصروف رہیں انہوں نے اہم سیاسی آئین اور قواعد وضوابط کی ترتیب وتدوین میں حصہ لیا۔ پورے ملک میں مدارس کا جال بچھا دیا۔ شام ایسے پسماندہ ملک میں تعلیم کو بے پناہ فروغ دیا۔ یتیم خانے قائم کئے۔ مذہبی تبلیغ اور اشاعت الاسلام کا بندوبست کیا۔ پہلی جنگ عظیم میں بھی انہوں نے ترکی کی شاندار خدمات انجام دی تھیں۔ جس کی وجہ سے انہیں امور سیاست وحکومت کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ جمہوری حکومت قائم ہونے کے بعد خالدہ ادیب خانم نے بے شمار سکولوں، تربیت گاہوں اور کالجوں کے علاوہ انقرہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی۔ لڑکیوں کے لئے ڈاکٹری، سائنس، انجینئرنگ اور قانون کی تعلیم کا انتظام کیا۔ جولائی ۱۹۲۱ء میں جب یہ اطلاع ملی کہ یونانی فوج انقرہ پر حملہ کرنے والی ہے تو پوری ترک قوم ایک بار پھر اس کی مدافعت کے لئے تیار ہوگئی خالدہ خانم نے رسد، باربرداری، تیمارداری اور دوسرے کاموں کے لئے ترک عورتوں کی ایک فورس قائم کی۔ جس میں ہزاروں عورتوں شامل ہوگئیں۔ وزارت دفاع نے ان کی عسکری تربیت کا انتظام کر دیا۔ عورتوں کے دستے، پلوں، تار گھروں، ریلوے سٹیشنوں اور نشر گاہوں کی حفاظت کے لئے متعین ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ زنانہ فوج کے ایک دستے نے اسمد کے علاقے میں یونانیوں پر کئی کامیاب شب خون مارے۔ جب ستمبر ۱۹۲۱ء میں یونانیوں نے بہت بڑا حملہ کیا تو خالدہ اپنے زنانہ دستوں کے ساتھ محاذ جنگ پر موجود تھیں۔ مشہور ہے کہ خالدہ خانم سیاہ عمامہ پہن کر میدان جنگ میں جاتیں تو فوجوں میں بے پناہ جوش پیدا ہو جاتا۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں ان کے شوہر ڈاکٹر عدنان قسطنطنیہ کے گورنر مقرر ہوئے تو ان کے ساتھ وہاں مقیم ہوگئیں اور انہوں نے اپنا تمام وقت ترک قوم کی بے لوث خدمت میں صرف کیا۔

حُورِعین فاطمہ بنت عبداللہ

پہلی جنگ عظیم کے وقت طرابلس بھی دوسرے عرب ممالک کی طرح ترکی خلافت کے زیرِ نگین تھا۔ اس علاقے کے صحرا نشین عرب اس وقت بھی قدیم اسلامی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ ان کی زندگی سادگی، جفاکشی، اسلام دوستی اور خلوص و مروت کا ایک حسین و جمیل مرقع تھی۔ اس وقت بھی جب دنیا بھر میں تمام بڑی چھوٹی طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے سیاست کے نام پر مکر و فریب کے جال پھیلا رہی تھیں۔ یہ سیدھے سادے اور بہادر لوگ اللہ اور اس کے رسول کے نام پر پروانہ وار اپنی جانیں نچھاور کرنا زندگی کی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے اور اسلام کی عظمت کے لئے کٹ مرنا ان کے نزدیک سب سے بڑی عبادت تھی۔ قبائل طرابلس میں البراعصتہ قبیلہ اثر و رسوخ اور کثرت افراد کے لحاظ سے بہت ممتاز خیال کیا جاتا تھا۔ اس قبیلہ کے سردار شیخ عبداللہ جو وہاں کے باشندوں میں عبدہ کے نام سے مشہور تھے۔ بے حد دیندار بہادر اور مخلص مسلمان تھے۔ شیخ اولاد نرینہ سے محروم تھے۔ ان کے ہاں صرف ایک بیٹی فاطمہ تھی جسے وہ بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ فاطمہ طرابلس کے اسی صحرائی ماحول میں پرورش پا رہی تھی۔ اس کے ماں باپ کو اسلام سے جو والہانہ شیفتگی اور محبت تھی فاطمہ اس کی ایک معصوم اور دلکش تصویر تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب طرابلس پر جنگ

کے مہیب بادل چھا گئے اور اطالوی فوجوں نے ان رجز خوانی سے معمور صحراؤں کو آتش وخون کے لرزہ خیز ہنگاموں سے جہنم زار بنادیا تو اس وقت فاطمہ کی عمر گیارہ سال کے قریب تھی خلافت ترکی سے جہاد کا اعلان کیا جاچکا تھا چنانچہ شیخ عبداللہ نے طرابلس کے تمام عرب قبائل کو متحد اور منظم کر کے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے میدان جنگ میں لا کھڑا کیا۔ شیخ عبداللہ کی دعوت پر اندرون صحرا تک کے قبائل اپنی قدیم روایات کے مطابق اہل وعیال سمیت شریک جنگ ہو گئے۔ ہر قبیلے کے ساتھ اس کا پورا خاندان محاذ جنگ پر موجود تھا۔ عورتوں میں عمر رسیدہ خواتین سے لے کر کمسن لڑکیاں تک سب شامل تھیں۔ جو شوق جہاد کے نشے سے سرشار مجاہدین کی خدمت کر رہی تھیں۔ اس جنگ کے مبصرین نے لکھا ہے کہ عرب فوج کے ساتھ بچوں والی مائیں بھی موجود تھیں جن کے سرفروشانہ جذبات کا یہ عالم تھا کہ ایک طرف گود میں بچہ اٹھائے تھیں تو دوسری طرف مشکیزہ سنبھالے زخمی مجاہدین کو پانی پلاتی پھر رہی تھیں چاروں طرف سے گولیوں کی بارش ہو رہی تھی اور بموں کے خوفناک دھماکوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مگر ان نشہ شہادت میں چور خواتین کے چہروں پر خوف و ہراس کی کوئی علامت نظر نہ آتی تھی۔ ان تمام مجاہدانہ سرگرمیوں کا سہرا ایک حد تک شیخ عبداللہ کے سر تھا کیونکہ وہی عرب مجاہدین کی قیادت کر رہے تھے۔ شیخ اس درجہ مخلص اور بے ریا شخص تھے کہ انہوں نے وہ روزینہ قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا جو سلطان ترکی کی طرف سے ایام جنگ میں عربوں کو دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنا تمام مال واسباب ترک افسروں کے سپرد کر دیا تھا تاکہ مجاہدین کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یوں دوسرے قبائل کے ساتھ شیخ عبداللہ کا تمام خاندان جہاد میں مصروف تھا مگر ان کی اکلوتی گیارہ سالہ بچی فاطمہ اپنے بے پناہ ذوق وشوق، جرأت و دلیری اور محویت واستغراق کی وجہ سے تمام ترک فوجی

افسروں کے لئے باعث حیرت بنی ہوئی تھی۔ ایک ترک افسر ڈاکٹر اسماعیل ثباتی بک نے جنگ کے چشم دید حالات میں بیان کرتے ہوئے اسی ننھی مجاہدہ کے متعلق لکھا ہے۔

"سب سے پہلے میں نے اس معصوم بچی کو اس وقت دیکھا جب میں پہلی دفعہ اپنے ساتھیوں سمیت عزیزیہ سے زوارہ میں وارد ہوا تھا۔ یوں تو فوج میں عورتوں اور لڑکیوں کی کمی نہ تھی کیونکہ ہر عرب اپنے تمام خاندان سمیت جہاد میں شریک تھا مگر فاطمہ میں چند ایک ایسی خصوصیات تھیں جن کی وجہ سے وہ ہزاروں مردوں اور عورتوں میں علیحدہ پہچانی جاتی تھی۔ ایک تو وہ بہت کم عمر تھی۔ دوسرے اسے جنگ کے ہنگامہ اور زخمی مجاہدین سے کچھ ایسی محبت ہوگئی تھی کہ انتہائی خوفناک معرکوں میں بھی ہر سپاہی اسے محاذ جنگ پر اپنے آگے ہی دیکھتا تھا۔ جنگ خواہ حملے کی صورت میں ہو یا مدافعت کی شکل میں۔ ساحلی بیڑے سے گولوں کی بارش ہو رہی ہو یا تلواروں اور سنگینوں کی باڑیں سامنے ہوں مگر ایک زخمی مسلمان کی آہ میں اس معصوم بچی کے لئے ایسی کشش تھی کہ وہ اپنی چھوٹی سی مشک سمیت اس جگہ پہنچ کر اپنا فرض انجام دینا کبھی نہ بھولتی تھی۔

اس کے دل میں ایک ایسا عشق تھا جس کی عمر اس کی اپنی عمر سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ لہو ولعب یا کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ خون زخم اور کٹی ہوئی انسانی رگوں کا عشق تھا۔ جہاں کہیں یہ چیزیں موجود ہوتی تھیں وہ باد صبا بن کر برق رفتار ہرنی کی سی تیز مگر فرشتہ عشق کے پروں سے اڑتی ہوئی وہاں پہنچ جاتی۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ بارود کے دھوئیں سے تمام فضاء تاریک ہو رہی تھی۔ توپوں کی گھن گرج سے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔ گولوں کے پھٹنے سے ایک عارضی روشنی نمودار ہو جاتی تھی۔ مگر

اس کے ساتھ ہی دردناک انسانی چیخیں پچھلی مہیب گرج اور کڑک کے ساتھ مل کر ایک عجیب وحشت انگیز سماں پیدا کر دیتی تھیں۔ ایسے جگر پاش اور زہرہ گداز عالم میں وہ معصوم ہرنی اپنا اونچا کرتہ پہنے اور پھٹی ہوئی چادر کمر کے گرد لپیٹے ہوئے اس طرح دوڑ رہی تھی۔ جیسے بے بس و مجبور زخمیوں کی خبر گیری کے لئے کوئی فرشتہ آسمان سے نازل ہوا۔ اور اللہ نے زمین اور ہوا کو اس کے حکم کا پابند کر دیا ہے کہ وہ اٹھائے رہے اور یہ اڑتی رہے۔ سامنے سے توپ کے گولوں کی مسلسل بارش ہو رہی تھی مگر یہ اسی بارش پر تیرتی ہوئی جا رہی تھی۔ انسانی لاشیں ایک پر ایک گر رہی تھیں مگر ہر نئی لاش گرنے کی آواز اس کے دل میں خوف کی جگہ طاقت کی نئی رَو پیدا کر دیتی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر میں بے اختیار ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ کچھ بعید نہیں کہ ایسے خطرناک اور یکسر موت و ہلاکت کے عالم میں یہ برق وش ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب کی مرتبہ اگر فاطمہ نظر آئی تو کسی نہ کسی طرح پکڑ کر سمجھاؤں گا کہ موت کی اس درجہ آرزو مند کیوں ہو گئی ہے؟ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک چھوٹا سا یہ میرے قریب سے گزرا۔ میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا تجھے نہیں معلوم کہ تو اپنے باپ کی ایک ہی بیٹی ہے؟ چھوڑو کیا تم بھول گئے ہو کہ اسلام اور وطن کے کتنے فرزند یہاں پیاسے دم توڑ رہے ہیں۔" یہ کہا اور نظروں سے غائب ہو گئی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ مجھے سرخ رنگ سے عشق ہے۔ آہ! یہی رنگ ایک روز میں نے اس کی گردن کے نیچے بہتا ہوا دیکھا۔

اسی زمانے میں بارہ ہزار سے زیادہ اطالوی فوج نے دو ماہ کی مکمل تیاری کے بعد

مسلمانوں پر ایک بھرپور حملہ کیا۔ اگرچہ ترک اور عرب فوج مل کر تین ہزار سے بھی کم تھی مگر انہوں نے خوب جی توڑ کر مقابلہ کیا اور دشمنوں کو بارہ سو لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کر ساحل کی طرف پیچھے ہٹنا پڑا۔ دوپہر کے وقت جب کہ اطالوی توپ خانہ دو طرف سے لگاتار گولے برسا رہا تھا اور بیک وقت ہزاروں بندوقیں چلنے کی دہشت ناک آواز سے فضاء لرز رہی تھی۔ ریگ زار طرابلس میں موت اور ہلاکت کے علاوہ کوئی دوسری چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس وقت وہ حور عین، فاطمہ بنت عبداللہ بڑی تن دہی اور دلیری سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس کا فرشتوں کے تقدس کو شرما دینے والا معصوم چہرہ دھوئیں اور تپش کے جھلس چکا تھا۔ اور بالوں پر سرخی مائل ریت کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے خون کے جابجا دھبوں سے سرخ ہو رہے تھے اور وہ چھوٹی سی مشک پیٹھ پر اٹھائے فضائے جنگ میں پروانہ وار اڑتی پھر رہی تھی۔ اس کی محویت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا کے تمام رشتوں اور بندھنوں سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ اسے نہ ماں باپ کا غم ہے اور نہ اپنے اعزہ واقربا کا کوئی خیال ہے۔ وہ تمام خیالات سے یکسر خالی اپنی دھن میں غازیان دین کی سقائی میں مصروف تھی۔ عصر کے قریب مجاہدین نے بڑے جوش وخروش سے اطالویوں پر حملہ کیا اور پیش قدمی کرتے ہوئے دشمنوں کی صفوں کے اندر گھس گئے۔ بندوقیں بیکار ہو گئیں۔ تلواروں اور سنگینوں سے انسانی اعضا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرنے لگے۔ ایک ترک کمان افسر احمد نوری بک نے عربوں کو یوں لڑتے دیکھا تو وہ اپنے مٹھی بھر جانثاروں کو لے کر بڑھتا ہوا دشمنوں کے مشرقی توپ خانے تک جا پہنچا۔ جہاں تازہ دم اطالوی فوج موجود تھی۔ ان اطالوی سپاہیوں نے ترک مجاہدین کو گھیر کر چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ خدا معلوم ننھی مجاہدہ فاطمہ عرب سپاہیوں کی صفوں سے اتنی دور کیسے پہنچ گئی۔ اس نے دیکھا کچھ ترک مجاہدین لڑتے ہوئے اطالوی سپاہیوں کے گھیرے سے باہر نکل آئے ہیں مگر

چار زخمی ترک زمین پر پڑے سسک رہے ہیں اور بزدل اطالوی ان کے سروں اور سینوں کو اپنی سنگینوں سے چھلنی کر کے غصہ فرو کر رہے ہیں۔

یہ دردناک منظر دیکھ کر گیارہ برس کی یہ ننھی مجاہدہ ایک نڈر اور بے خوف سپاہی کی طرف ان کے گھیرے میں چلی گئی۔ اس نے اطالوی سپاہیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کیونکہ اس کی بے تاب نظریں تو ان زخمی مسلمانوں پر مرکوز ہو چکی تھیں۔ فاطمہ نے جاتے ہی اپنی مشک ایک تڑپتے ہوئے زخمی کے منہ سے لگا دی۔ ابھی زخمی کے حلق میں پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں پہنچا ہوگا کہ دو اطالوی سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ فاطمہ نے چھڑانا چاہا مگر ان کی گرفت بہت سخت تھی۔ وہ یہ بے بسی برداشت نہ کر سکی کہ ایک مسلمان اس کی آنکھوں کی سامنے تڑپ رہا ہو اور وہ اس کی تشنگی نہ بجھا سکے فاطمہ نے غصے میں آ کر ایک زخمی سپاہی کی پڑی ہوئی خون آلود تلوار اٹھا کر اس زور سے ایک اطالوی سپاہی پر دے ماری کہ اس کے ہاتھ کا پنجہ زخمی ہو کر لٹک گیا۔ معاً گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور ایک ہلکی سی چیخ فضاء کی چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب جنگ وجدل کا یہ ہنگامہ فرو ہوا اور اطالوی شکست کھا کر بھاگے تو دشمنوں کا تعاقب کرنے والے عرب اور ترک سپاہیوں نے ایک عجیب اندوہناک منظر دیکھا کہ چار ترک سپاہی زخموں سے چور زمین پر پڑے ہیں اور ان کے قریب اس حور عین فاطمہ کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش اس حالت میں پڑی ہیں کہ اس کی چھوٹی سی مشک ایک بے ہوش ترک کے سینے پر رکھی ہے اور مشک کا حلقہ فاطمہ نے بدستور مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس بے مثال مجاہدہ نے گولیاں کھانے کے بعد بھی زخمی مسلمان کو پانی پلانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر اس کا ہاتھ زخمی کے منہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

مبارک ہے وہ قوم جس کے آغوش میں ایسی قابل فخر بیٹیاں تربیت حاصل کرتی

ہیں۔ اور مبارک ہیں وہ ماں باپ جن کے خون جگر سے اس طرح اسلام کی آبیاری ہوتی ہے صحراء کی اس بہادر بیٹی نے کسی کنڈرگارٹن اسکول میں تعلیم حاصل نہ کی تھی اور نہ اسے نازونعم کے وہ اسباب میسر رہے تھے جن سے ہمارے بچے بہرہ ور ہوتے ہیں مگر انہیں دین کی عظمت کا احساس تو بڑی چیز ہے۔ اس کی ابجد کا بھی علم نہیں ہوتا۔

وہ ایک غیور اور بہادر مسلمان باپ کی بیٹی تھی جس نے اپنی زندگی اللہ کے دین کی خدمت کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ فاطمہ کی رگوں میں اسی غیرت مند باپ کا خون موجزن تھا۔ اس نے اپنے خاندان کی شجاعت اور دلیری ورثے میں پائی تھی اسلام کی محبت اس کی گھٹی میں شامل تھی۔ اس لئے وہ جانتی تھی کہ آزمائش وابتلاء کے ایسے دور میں ایک مسلمان بیٹی کو کیسا کردار ادا کرنا چاہئے۔ اس معصوم شہیدہ کے ماں باپ اس کے منہ سے لچر اور بے ہودہ گانے سن کر خوش نہ ہوتے تھے بلکہ انہوں نے اپنی بیٹی کو اسلام کی عظمت، اللہ کی وحدانیت و کبریائی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک تعلیم کے نغمات حفظ کرا رکھے تھے۔ اس کا دل کعبۃ اللہ کی طرح مقدس اور پاک تھا۔ اس چھوٹے سے گھر میں اللہ کی محبت اور عشق رسول کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسے اپنی قوم کی ناموس کا احساس تھا اور اپنے وطن کے ریگ زاروں میں مدفون عظمت کا پورا علم تھا۔ ایک گیارہ سالہ بچی جانتی تھی کہ اسلام کے زخمی فرزند جہنم کی طرح تپتی ہوئی ریت پر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے ہوں تو اس کا کیا فرض تھا۔ خدا کی قسم! اس حورعین بلکہ تمام ملت اسلامیہ فاطمہ پر فخر کر سکتی ہے۔ اور بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ جس قوم کے گنجینہ اوصاف میں فاطمہ ایسے لعل و گہر ہوں وہ قوم کبھی دنیا سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ جب بھی بیدار ہوگی۔ تاریخ اس کے اشاروں پر حرکت کرنے کے لئے مجبور ہو جائے گی۔

مسلمان ماؤں کو سوچنا چاہئے کہ اس معصوم فاطمہ بنت عبداللہ کا پاک خون انہیں کیا

پیغام دے رہا ہے۔ اس ننھی شہیدہ کی مقدس خاک آج بھی ان سے کس چیز کا مطالبہ کر رہی ہے؟ اس کی روح جب فردوس کی کھڑکیوں سے جھانک کر دنیا پرست بوڑھیوں، خدا فراموش اور خود پرست دوشیزاؤں، بزدل اور عیش پرست ماؤں اور لہو ولعب کی زہریلی فضاء میں پرورش پانے والی ننھی منھی بیٹیوں کو دیکھتی ہو گی تو اسے کتنا صدمہ ہوتا ہو گا۔

فاطمہ کی شہادت آج بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا